پاکستان میں اُردو

حمدیہ قصیدہ نگاری

تحقیق و روایت

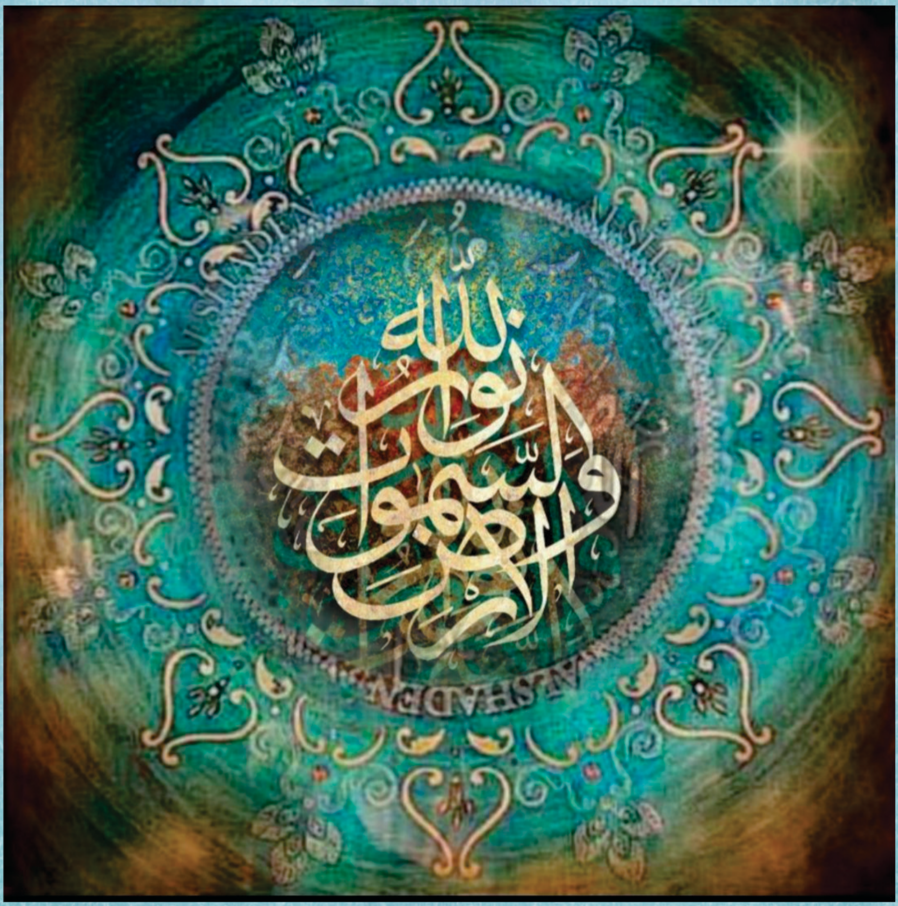

عباس علی شاہ ثاقب

Pakistan Main Urdu

Hamdya Qaseeda Nigari

By

Abbas Ali Shah Saqib

بے شمار ریسرچ اسکالرز مختلف اصناف پر مقالات لکھتے ہیں لیکن یہ عباس علی شاہ ثاقب کی سعادت مندی ہے کہ حمدیہ قصائد کے ساتھ ان کی دل چسپی ، مذہبی گھرانے سے تعلق کے باعث ہے۔ وہ خود بھی ایک عمدہ شاعر ہیں۔ اُن کا خاص کمال یہ ہے کہ انھوں نے قصیدے کی شکل میں حمدِ ربِ ذوالجلال کا سراغ لگایا ہے جو یقیناً پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کی تاریخ میں ایک قابلِ قدر اضافہ اور اثاثہ ہے۔ انھوں نے ہر دور کے قصیدے کے بدلتے حالات اس کے رجحانات اور جہات کو محسوس کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حمدیہ قصائد پر جب بھی کام ہوگا ان کے مقالے کو اولین دستاویز کی حیثیت حاصل رہے گی۔

ڈاکٹر ریاض مجید

عباس کا تحقیقی مقالہ ''پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری'' بہترین تحقیقی کاوش ہے۔ اس کتاب میں قصیدہ نگاروں کی فکری جہات کو نہایت مہارت سے نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے۔ توحید اور توحید کے فلسفیانہ مباحث کی توجیہ و توضیح کرنے کی سعی قابلِ ستائش ہے۔ قصیدہ نگاروں کا اجمالی تعارف اور ان کے فکر و فن کا مؤثر پیرائے میں بیان نہ صرف معتبر سرمایہ ادب ہے بل کہ متانت سے فکری مباحث کی شرح، تنقیدی سنجیدگی سے فنی جائزہ اور ادبی شائستگی سے تخلیق کاروں کی صلاحیتوں کو مقالے کی زینت بنایا گیا ہے۔ بے لاگ اور غیر جانبدارانہ انداز میں تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ نیز قصیدے کی ہیئتی تشکیل اور صنفی شناخت کے نقوش پوری طرح اُبھارے گئے ہیں۔

ڈاکٹر محمد آصف اعوان

حُسنِ ادب پبلشرز فیصل آباد

0321-7044014
0301-7044014
rawisharifhussain@gmail.com
Street No 9, Makkuana Jaranwala Road Faisalabad

پاکستان میں اُردو

حمدیہ قصیدہ نگاری

(تحقیق و روایت)

عباس علی شاہ ثاقبؔ

حسنِ ادب ، فیصل آباد
0321-7044014

Pakistan Main Urdu
Hamdya Qaseeda Nigaari
(Tahqeeq o Rewayat)

By

Abbas Ali Shah Saqib

جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ ہیں

ضابطہ:

نام کتاب : پاکستان میں اُردو حمدیہ قصیدہ نگاری
(مقالہ برائے ایم۔فل اردو، 2023
رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی فیصل آباد کیمپس)

مصنف : عباس علی شاہ ثاقب

کمپوزنگ : عبدالروٗف زین

نظر ثانی : ڈاکٹر نوید عاجز

اہتمام : حسن ادب فیصل آباد

سرورق : ڈاکٹر عارف حسین عارف

باراول : جنوری 2024ء

تعداد : 200

قیمت : 1000 روپے

انتساب

شیخ الاسلام

حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ

کی اسلامی خدمات

کے نام

عکسِ عباس علی شاہ ثاقب

اصل نام: عباس علی شاہ
قلمی نام: عباس علی شاہ ثاقب
تاریخ پیدائش: یکم جون 1992ء
استادِ سخن: ڈاکٹر نوید عاجز، شریف ساجد
تعلیم: ایم فل اُردو، ایم اے فزیکل ایجوکیشن، بی ایڈ
پیشہ: درس و تدریس
حال آباد: 27/SP، پاک پتن

مطبوعہ کتب:

"پاکستان میں اُردو حمدیہ قصیدہ نگاری"

زیرِ طبع کتب

"شہابِ ثاقب" (شعری مجموعہ)
"نُورِ توحید" (مجموعہ حمدیہ قصائد)
"مقالاتِ ثاقب" (تنقیدی و تحقیقی مضامین)
"روحِ کائنات" (نعتیہ مجموعہ)

❖❖❖❖❖❖❖

فہرست

❖ پیش لفظ	عباس علی شاہ ثاقبؔ	7
❖ حمدیہ قصیدہ اور عباس علی شاہ ثاقب	ڈاکٹر محمد آصف اعوان	10
❖ اُردو حمدیہ قصائد کے اولین محقق	منظر عارفی	12
❖ اُردو حمدیہ قصیدہ نگاری پر نگاہِ عاجزانہ	آفتاب شاہ	14
❖ اُردو میں حمدیہ قصیدہ	سید جمال زیدی	19
۱۔ قصیدہ: بنیادی مباحث		21
۲۔ اُردو حمدیہ قصیدے کی روایت		71
۳۔ اُردو حمدیہ قصیدہ نگاری:	قیام پاکستان تا ۱۹۷۵ء	117
◉ مولانا ظفر علی خان		120
۴۔ اُردو حمدیہ قصیدہ نگاری:	۱۹۷۵ء تا ۲۰۰۰ء	157
◉ آثر زبیری		160
◉ بے چین جیپوری		174
۵۔ اُردو حمدیہ قصیدہ نگاری:	۲۰۰۰ء تا ۲۰۲۲ء	191
◉ عبدالعزیز خالد		194
◉ سید اصغر علی شاہ		206
◉ ساحر لکھنوی		214
◉ غلام علی وفا		223
◉ قاضی حبیب الرحمٰن		230

- ڈاکٹر ریاض مجید 238
- ڈاکٹر نوید عاجز 251
- ابوالحسن واحد رضوی 261
- رفیع الدین رازؔ 271
- شاعر علی شاعر 276
- منظر عارفی 283
- عباس علی شاہ ثاقبؔ 293
- ❖ حاصلِ تحقیق 311
- ❖ مصادر و مراجع 316

❖❖❖❖❖❖❖

پیش لفظ

تمام تعریفیں اس ذات کے لیے جس نے انسان کو قلم کے ذریعے علم سکھایا۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز کیا۔ انسان نے اپنی تخلیق کی ابتدا سے موجودہ دور تک کے سفر کے دوران میں بے پناہ نشیب وفراز دیکھے مگر ہر دور میں اپنے خالق و مالک کو ہی مشکل کشا اور حاجت روا پایا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم، رحمتوں، عطاؤں اور انعامات و اکرامات کا شمار انسانی بس سے باہر ہے۔ اس نے ان گنت عنایات فرما کر اپنی عظمتوں، قدرتوں اور احسن الخالقین ہونے کا پتہ دیا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کی کوششوں کے سفر کے دوران میں جی سی یونی ورسٹی فیصل آباد میں انٹرویو تک پہنچا۔ علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد میں بھی داخلہ کی کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ تاہم کوشش ترک نہ کی اور میری خوش بختی کہ تیسری کوشش میں رفاہ انٹرنیشنل یونی ورسٹی فیصل آباد میں داخلہ ملا۔ لکھنے کا شغف اور علمی شخصیات کی صحبت مسلسل مجھے اعلیٰ تعلیم کی رغبت دلاتی رہی۔ یوں اس سفر کا آغاز نصیب ہوا۔ میری خوش بختی ہے کہ میرے تحقیقی مقالے کا مرکز ومحور خالقِ کائنات کی ذات پاک ہے۔

ایم فل کے تحقیقی مقالے کے لیے موضوع کا انتخاب آپ کی دل چسپی، رجحان اور سوچ کا امتحان ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نوید عاجزؔ کا ممنون ہوں جنھوں نے موضوع کے انتخاب کے لیے معاونت کی۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرا تحقیقی مقالہ بعنوان ''پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری'' منظور ہوا۔ یہ مقالہ درج ذیل ابواب پر مشتمل ہے:

باب اول: اُردو قصیدہ: بنیادی مباحث

باب دوم: اُردو حمدیہ قصیدے کی روایت

باب سوم: اُردو حمدیہ قصیدہ نگاری (قیامِ پاکستان تا ۱۹۷۵ء)

باب چہارم: اُردو حمدیہ قصیدہ نگاری (۱۹۷۵ء تا ۲۰۰۰ء)

باب پنجم: اُردو حمدیہ قصیدہ نگاری (۲۰۰۰ء تا ۲۰۲۲ء)

اس کے بعد ما حصل، مصادر و مراجع اور ضمیمہ جات درج کیے گئے ہیں۔

اُردو حمد یہ قصیدہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات کی قدرتوں، عظمتوں اور جاہ وجلال کی رفعتوں سے مزیّن ہے۔اردو حمد یہ قصیدہ توحید کی حکمتوں، علم وعرفان اور خالقِ کائنات کی حمد و توصیف سے معمور ہے۔پاکستان میں اردو حمد یہ قصیدہ نگاری تصوّرِ ربوبیّت ،تصوّرِ اُلوہیّت ، قدرتِ الٰہیّہ ،توحید،فلسفۂ وحدت الوجود،فلسفۂ وحدت الشہود کے رجحانات ،خلّاقی ،اقتدار و اختیارات اور متلاشیانِ حق کے لیے قرآن کی روشنی میں دلائلِ توحید بیان کیے گئے ہیں۔یوں توحید کے پرستاروں کو اردو حمد یہ قصیدے نے رنگا رنگ موضوعات اور استدلالِ توحید سے آگہی فراہم کی ہے۔

میرے نگرانِ مقالہ ڈاکٹر ریاض مجید کی راہنمائی نے حقیقی معنوں میں میرے تحقیقی مزاج کو جلا بخشی۔ان کی حوصلہ افزائی، معاونت اور راہنمائی کے لیے ممنون ہوں۔

اس تحقیقی سفر کے دوران میں ڈاکٹر منظور احمد طاہر اور ڈاکٹر محمد آصف اعوان کا بہت ممنون ہوں جنھوں نے میرا موضوع پہلی ہی نظر میں پسند کیا اور ستائش وحوصلہ افزائی کی۔میں اپنے اساتذہ کرام ڈاکٹر شبیر قادری، ڈاکٹر شاہدہ یوسف، ڈاکٹر جمیل اصغر، ڈاکٹر فاروق بیگ، ڈاکٹر حبیب الرحمٰن ، پروفیسر اخلاق حیدر آبادی، دلشاد اجمل اور محمد جلال الدین نعمانی کا بھی ممنون ہوں۔نعیم مبشر کا بھی احسان مند ہوں۔

مقالے کی تکمیل میں اپنے اساتذہ کرام کے علاوہ اپنے تمام گھر والوں خاص طور پر اپنے بھائی محمد احمد شاہ کا ممنون ہوں جنھوں نے ہمیشہ میری معاونت کی۔ بھائی سجاد حسین شاہ کی علم دوستی کے باعث اعلیٰ تعلیم تک پہنچا۔میں شریف ساجد کی حوصلہ افزائی کا ممنون ہوں۔ علامہ سیّد ابو داؤد شاہ ،محمد ندیم صادق (لیکچرار اردو) اور محمد صدیق قادری نے دامے درمے سخنے معاونت کی۔عبدالقادِر (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر) کا ممنون ہوں کہ اُنھوں نے میری راہ نمائی کی۔ڈاکٹر شہامد علی طاہر (ہیڈ ماسٹر)،محمد زمان خان ،محمد نصر اللہ ،محمد جمشید کمبوہ (ہیڈ ماسٹر)،محمد خاں، میاں محمد جاوید اقبال (الحمد اکیڈمی) کی مشاورت نے میرا حوصلہ بڑھایا چودھری منور اقبال حسین (ایم فل اردو) نے پروف ریڈنگ میں معاونت کر کے اغلاط کی

درستی کی۔یوں مقالہ اغلاط سے پاک ہوا۔محمد یار(اسکالر ایم فل زوالوجی)،صداقت علی خاں اورمحمد منیر ساقی (اسکالر ایم فل زوالوجی) کا ممنون ہوں جنھوں نے مجھے تکنیکی معاونت فراہم کی۔شاعرعلی شاعؔراورسید صبیح رحمانی کی راہنمائی اورتعاون پربھی ممنون ہوں جن کی بدولت کئی حمدیہ قصیدہ نگاروں اور عظیم ادباء سے رابطہ ممکن ہوا۔میاں آصف افضال بھنڈارہ کی علم دوستی میرے لیے باعث مسرت ہے۔نوجوان شاعرعبدالرؤف (ڈپلومہ آف ایسوسی ایٹ انجینیر گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی آف ساہیوال) کا بھی ممنون ہوں۔احباب میں اسلام بابر،ذیشان فرید،محمد آصف کمبوہ،محمد یونس عالم،محمد ایاز ثانی،رانا آریان اور چودھری محمد امیر کی دعاؤں کا شکرگزار ہوں۔میں اپنے اہلِ خانہ، بیٹے (محمد حسیب شاہ)اور بیٹی (ربیع فاطمہ شاہ) کے لیے اظہارِتشکر پیش کرتا ہوں۔

اس مقالہ میں پائی جانے والی خوبیاں میرے نگرانِ مقالہ ڈاکٹر ریاض مجید کی شفقت، مسلسل راہنمائی اورستائش کے باعث ہیں۔اس مقالہ کی تخصیصی خوبی یہ ہے کہ موضوع کے اعتبار سے یہ مقالہ اردو ادب میں انفرادی نوعیت اوراولیت کا حامل ہے۔مجھے اپنی کم علمی اورکم مائیگی کا اعتراف ہے۔محنت کرنے والا کبھی ناکام نہیں ہوسکتا ہاں البتہ ذہین ناکام ہوسکتا ہے۔امیّد ہے میرا یہ تحقیقی مقالہ میرے لیے توشۂ آخرت ہوگا اور اردو ادب میں اردو حمدیہ قصائد کی مختلف جہات کے ادراک کے حوالے سے بھی قابلِ فخر کام ہوگا۔(ان شاءاللہ)

عباس علی شاہ ثاقبؔ

حمدیہ قصیدہ اور عباس علی شاہ ثاقب

عباس علی شاہ سنجیدہ طبقے کا حامل نوجوان محقق اور شاعر ہے۔علم و تحقیق کے میدان میں یہ نوجوان یقیناً ایک گراں قدر اضافہ ثابت ہوگا۔عباس کے مزاج میں مذہبی پہلو غالب ہے۔اسی وجہ سے عباس علی شاہ نے اردو حمدیہ قصیدے کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔قصیدہ نگاری کی روایت اگرچہ اردو شاعری کا بہت اہم سرمایہ ہے تاہم دورِ حاضر میں یہ روایت دم توڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔خاص طور پر حمدیہ قصیدہ نگاری کا رواج تو اب بہت ہی کم دکھائی دیتا ہے۔اس صورتِ حال میں عباس کا اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کی طرف متوجہ ہونا نہایت خوش آئند ہے۔

عباس خود بھی ایک شاعر ہے اور اس نے کئی ایک حمدیہ قصیدے لکھ رکھے ہیں۔یہ قصیدے ان کی فکری و فنی پختگی اور اعلیٰ شعری ذوق کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔عباس کا تحقیقی مقالہ ''پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری'' بہترین تحقیقی کاوش ہے جس پر رفا انٹرنیشنل یونیورسٹی فیصل آباد کیمپس نے انھیں ایم فل (اُردو) کی ڈگری عطا کی ہے۔یہ مقالہ یقیناً حمدیہ قصیدہ نگاری کے حوالے سے قابلِ قدر تنقیدی و تحقیقی مقالہ ثابت ہوگا۔اس مقالے میں قصیدہ نگاروں کی فکری جہات کو نہایت مہارت سے نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے۔یوں عباس علی شاہ اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کے اوّلین محقق کہلائے جانے کے مستحق ٹھہرے ہیں۔توحید اور توحید کے فلسفیانہ مباحث کی توجیہ و توضیح کرنے کی سعی قابلِ ستائش ہے۔قصیدہ نگاروں کا اجمالی تعارف اور ان کے فکر و فن کا مؤثر پیرائے میں بیان نہ صرف معتبر سرمایہ ادب ہے بلکہ حمدیہ قصیدہ نگاروں کا قرآن کریم سے کشید کردہ موضوعات کا مستند حوالہ بھی پیش کرتا ہے۔

متانت سے فکری مباحث کی شرح،تنقیدی سنجیدگی سے فنی جائزہ اور ادبی شائستگی سے تخلیق کاروں کی صلاحیتوں کو مقالے کی زینت بنایا گیا ہے۔بے لاگ اور غیر جانبدارانہ انداز میں تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔قصیدے کی ہیئتی تشکیل اور صنفی شناخت کے نقوش

پوری طرح اُبھارے گئے ہیں۔ تکوینِ قصیدہ اور اس کے ہیئتی خمیر نے تمہیدیہ قصیدے کو ’’شہنشاہِ اقلیم ادب‘‘ کے درجے پر فائز کیا ہے۔ حمدیہ قصائد میں پائے جانے والے فکری رجحانات و ترجیحات کے ابلاغ و فروغ کی کڑیوں کو منطقی انداز میں ملا کر اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مبارکہ سے تجدیدِ عہدِ وفا کرنے کی کاوش قابلِ ستائش ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عباس علی شاہ کے علمی ذوق میں اضافہ کرے۔ اسے ہمیشہ علم و تحقیق کے میدان میں سرگرمِ عمل رکھے۔ اس نوجوان میں ایک بڑا علمی و ادبی محقق بننے کی پوری صلاحیت ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد آصف اعوان
فیصل آباد

اُردو حمدیہ قصیدہ کے اولین محقق

''پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری'' کے اولین محقق عباس علی شاہ المتخلص ثاقب کا رہائشی تعلق برِصغیر کے مشہور و معروف سلسلہ چشتیہ سے تعلق رکھنے والے صوفی و عالمِ باعمل حضرت بابا فریدالدین مسعود المعروف بابا فرید گنج شکرؒ کے شہرِ دل نواز بنام ''پاک پتن شریف'' سے ہے۔ عباس علی شاہ صرف اسی نسبت ہی سے سعادت مند نہیں بلکہ تعلیم و تعلم سے گہری وابستگی کی بنا پر بھی سعادت مندی سے بہرہ ور ہیں۔

میرے قاری یکم جون ۱۹۹۲ء کو اس دنیائے آب و گِل میں آنکھیں کھولنے والے عباس علی شاہ المتخلص ''ثاقب'' کا بھرپور اور مکمل تعارف سے تو اس وقت واقف ہوں گے جب وہ ان کا ذاتی نامہ کا پی پر تفصیل سے پڑھیں گے۔ میں ان سے صوتی طور پر اس وقت سے واقف ہوں جب سے انھوں نے حمدیہ قصائد پر ایم۔ فل کے لیے ریسرچ کا بیڑا اٹھایا۔ گویا میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ حمد باری تعالیٰ نے ہمیں ایک دوسرے سے روشناس ہی نہیں کرایا بلکہ ایک محترم تعلق بھی عطا فرمایا۔ میں نے عباس علی شاہ کو ان کی ریسرچ کے روزِ اول سے سخت محنتی اور جستجو طلب پایا۔ ایک آزاد محقق کو اپنے دورِ مقصود کے حصول کے لیے کیسی کیسی بے آب و گیاہ وادیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کیسے کیسے سنگلاخ کوہساروں کی چوٹیاں سر کرنی پڑتی ہیں۔ کیسے کیسے ہوش ربا بیابانوں اور صحراؤں کو پاپیادہ روندنا پڑتا ہے۔ کچھ وہی جانتا ہے یہ ساری خوبیاں اور اس جیسی اور بھی کئی خوبیاں کوئی بھی انصاف پسند نظر اور قلم رکھنے والا عباس علی شاہ میں بہت آسانی سے دیکھ سکتا ہے۔ انھی بنیادوں پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ریسرچ ان کی پہلی پہچان ہے۔ اگرچہ وہ اور بھی کئی شوق رکھتے ہیں۔ مثلاً وہ ادیب بھی ہیں، ناقد بھی ہیں، شاعر بھی ہیں اور شاعر بھی غزل و نظم تک محدود نہیں بلکہ قصیدہ گو شاعر ہیں۔

آج جب کہ قصیدے کا تصور کم و بیش عنقا ہو چکا ہے۔ بلا مبالغہ بیشتر شعرا پر چھ سات شعروں کی متواتر غزل کہنی دشوار ہو چکی ہے۔ ٹیکنی کلر غزل کا رواج عام ہو چکا ہے۔ بے مضمون سی نظمیں عروج پا رہی ہیں۔ قصیدہ کے نام پر طویل بے اثر سی نظمیں کہہ کر لوگ قصیدہ گو بن رہے

ہیں۔صرف اس لیے کہ فلاں کے تحقیقی کام میں ان کا نام شامل ہو جائے۔قصیدے کے بنیادی اصول اور ادق فن جو اپنے ماہر کہنے والوں کے ساتھ انھی کی قبروں میں دفن ہو چکے ہیں۔ان کے بارے میں اب یہ کہنا بھی ظلم ہے کہ ان کی ٹارگٹ کلنگ کی جا رہی ہے۔ان حالات میں مجھے خوشی ہوئی جب میں نے یہ دیکھا کہ مذکورہ تحقیقی مقالے ''پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری'' میں ان کے اپنے تین حمدیہ قصیدے شامل ہیں۔عارض و گیسو کی نیرنگیوں سے لدی پھندی غزل کی طرح قصیدے سے وہ دور بھی گزر گیا جب تشبیب صرف اور صرف قدرتی مناظر کے گل و گلزار اٹھائے ہوئے ہوتی تھی۔بہر کیف ان کے حمدیہ قصیدے کیسے ہوں گے اس کا ایک خوب صورت سا فریم ان کے اپنے لکھے ہوئے ایک جملے ہی سے مزین ہو جاتا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

> ''قصیدے میں عشقیہ مضامین کی بجائے سوچ بچار کی توروں کو چھیڑ کر کائنات کے پنہاں رازوں سے اللہ تعالیٰ کی شان کے کرشموں کے ادراک کی سعی کی گئی ہے''

بلا شبہ وہ بالاخلاص مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کے عنوانات سے محترم ڈاکٹر ریاض مجید صاحب کی نگرانی میں رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی فیصل آباد کیمپس سے کامیاب ریسرچ کی اور ڈگری حاصل کی۔تحقیق کی ایک وسیع ترین دنیا ان کے سامنے ہے اور ان کے نشترِ تحقیق کی چشم براہ ہے۔پی ایچ ڈی، ڈی لٹ ان کی منزل کے سنگِ راہ ہیں۔انھیں تدریسِ علم کا بھی شوق ہے اور تحصیلِ علم کا بھی۔رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے۔''طالبِ علم، تحصیلِ علم سے کبھی سیر نہیں ہوتا''۔

یہ حصولِ علم کی تحصیل سے سیر نہ ہونا ہی طالبِ علم کے سیر ہو جانے کا سرچشمہ ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہم جلدی جلدی ان کی مزید گراں مایہ تحقیقات سے حظ اٹھائیں گے۔اللہ انھیں بالعافیت سلامت رکھے۔انھیں پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کی اشاعت مبارک کرے۔امین۔

منظر عارفی

کراچی

عباس علی شاہ کے مقالہ پر نگاہِ عاجزانہ

ایک علمی مقالہ بغیر تحقیق اور تنقید کے ردی کی دکان ہوتا ہے۔ اور ایسی ردی کی دکانیں ملکِ خداداد میں جا بجا بکھری پڑی ہیں۔ موجودہ عہد میں جہاں پر ہر شعبہ زوال کا شکار ہے وہاں پر یونیورسٹیوں میں لکھے جانے والے مقالہ جات بھی اس علت کا شکار نظر آتے ہیں۔ عمومی طور پر یہ مقالہ جات تحقیقی اور تنقیدی اوصاف سے عاری نظر آتے ہیں شعبہ اُردو کے غبی اور گپی اساتذہ کرام اپنی رقم کھری کرنا چاہتے ہیں جبکہ طلباء و طالبات ڈگری کے حصول کے لیے آسان پسندی کا شکار نظر آتے ہیں اس آسان پسندی میں اساتذہ کرام کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے جو گلی محلوں کے شعراء اور ادیبوں پر مقالہ جات لکھنے کی اجازت دے کر وقت ٹپانے کی خوبصورت روائت کو نبھاتے چلے جا رہے ہیں شاگردانِ ارسطو و افلاطون چاہتے ہیں کہ انہیں ایسا موضوع مل جائے جس پر زیادہ محنت درکار نہ ہو اور چند دنوں میں مقالے کی ہنڈیا تیار کر کے اساتذہ کرام کے سامنے رکھ دی جائے دلچسپ اور دردناک بات تو یہ ہے کہ نہ تو قوم کے معمار ادب کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں اور نہ ہی مستقبل کے مقالی بیمار ادب کے فروغ کے لیے لکھ رہے ہوتے ہیں ایسے میں جب مہرباں پیسہ اور طالبِ ڈگری کی خواہشات یک رخی ڈگر پر استوار ہوں تو مقالے کی ہنڈیا پوری آب و تاب سے شوں شاں کرتی ہوئی تیار ہو جاتی ہے۔ مقالے کی یہ ہنڈیا جلد بازی، تحائف، تعلق داری، سرقہ، نقل، لفظی اُترن، بے ڈھنگے اسلوب اور ڈگری کی طلب میں سامنے آتی ہے اب اُردو ادب کی اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ اس کاٹھ کے مقالے کو بغیر پرکھے اور جانچے ادب کی آگ پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ جہاں پر بغیر غور و فکر کے استناد کی مہر بھی عطا کر دی جاتی ہے اور جب یہ کاٹھ کا مقالہ ادیبوں اور نقادوں کے چوکِ قلمِ آزاراں میں پہنچتا ہے تو بیچ چوراہے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے کہ مصنف کے ساتھ ساتھ ماہرینِ تعلیم کو بھی لفظ آلود کر دیتا ہے۔ اس بحث سے یہ نتیجہ نکالنا بھی غلط ہوگا کہ تمام اساتذہ کرام ایک جیسے ہیں یا پھر تمام طلباء و طالبات ایک ہی سوچ کو بروئے کار لاتے

ہیں۔ کیونکہ اکثریت اسی طریقہ پر چلنے کو مقالے کی عزت قرار دیتی ہے اس لیے یہ بات ان ہی لوگوں پر منطبق ہوگی۔ محنتی اور اچھے اساتذہ کرام آج بھی بہترین کام کرواتے ہیں لیکن یہاں سوال اٹھتا ہے کہ ایک اچھے مقالے کو لکھنے کے لیے کون سے اجزاء لازم ہیں اس تناظر میں بغیر شک وشبہ کے اگر بہترین نگران اور استاد میسر آجائے تو طالبِ علم کا بوجھ آدھا رہ جاتا ہے اس کے بعد ایک اچھے مقالے کے لیے سب سے اہم چیز موضوع کا انتخاب ہوتا ہے کیونکہ موضوع ہی لکھنے والے کو تحقیق کی راہوں کا مسافر بناتی ہے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ تحقیق مقالے کے لیے اس آکسیجن کا کام کرتی ہے جس سے اس کی روح کا تعلق ادب کی دنیا سے جڑا رہتا ہے۔ اس سے اگلہ مرحلہ مقالے کا تنقید کی کسوٹی پر پورا اترنا ہے ایک اچھے مقالے کو تنقید کا ہنر ہی بہتری کی جانب لے کر جا سکتا ہے کیونکہ توصیفی اور تعریفی مقالہ جات کبھی بھی اُردو ادب کے دامن پر اپنے انمٹ نقوش ثبت نہیں کر سکتے اس لیے مقالہ نگار کے لیے لازم ہے کہ وہ تنقیدی اوصاف کو تحریر کا زیور بنا کر رکھے۔ تبھی وہ خوبیوں اور خامیوں کا محاکمہ کر سکے گا۔ ایک اچھے مقالے کے لیے حوالہ جات کی تلاش اور ان کا استعمال بھی مقالے کو چار چاند لگا دیتا ہے اسی طرح اگر مقالے کا اسلوب عمدہ، جاندار، تسلسل بیاں اور ادبی چاشنی کا رنگ رکھتا ہو تو مقالہ اپنی مثال آپ دکھنے لگتا ہے۔ حقیقت میں ایک اچھا مقالہ سوالات اٹھاتا ہے اور ان کے جوابات کے لیے ناقدین کو مدعو کرتا ہے۔

ایسا ہی ایک مقالہ پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کے نام سے لکھا گیا ہے۔ ایم فل اردو کا یہ مقالہ عباس علی شاہ نے تحریر کیا ہے یقینی طور پر اس کا موضوع نہ صرف بہترین ہے بلکہ اپنی وسعت کے اعتبار سے اس موضوع کو پی ایچ ڈی کی سطح پر بھی لکھا جا سکتا ہے۔ اتنے عمدہ موضوع کا چناؤ اس بات کی دلیل ہے کہ مقالہ نگار اور نگرانِ مقالہ نے تحقیق کو پیشِ نظر رکھ کر اس کو منتخب کیا ہے۔ قصیدے کا میدان بہت وسیع ہے اور اردو ادب میں سودا اور ذوق کو تو اس میدانِ خارِ زار کا شہسوار مانا جاتا ہے بعد کے ادوار میں قصیدہ گوئی کا اگرچہ رجحان کم رہا لیکن شعراء نے اس میدان کو خالی نہیں چھوڑا۔ عباس علی شاہ کا منفرد موضوع ہی اس مقالے کی اہمیت کو سامنے لے آتا ہے۔

عباس علی شاہ نے مقالے کے لیے تحقیق کا جو طریق اختیار کیا ہے وہ عمدہ ہے ان کی تحقیق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے کتنی کتابوں کی عرق ریزی کی اور تب جا کر حوالہ جات کو تلاش کیا ہے لیکن اس مقالے میں حوالہ جات کی بھر مار مقالے کی اصل تحریر کو دھندلا دیتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عباس علی شاہ نے ان حوالہ جات کو تلاش کرنے میں دن اور رات کے فرق کو ختم کر دیا ہوگا اور اس پر ان کو بے پناہ داد بھی دی جانی چاہیے لیکن اگر ہر صفحہ تین یا چار حوالوں سے بھرا ہوگا تو مصنف کی رائے کہیں گم ہو جائے گی۔ اصل میں مقالے کی ادبی اور علمی صلاحیت کا توازن ہی اسے انفرادیت بخشتا ہے۔

لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تحقیق اور جستجو کا اس سے بہترین انداز بہت کم دیکھنے کو ملا ہے۔ یہ مقالہ مستقبل میں قصیدہ کے حوالے سے ایک اہم دستاویز کی شکل اختیار کر سکتا ہے کیونکہ پہلے باب سے اختتام تک معلومات اور علم کا دریا بہتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ بعض مقامات پر علمی کاوش ادبی انداز پر غالب آ جاتی ہے اور کچھ جگہوں پر گمان گزرتا ہے کہ ادبی رچاؤ نے علمی رنگ کو خود پر اوڑھ لیا ہے۔ اس مقالے کا تحقیقی معیار نہ صرف پڑھنے والے کو متاثر کرتا ہے بلکہ مستقبل میں لکھنے والوں کو اپنی طرف مائل کرتا ہوا بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس مقالے کا پہلا باب ہی قاری کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے کافی ہے لیکن یہ بات یہیں تک محدود نہیں رہتی ہے عباس علی شاہ نے باقی ابواب میں بھی تحقیق کا یہی انداز اختیار کیا ہے۔ لفظی مطالب سے قصیدے کی اقسام اور اقسام سے اساسی محرکات تک کسی بھی موضوع کو ادھورا نہیں چھوڑا۔ اسی طرح قرانی آیات کے حوالے بھی فاضل مصنف کی محنت کا وہ ثبوت ہے جو بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ پہلے باب میں 54 حوالے ہیں جبکہ دوسرے باب میں 60 سے زائد حوالے ہیں اسی طرح باقی ابواب بھی عباس علی شاہ کی تحقیقاتی طبیعت کے ترجمان ہیں۔ حقیقت میں اس تحقیقی مقالے کو دیکھنے کے بعد یہی محسوس ہوتا ہے کہ اُردو ادب کی گود ابھی مکمل بانجھ پن کا شکار نہیں ہوئی ابھی ایسے افراد موجود ہیں جو اُردو ادب کے ماتھے کا جھومر برقرار رکھنے کے لیے تگ و دو کر رہے ہیں۔ عباس علی شاہ تاریخ کے گھوڑے پر بیٹھ کر ماضی کا سفر کرتے ہوئے ہر اس بات کا ذکر کرتے ہیں جو کسی نہ کسی انداز سے قصیدہ گوئی سے جڑی ہوئی

ہے۔ یہاں تک کہ ابتدائے قصیدہ سے موجودہ عہد تک قصیدے کی روایات کو شعراء کے ناموں کے ساتھ بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔عباس علی شاہ کی تحقیق نہ صرف قصیدہ گوئی کو معتبر کرتی ہے بلکہ ان کی اپنی علمی صلاحیتوں کو بھی آشکار کرتی ہے۔یہی علمی رنگ پورے مقالے کی فضا پر چھایا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ان کا اسلوب قاری کو مقالے کی علمی اور ادبی فضاؤں میں لے جاتا ہے جہاں وہ خود کو معنوی دنیا کا باسی خیال کرتا ہے ان کا اسلوب جہانِ نکتہ خیزی سے موضوعاتی پھول چن کر تحریر کو نئی جہتیں عطا کرتا ہے۔عباس علی کا اسلوب جہاں عام فہم اور سادہ گوئی سے آشنا ہے وہاں پر ان کے اسلوب میں ارتقاء کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔تحریری ارتقالفاظی کی خوشبو سے مہکا ہوا محسوس ہوتا ہے اگر کسی جگہ پر تحریر بوجھل ہو جاتی ہے تو اس کی وجہ مقالے کی علمی نوعیت کا ہونا ہے کیونکہ علمی اصلاحات بعض اوقات تحریر میں خشکی اور کھردرا پن پیدا کر دیتی ہیں لیکن عباس علی شاہ مشکل تحریر کو بھی آسان پسندی کا لباس پہنانے پر قادر ہیں۔مقالے میں جملوں کی ساخت اور ربط نہ صرف قاری کو متوجہ رکھتا ہے بلکہ مصنف کی تحریری صلاحیت کو نمایاں بھی کرتا ہے۔عباس علی شاہ کا اسلوب کہیں بھی عامیانہ یا پست محسوس نہیں ہوتا کیونکہ ان کی تنقیدی صلاحیت اس اسلوب کو اور نمایاں کر دیتی ہے ایک اچھا مقالہ کیوں کہ تنقیدی ستونوں پر کھڑا ہوتا ہے اس لیے عباس علی شاہ نے اس وصف کو بہت منفرد انداز میں برتا ہے۔شعرا کے اشعار پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے ان کی خوبیوں اور خامیوں کا اس طرح محاکمہ کیا ہے کہ ان کے کام کو بطورِ حوالہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔عمومی طور پر مولانا ظفر خان کی قصیدہ نگاری سے چشم پوشی کی جاتی ہے لیکن عباس علی شاہ نے ان پر تنقیدی جائزہ پیش کر کے ایک نئی طرح ڈالی ہے اسی طرح پاکستان بننے کے بعد قصیدہ نگاروں کا صرف تعارف نہیں دیا گیا بلکہ ان کے قصیدوں کی پرکھ ایک ماہر سرجن کی طرح کی گئی ہے۔ یہ پرکھ وہی شخص کر سکتا ہے جو خود قصیدہ گوئی سے شغف رکھتا ہو جو یہ جانتا ہو کہ ایک اچھے قصیدے میں کون سی خوبیاں موجود ہیں اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عباس علی شاہ نہ صرف قصیدہ گوئی کو سمجھتے ہیں بلکہ ان کا تنقیدی شعور دوسرے قصیدہ نگاروں کی صرف خوبیوں کو نمایاں نہیں کرتا بلکہ خامیوں کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عباس علی شاہ کے مقالے میں وہ تنقیدی توازن موجود ہے جو کسی بھی بہترین

مقالے کی جان سمجھا جاتا ہے۔اس طرح کے ادبی اور علمی مقالات کو کتابی شکل دینے کے لیے ایچ ای سی یا ادبی اداروں کا عملی میدان میں آنا وقت کی ضرورت ہے ایچ ای سی یا پھر اکادمی ادبیات جیسے ادبی اداروں کو تمام یونیورسٹیوں سے رابطہ کر کے بہترین مقالہ جات کو چھپوانے اور کتابی شکل میں لانے کا انتظام بھی کرنا چاہیئے کیونکہ اگر عباس علی شاہ کی اس کاوش کو نظر انداز کیا گیا تو مستقبل میں اچھا ادب تخلیق ہونے کی آرزو دم توڑ جائے گی۔اگر غیر جانبداری سے عباس علی شاہ کے مقالے پر نگاہ ڈالی جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ مقالہ لکھنے والا ادب نواز اور سر سے پاؤں تک اُردو ادب کی خدمت سے سرشار ہے عباس علی شاہ کی یہ کاوش اُردو ادب میں ہمیشہ ایک خاصے کی چیز سمجھی جائے گی۔

خیر اندیش

آفتاب شاہ

سیالکوٹ

اُردو میں حمدیہ قصیدہ

تحقیق کے نتیجے میں جو بیانیہ مرتب ہوتا ہے اس پر محقق ایمان کی حد تک یقین کر لیتا ہے جبکہ بہتری کی گنجائش کے مصداق اس بیانیے کو رد کرنے کے امکانات بھی آنے والے دنوں میں موجود ہوتے ہیں کہ کوئی دوسرا محقق آگے چل کر اسکے برعکس بھی نتائج حاصل کر سکتا ہے چونکہ علم تو لامحدود ہے اس لیے امکانات بھی لامحدود ہی ہوتے ہیں اور کوئی شخص مکمل طور پر علمیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور یہ تو مسلسل بازیافت و دریافت کا عمل ہے حمد نظم کی وہ صنف ہے جس کو بہ لحاظ درجہ بندی اولیت حاصل ہے کیونکہ تعریف خالق کائنات کی ہے جبکہ قصیدہ نگاری مخلوق میں سے ہی بادشاہوں شہنشاہوں، حاکموں اور حکمرانوں کی تعریف وتوصیف کرنے کا نام ہے قصیدہ ابتدا میں عرب کی سرزمین میں ملتا ہے اور اسکی ساخت غزل کے اصولوں سے مماثلت رکھتی ہے زمانہ قدیم میں درباری شعراء کا ہمیشہ سے وطیرہ تھا کہ وہ شہنشاہوں کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملایا کرتے تھے یہی انکی روزی کا وسیلہ تھا دونوں اصناف شاعری یعنی نظم اور قصیدہ کی آمیزش سے نیا باب کھلتا ہے جسکا نام حمدیہ قصیدہ طے پایا حمدیہ قصیدہ نگاری اولاً شمالی ہند میں ہوتی ہے جہاں قلی قطب شاہ کے ہاں فارسی میں حمدیہ قصیدہ ملتا ہے یہ وہ دور تھا جب فارسی رفتہ رفتہ کم ہو رہی تھی اور اردو زبان غزل کا حصہ بنتی جا رہی تھی جیسا کہ حضرت امیر خسرو کی غزل میں شعر کا پہلا مصرع فارسی اور دوسرا اردو کا بھی پایا جاتا ہے اور غزل کی مانند قافیہ اور ردیف اسکے لیے لازم ہے لیکن قصیدہ کے ہر شعر میں قافیہ اور ردیف کی پابندی ہے اور نظم کے ساتھ گندھ کر کلام کو دوآتشہ بنا دیتا آگے چل کر امیر مینائی اور محسن کاکوری کے معاصر شعرا نے حمدیہ قصیدہ پر طبع آزمائی کی ہے یہ تمام قصیدے بہت معیاری گنے جاتے ہیں ایک روایت یہ بھی ہے کہ مرزا رفیع سودا کے عہد میں حمدیہ قصیدہ نگاری مروج ہوئی اور صدر الدین محمد خان فائز دہلوی پہلے اردو زبان کے حمدیہ قصیدہ نگار جانے جاتے ہیں عباس علی شاہ ثاقب نے بھی قصیدہ نگاری کو اپنایا ہے اور وہ عہد حاضر میں اس تحریک کا حصہ بھی ہیں جوان شعراء پر مشتمل

ہے پاکستان میں تواتر سے لوگ حمدیہ قصیدہ پر کام کر رہے ہیں بین ثبوت تو عباس شاہ کا ایم فل میں تحقیق کے لیے موضوع بھی حمدیہ قصیدہ نگاری اور پاکستانی شعراء کا انتخاب کرنا ہے اس نے جس عرق ریزی سے شبانہ روز محنت کی ہے اور ایک بیانیہ کے قیام کی کوشش بھی گویا عباس کو ان محققین اور مفسرین کے قبیلے میں شامل ہونا پسند ہے کیونکہ یہ کام انتہائی مشکل اس لیے بھی ہے کہ اپنے بیانیے کے لیے رائے ہموار کرنا بہت مشکل عمل ہوتا ہے نہ صرف ماہرین لسانیات بلکہ عوام الناس کو بھی ایک صفحے پر لانا انتہائی دقت طلب اور انتھک امر ہے اس لیے میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ عباس نے ثابت کیا ہے کہ وہ مشکل پسند بھی ہے اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ بھی دل و دماغ میں لیے ہے

سید جمال زیدی

باب اول

قصیدہ: بنیادی مباحث

ہزار شکر بہ درگاہِ پاک یزدانی
ہے جس کے فیض سے سب مشکلوں کو آسانی
(غلام حسین ہدایت)

قصیدہ: بنیادی مباحث

قصیدے کا معنی و مفہوم

قصیدہ اردو شاعری کی وہ معروف صنفِ سخن ہے جس میں ہر نام ور اور عظیم شاعر نے اپنا زورِ بیان دکھا کر اپنی مہارت کا لوہا منوایا ہے۔ یہ مقبول صنفِ سخن زمانی و مکانی تنوّع اور بُوقلمونیوں سے مالا مال ہے۔ مشرقی شاعری کی اصناف میں قصیدے کو ''شہنشاہِ اقلیمِ ادب'' کا درجہ حاصل ہے۔(۱)

قصیدہ، عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مادہ ق ص د ہے۔ مختلف لغات میں اس کے مختلف معانی ملتے ہیں۔ مثلاً المنجد میں لکھا ہے:

''القصیدہ من الشعر؛ وہ اشعار جو سات یا دس سے زیادہ ہوں۔'' (۲)

باب ضرب میں لفظ ''قصد'' کے معانی ''ارادہ کیا ہوا'' ہیں اور بابِ کرم میں لفظ ''قصد'' کے معانی ''موٹا، گاڑھا اور غلیظ'' کے ہیں۔(۳)

اس کے مادہ قصد کے پیشِ نظر، یہ معانی بھی درج کیے جاسکتے ہیں۔

''پُر مغز گودا، اونٹ کا موٹا ہونا، توجہ کرنا، اعتماد کرنا، کسی کی طرف چلنا، سیدھا ہو کر چلنا، کسی کو کسی کام پر مجبور کرنا، نفس پر قابو رکھنا، کسی معاملہ میں اعتدال و میانہ روی کرنا، استقامت اختیار کرنا، بے خطا نیزہ مارنا، سانپ کا ایسا ڈسنا کہ جاں بر نہ ہو سکے، کسی کام کا ارادہ کرنا، خشک گوشت وغیرہ۔''(۴)

یوں قصیدے کا نام زبان پر آتے ہی اس کے تمام ممکنہ معانی کا عملی وجود ذہن میں نقش ہو جاتا ہے۔ لغوی اعتبار سے قصیدے کے بارے میں سید احمد دہلوی لکھتے ہیں:

''قصیدہ (ع) اسم مذکر: ٹھوس اور بھرا ہوا مغز یا دماغ سطبر۔'' (۵)

صاحب نور اللّغات قصیدے کے معنی یہ بیان کرتے ہیں:

''(ع، لغوی معنی : دلدر گودا) مذکر۔ (اصطلاح) ان اشعار کا نام جن میں کسی کی ہجو، مدح یا وعظ و نصیحت یا تعریف بھار یا شکایت روزگار مضامین بیان کیے جائیں۔ قصیدے کے پہلے دونوں مصرعوں اور ہر شعر کے دوسرے مصرع میں قافیہ ہونا ضروری ہے۔'' (۶)

شاعری تہذیب کی امانت اور زندگی کی آئینہ دار ہوتی ہے مگر جب ایک سرحد کے محافظ کی طرح شعوری طور اپنے نظریات، خیالات، تہذیب اور آئیڈیالوجی کی حفاظت پر مامور ہو تو اس کے مصمّم ارادوں، ترجیحات اور قصد کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی طرح قصیدہ نگار اپنے قصد اور پختہ ارادے سے اس صنفِ سخن کی تکمیل کرتا ہے۔ ڈاکٹر سعادت سعید قصیدے کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

''عربی، فارسی اور اردو لغات اور نقادوں نے بالا تفاق قصیدے کو ارادی شاعری کے زمرے میں شمار کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے پر مغز ہونے کو بھی بنیادی اہمیت دی ہے یوں قصیدہ دیگر اصنافِ سخن کے مقابلے میں منفرد اہمیت کا حامل ٹھہرا ہے۔۔۔ اس صنف میں بھاری بھرکم اور شان و شوکت کے حامل الفاظ و اسالیب، پر مغز خیالات اور فلک رس افکار کا ہونا بھی ضروری ہے۔۔۔ قصیدے کے اشعار عمدہ، مہذب کیے ہوئے اور پاکیزہ بھی ہونے چاہییں۔'' (۷)

یہاں تک قصیدہ کے اصطلاحی معانی ہیں، اس بارے میں ڈاکٹر ابو محمد سحر لکھتے ہیں:

''اصطلاحاً قصیدہ اس مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے اور بقیہ اشعار کے دوسرے مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوں اور جس میں مدح یا ذم، نصیحت، موعظمت یا مختلف کیفیات و حالات وغیرہ کا بیان ہو۔'' (۸)

قصیدہ کے بارے میں شمیم احمد یوں رقم طراز ہیں:

''اسے اصنافِ سخن میں وہی حیثیت حاصل ہے جو انسانی جسم میں مغزِ سر کو حاصل، لہٰذا اسے مغزِ سخن تصور کر کے قصیدہ کا نام دیا گیا ہے۔ لفظ قصیدہ کی ایک توجیع یہ بھی کی گئی ہے کہ یہ لفظ۔۔۔لفظ قصد سے مشتق ہے اور شاعر جب کسی کی مدح یا ذم کے اشعار کہتا ہے تو اس میں اس کے قصد اور ارادے کو دخل ہوتا ہے۔''(۹)

قصیدے کی ہیئت کے تناظر میں بحث سے قبل نجم الغنی رام پوری کی رائے ملاحظہ ہوں:

''قصیدہ اصطلاح میں ان اشعار کا نام ہے جن میں کسی کی مدح یا ہجو ذکر کی جاتی ہے یا وعظ و نصیحت بند و موعظمت یا تعریف بہار یا شکایت روزگار وغیرہ مضامین درج ہوتے ہیں۔''(۱۰)

کلاسیکی ادب آرٹ، معنویّت کی شدت اور جذبات کے محرکات میں لطافت و ربط کا تسلسل ہے۔ کلاسیکی ادب میں شعرا کرام اپنی شاعرانہ مہارت کا مظاہرہ کرنے کے لیے قصائد تحریر کرتے اور پھر ان کی استادانہ مہارت سے اس بات کا اندازہ سے لگایا جاتا تھا کہ وہ کس مقام و مرتبہ کا قصیدہ نگار رہے۔ گویا ادبیاتِ مشرق میں قصیدے کی صنف کسی شاعر کی شاعرانہ صلاحیّتوں کا امتحان گردانی جاتی ہے اور یوں شاعر کو درجہ اعتبار عطا کرتی ہے۔ قصیدہ اپنی نوعیّت اور معنویّت کے اعتبار سے آمد سے زیادہ آورد کا حامل ہوتا ہے۔ قصیدے میں آورد کو بروئے کار لا کر اس میں تخیّل کی بلند پروازی، جاہ و جلال، چاشنی، بلاغت اور لطافت پیدا کی جاتی ہے۔

اگرچہ اصطلاحاً قصیدہ کا اطلاق مخصوص ہیئت پر مبنی کسی کی ذم، ہجو یا تعریف پر مشتمل اشعار پر ہوتا ہے، لیکن عام طور پر اس سے مراد مدح کے اشعار ہی لیے جاتے ہیں اس کے اِدراک کے لیے قصیدے کا دربارِ شاہی سے جو تعلق رہا ہے اسے پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ درباروں کے زوال کے ساتھ ہی مدحیہ قصیدے بھی زوال پذیر ہو گئے۔ اس حوالے سے حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

''(قصیدہ میں) مدح و ہجو، رزم و بزمِ عرفان و اخلاق، سبھی کچھ

بیان ہوتا رہا ہے لیکن قصیدہ اردو میں براہِ راست عربی سے نہیں بلکہ
فارسی کے توسط سے آیا ہے اور اردو کے قصیدہ گو شعرا نے قصیدہ
نگاری میں بالعموم فارسی شعراء ہی کی تقلید کی ہے اور اردو شاعری کے
آغاز کے وقت فارسی قصیدہ بڑی حد تک مدح کی تنگنائے میں محصور
ہو چکا تھا، فارسی نمونوں کی تقلید کا نتیجہ یہ ہوا کہ قصیدے کو ایک
سرکاری درباری صنف سمجھ لیا گیا۔ اس طرح قصیدہ اور مدح لازم و
ملزوم ہو گئے اور جب درباروں اور درباری ماحول کا خاتمہ ہوا تو
قصیدے کو بھی ایک متروک اور مردود صنفِ سخن قرار دیا گیا۔''(۱۱)

قصیدہ نظم کی طرح اپنے موضوع کا احاطہ کرتا ہے اور ممدوح ہی مرکزی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ مدح قصیدے کا بنیادی اور بڑا موضوع ہوتا ہے۔ موضوع کے ساتھ ساتھ ہیئت کو بھی قصیدے میں ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ اس کی پیشانی پُر شکوہ الفاظ، انداز بیان میں چاشنی اور دامن جاہ وجلال سے مزیّن ہوتا ہے۔ یہی قصیدہ نگار کا مطمحِ نظر ہوتا ہے۔ رفیع الدین ہاشمی اس ضمن میں یوں رقم طراز ہیں:

''اچھا قصیدہ معنوی اعتبار سے بلند تخیل اور سچے جذبات کا حامل
ہوگا۔ اس کی زبان ابتذال، فحش گوئی، تعقید اور اجنبی محاورات سے
پاک ہوگی۔ صنائعِ بدائع برمحل اور برجستہ ہوں گے اور الفاظ و
تراکیب میں شکوہ، وقار، شستگی اور تاثیر ہوگی۔''(۱۲)

قصیدے کا موضوعاتی ارتباط اور باہمی ربط اصنافِ شاعری میں انفرادیّت کا حامل ہے۔ آہنگ قصیدے کا وصفِ خاص ہے۔ قصیدہ نگاری کے لیے موضوع اور ہیئت لازم وملزوم ہیں۔ قصیدے کی تکمیل میں مضمون کا ربط کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر محمد افتخار شفیع اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''قصیدے میں بھی مثنوی اور مرثیے کی طرح مضامین باہم مربوط
ہوتے ہیں۔''(۱۳)

قصیدے کی درج بالا تعریفوں سے یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ یہ صنفِ شاعری

مدح یا ذم کا عنصر اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔اردو ادب میں مدحیہ قصائد کی تعداد زیادہ ہے مگر جو ذم کے مضمون پر مبنی قصائد ہیں نہایت قلیل ہیں۔اگر یہ کہا جائے کہ آٹے میں نمک کے برابر ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ایک سوال ذہن میں اُبھرتا ہے کہ آیا قصیدہ ہیئت ہے یا موضوع؟ اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ صنفِ سخن خاص موضوع کی حامل ہے اور اسے مروجہ ہیئت میں ہی نظم کیا جا سکتا ہے۔اگر عربی اور فارسی شاعری پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قصیدہ کی صنف ایک مخصوص ہیئت کے تابع رہ کر پھلی پھُولی اور کمال تک پہنچی ہے جس میں گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ موضوعاتی تبدیلیاں رُونما ہوتی رہی ہیں۔قصیدے میں ہیئت اور موضوع کا چولی دامن کا ساتھ ہے دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ یوں قصیدہ موجودہ مقبول صنف کے درجے پر فائز ہوا ہے۔

درحقیقت یہ لفظ القصد (قصد یقصد باب ضرب یضرب) سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں ارادہ کرنا۔عربی اور فارسی شعر و ادب کے ناقدین کی بڑی جماعت قصیدہ نگاری کے لیے قصد و ارادہ کو بنیادی درجہ دینا لازمی امر خیال کرتے ہیں۔یہی پہلو اسے دوسری اصنافِ سخن سے امتیازی وصف عطا کرتا ہے۔تاجدارِ کائنات نے ایک مرتبہ چند کلمات اپنی زبانِ اطہر سے ادا فرمائے، جو بظاہر دو مصرعوں کی ہیئت میں تھے۔ ایسا اتفاقاً ہوا تھا۔فرمائے گئے مصرعے بظاہر بامعنی تھے اور موزوں و مقفٰی بھی،لیکن اسے شعر کا درجہ نہیں دیا گیا، کیوں کہ اس کے کہنے میں آنحضرت ﷺ کا قصد و نیّت اور ارادہ نہ تھا۔محمود الٰہی نے ابنِ رشیق کا یہ قول اپنی کتاب میں یوں نقل کیا ہے۔

> ''نبی ﷺ کے قول (موزوں فقرے) کو شعر نہ سمجھنے کی دلیل قصد و نیت کا فقدان ہے کیوں کہ آپ ﷺ نے ان فقروں سے نہ تو شعر کا قصد کیا تھا اور نہ اس کی نیت،اس لیے اسے شعر نہیں سمجھا جاتا،اگرچہ وہ کلام موزوں ہے۔''(۱۴)

قصیدے کی صنفی شناخت

قصیدے کی صنفی شناخت کے حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر طویل نظم مدح کے ذیل تو تصور کی جا سکتی ہے مگر اسے قصیدہ کا درجہ نہیں دیا جا سکتا کیوں کہ قصیدہ کی اپنی ایک

مخصوص ہیئت ہے جو مختلف اجزاء اور نوعیت و پیش کش کے اعتبار سے منفرد ساخت کی حامل ہے۔اسی نکتہ نظر کو ڈاکٹر ابو محمد سحر یوں بیان کرتے ہیں:

> ''قصیدے کی صنفی تشکیل میں اس کی ہیئت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔عربی کی قدیم شاعری ایسی نظموں پر مشتمل تھی جن کے مطلعوں کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے تھے۔۔۔۔فارسی شعرا نے مدحیہ نظموں میں عربی شاعری کی اس مروجہ ہیئت کو اپنایا۔فرق بس اتنا ہوا کہ عربی میں صرف قافیہ تھا۔فارسی کے شعرا نے صرف اس پر ردیف کا اضافہ کر دیا۔بعد کے تمام شعرا نے اسی کی تقلید کی اور یہ ہیئت قصیدے کے لیے مخصوص ہوگی۔''(۱۵)

قصیدے کی صنفی شناخت کے لیے احوال و آثار کا مطالعہ ضروری ہے تا کہ حقائق کا تعین ہو سکے کیوں کہ ابتدا ہی سے قصیدہ نگار،قصیدہ نگاری کے لیے مروجہ ہیئت کو اپنا کر زینتِ قرطاس بناتے آرہے ہیں سخن سنجی اور سخن فہمی کا تقاضا ہے کہ آغاز سے حال تک کے احوال و آثار کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر دیکھا جائے تو تقریباً تمام شعرا نے قصیدہ کی اسی ہیئت میں لکھا ہے جو آج بھی رائج ہے۔قصیدے کی ہیئت کے حوالے سے ڈاکٹر سعادت سعید بڑے مدلل و عمدہ نداز میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''مسدس،مخمس ، قطعہ ،ترکیب بند،ترجیع بند،مثنوی یا کسی اور غیر غزلیہ ہیئت میں لکھی گئی نظموں کو مدحیہ نظمیں تو کہا جائے گا ،صنف قصیدہ کی حدود میں انھیں شامل نہیں کیا جا سکتا۔''(۱٦)

اردو زبان و ادب میں زندہ شخصیات کی تعریف و توصیف اور مدح مروجہ ہیئت میں کرنے کے عمل کو قصیدہ کی حیثیت حاصل ہے۔اسی طرح سے وہ مشاہیر جو وفات پا چکے ہیں ان کی عظمت ،شان و شوکت ،مقام و مرتبہ اور تعریف و توصیف بیان کرنا کہ جس میں تاسف یا افسوس کا ذکر ہو،مرثیہ کہلاتا ہے۔

اچھائیوں،خوبیوں،فضل ، برتری ،ہنر،قائدانہ صلاحیتوں،عمدہ کردار،پیشہ ورانہ اخلاقیات ،فضائل ،تدبّر ،تفکّر ، ذہانت ،متانت ،سنجیدگی ، اعتدال،شجاعت و بہادری،جاں

بازی وسرفروشی، اخلاق اور خلاقیت کا تذکرہ اس انداز کے ساتھ کرنا کہ دل ودماغ ممدوح کے حوالے سے نئی جہات کے امکانات سے مستنیر ہو جائے یہ مدحیہ قصیدہ ہوگا۔اسی طرح عیوب، برائیوں، اخلاقِ رذیلہ پر گرفت کرنا بھی قصیدہ نگار کا مطمحِ نظر رہا ہے۔درج بالا نکات وہ ہیں جن کا اطلاق قصیدے کے موضوع اورContent کی ہمہ جہت نوعیت پر مصداق آتا ہے۔قصیدے کی صنفی شناخت کے ضمن میں موضوع کا بیان اور اِدراک حوالہ بن کر اس کی توثیق کرے۔

قصیدے کوصنفی شناخت کے اعتبار سے دیگر اصنافِ شاعری خاص طور پر غزل پر جو امتیازی وصف حاصل ہوا ہے، وہ شکوہِ الفاظ وتراکیب، بلند پروازیِ تخیل اورزورِ بیان کی بنیاد پر حاصل ہوا ہے۔اجزائے ترکیبی کے حوالے سے قصیدے کو بنیادی طور پر دو اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے جسے مقتضب اور مشبب کہا جاتا ہے۔

مشبب وہ قصیدہ ہوتا ہے جس میں تشبیب (نسیب)اور گریز کا اہتمام لازمی طور پر کیا جاتا ہے۔قصیدے میں تشبیب کی پابندی کو قصداً اوّلیت دی جاتی ہے۔اس طرح ،مقتضب وہ ہوتا ہے جس میں تشبیب اور گریز کی پابندی نہیں کی ہوتی۔وہ قصائد جن میں درباری یا مذہبی مدح کا موضوع زیب قرطاس ہو اس میں حسنِ طلب اور ہمیشہ دعائیہ حصہ التزام کے ساتھ شامل ہوتا ہے۔قصیدے کا پہلا شعر اس طرح ہم قافیہ وہم ردیف ہوتا ہے جس طرح غزل کا مطلع ہوتا ہے۔اس باہمی مشابہت کے باوجود بھی یہ غزل کیوں نہیں؟اس تفاوت کا سبب یہ بھی ہے کہ غزل کا ہر شعر ایک اکائی ہوتا ہے۔اور کلیتاً معنی کا حامل ہونے کے باعث ایک جامع اور پرُمغز معنی کے ساتھ صفحہ قرطاس کی زینت بنتا ہے اس کے برعکس قصیدے کا ہر شعر اپنے اندر مدح وذم میں سے ایک صفت کے ساتھ کسی کے مکمل وجود کا احاطہ کرتا ہے۔قصیدے کا ہر شعر اپنے ممدوح کی شخصیت کے کسی ایک پہلو یا گوشے کی عکاسی کرتا ہے۔شکوہ الفاظ قصیدے کے میلان کا عکاس تو ہوسکتا ہے مگر اردو غزل بھاری بھرکم الفاظ وتراکیب کا بوجھ اپنے نرم ونازک شانوں پر اٹھانے کی متحمل نہیں ہوسکتی۔غزل نے اگر چہ قصیدے کے بطن سے جنم لیا ہے تاہم قصیدہ موضوع کے حوالے سے نظم سے مماثلت رکھتا ہے اور یہی سبب ہے کہ قصیدہ باعنوان ہُوا

کرتا ہے جب کہ غزل بلاعنوان۔ یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ قصیدے اور غزل کا باہمی رشتہ ماں بیٹی کا ہے کیوں کہ غزل در حقیقت قصیدے کے ہی ابتدائی جُز تشبیب یا نسیب کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس کے فرق میں ذرا تدبّر و تفکر کی ضرورت ہے۔ باہمی تفاوت کا اندازہ لگاتے ہوئے نہایت بارِیک بینی سے مشاہدہ درکار ہے کیوں کہ ہر طویل غزل قصیدہ نہیں ہوسکتی اور ہر مختصر قصیدہ غزل کے زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ ہر قصیدے میں موضوعات کا باہمی ارتباط، اجزاء کی درجہ بندی اور تسلسل ضروری ہے۔ قصیدے کا غالب موضوع مداحی ہے مگر اردو میں بہت کم غیر مدحیہ قصیدے بھی ملتے ہیں۔ تضحیکِ روزگار اس کی عمدہ مثال ہے۔ ذم و ہجو میں مرزا محمد رفیع سودا کو امتیازی مقام حاصل ہے۔

شناخت کے صنفی اعتبار سے قصیدے کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موضوعات میں جس قدر وسعت آتی گئی بحیثیّت موضوع اس صنف شاعری کے امکانات روشن ہوتے گئے۔ قصیدہ مخصوص عروضی ڈھانچے کا پابند ہوتا ہیاور اس میں زمانی و مکانی تسلسل سے مدحیہ مضامین قلم بند کیے جاتے رہے ہیں۔ قصیدہ عروضی ڈھانچے کے علاوہ ہیئت کا جامہ پہن کر ہی صنفِ ادب میں تخصیصی درجہ اختیار کر گیا ہے۔ ادبیاتِ مشرق اور اردو زبان کی اصنافِ شاعری کا تانا بانا کسی نہ کسی صورت میں جزوی یا کلی طور پر عربی اور فارسی زبان و ادب سے مل جاتا ہے۔ یہ باہمی مماثلت یا ربط صُورت کے حوالے سے بھی ہے اور معنی میں بھی ہے۔ فکری، فنّی اور ہیئتی اتصال سے اشتقاق کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

قوافی کے آخری حرف کو بنیاد بنا کر قصائد کو الفیہ، بائیہ، تائیہ، جیمیہ، رائیہ، کافیہ، لامیہ، میمیہ اور نونیہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ شاعر اپنی تخلیق کی صنفی شناخت کے حوالے سے حد درجہ حسّاس ہوتا ہے۔ قصیدے کے لیے صناعانہ اور فنکارانہ انداز فطری امر ہے اس لیے قصیدہ نگار پر لازم آتا ہے کہ زبان پر قدرتِ کاملہ رکھنے کے ساتھ ساتھ مختلف علوم و فنون مثلاً فنونِ لطیفہ، علمِ نجوم، علمِ ارضیات، علمِ فلکیات، علمِ نباتات، علمِ حیوانات، علمِ جمادات، علمِ طب، علمِ معاشیات، علمِ اخلاقیات، علمِ ادیان، تقابلِ ادیان، توحید، قرآنِ مجید اور کائنات کے مشاہدہ وغیرہ پر بھی کامل دسترس رکھتا ہو۔ بصورتِ دیگر اعلیٰ پائے کے قصائد کا گمان بے کار اور ناممکن

ہو گا۔قصیدے کی صنفی شناخت کو مثال کی مدد سے قابلِ فہم بنایا جا سکتا ہے۔وہ یوں کہ کسی بھی آرٹ کی ظاہری شکل وصورت سے اس کے جاذبِ نظر ہونے یا غیر جاذبِ نظر ہونے کا اندازہ لگایا کا سکتا ہے۔جب ہم کسی فنِ تعمیر کے شاہکار کا نظارہ کرتے ہیں تو ہمیں ماہرِ تعمیرات کی ذہنی اختراع،مہارت، دل چسپی ،ارادے اورلگن کا اندازہ ہوتا ہے۔پیٹرا دنیا کا تیسرا بڑا عجوبہ اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔اسی طرح ہی قصیدہ اپنی شان وشوکت، جاہ وجلال،آرٹ کی گل کاری اور فنِ تعمیر کا دل کش نظارہ پیش کرتا ہے۔قصیدہ نگار نگینہ سازی، کندہ کاری، کشیدہ کاری،اور پتھروں کو تراش کر گلہائے انارِ آتشیں بنا کر پیش کرتا ہے۔یوں قصیدہ خلوص اور رعنائیِ فکر کی حدوں سے نکل کر موضوع کا ہیئتی جامہ پہن کر فن کا اعجاز بن جاتا ہے۔امداد امام آثر کے مطابق:

> ''قصیدہ گوئی کا مطلب یہ ہے کہ شاعر اعلا درجہ کے مضامین داخلی اور خارجی کو پسندیدہ عنوان سے پیرایہ نظم میں بیان کرے۔ یاد رہے کہ یہ صنف شاعری غزل سے زیادہ وسیع دائرہ خیال رکھتی ہے۔۔۔غزل میں صرف داخلی مضامین بندش پاتے ہیں اور مضامین خارجی کو غزل سے علاقہ نہیں ہوتا۔مگر قصیدے کے لیے جو مضامین داخلی کو تمام تر حکیمانہ رنگ رکھنا چاہیے۔مثلاً یہ قصیدہ کی شان سے ہے کہ اس میں توحید، عدل، نبوت، امامت، معاد تمدن، معاش، معاشرت و دیگر امور دینی و دنیوی کے مضامین میں جگہ پائیں یا اخلاقی معاملات از قسم صداقت وخلوص وشجاعت و ہمت ،فتوت ومروت وسخاوت وغیرہ موضوع کیے جائیں۔ یا علیحدہ درجہ کے مضامین ذہنیہ جو اقسام جذباتِ قلبیہ سے ہیں۔ زور بیان کا لطف دکھائیں داخلی مضامین کے علاوہ جو خارجی مضامین باندھے جائیں ان کو تقاضائے فطرت سے خالی نہیں ہونا چاہیے۔ کہ قصیدہ میں نیچرل مضامین کی حاجت ہے۔'' (۱۷)

قصیدے کے محاسن ومعائب

حسن وقبح کسی بھی ادب پارے میں کسی نہ کسی صورت میں پایا جاتا ہے۔اب یہ تنقید

نگار پر لازم آتا ہے کہ وہ کھرے اور کھوٹے کو الگ الگ کر کے حسن و قبح کے حوالے سے فکری و فنی اُصول وضوابط متعیّن کرے۔

محاسن قصیدہ

کلام میں محاسن ادب پارے کوشہ پارہ بنا دیتے ہیں جس سے تخلیق اور تخلیق کار کا مقام و مرتبہ بلند ہو جاتا ہے۔یوں اصنافِ ادب کا دامن مزید تزئین وآرائش اور موضوعاتی بوقلمونیوں سے مالا مال ہو جاتا ہے۔عصری تقاضوں کا حامل ،جغرافیائی ونظریاتی خوبیوں اور ادبی چاشنی کا حامل فن پارہ ہر دور میں کیفِ دوام اور بقائے دوام کے درجہ پر فائز ہو جاتا ہے۔اس کے برعکس اگر کلام عیوب کا شکار ہو جائے تو ادب کا چہرہ مکدر اور پائمال ہو جاتا ہے۔

دیگر اصنافِ سخن کی طرح قصیدے کے لیے بھی ناقدین نے حسن و قبح کے پیمانے مقرر کیے ہیں جن کی روشنی میں حسن وخوبی اور کمی وکوتاہی کا اِدراک ممکن ہو جاتا ہے۔کچھ معیارات کا اجمالی ذکر لازمی تصور کیا جاتا ہے۔

اس حوالے سے چیزوں کو عمدہ اور خوب صورت انداز میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔قصیدے میں مطلع کو خاص اہمیت حاصل ہے۔یہ اس قدر پُرکشش اور پُر جوش ہونا چاہیے کہ سامع نہ صرف عش عش کر اٹھے اور خوش ہو جائے بلکہ باقی قصیدہ سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو جائے۔اس کی بے قراری دیدنی ہو،اس کا اشتیاق اور تجسّس بڑھ جائے۔بعض قصائد میں دودو،تین تین مطالع بھی پائے گئے ہیں جسے خوبی تصور کیا جاتا ہے۔ایسے قصیدے کو ذوالمطالع اور ذات المطالع کہا جاتا ہے۔قصیدے کا تمہیدی جُزو جسے تشبیب بھی کہا جاتا ہے اس کی کامیابی کا انحصار مدح اور ممدوح کے باہمی ارتباط وانسلاک پر ہے۔دوم گریز کو قصیدے میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔اسے قصیدے کی جان کا درجہ دیا جاتا ہے اور یہ انتہائی مشکل امر ہے اسے عمدہ ہونا چاہیے۔گریز جس قدر عالی ہوگا اسی قدر قصیدہ اُتم ہوگا۔گریز انتہائی نازک ہوتا ہے کیوں کہ اس میں دو سرکش بیلوں کا آپس میں ملاپ ہوتا ہے۔سوم حسنِ طلب میں ایسا مؤثر پیرایۂ اظہار ہو کہ ممدوح اپنی نوازشات اور انعام واکرام کا در کھول دے۔چہارم مقطع اس قدر

معنی خیز اور پُر حکمت ہو کہ ابیات میں از سرِ نو فرحت، طراوت، تازگی اور ہمدردی کا احساس پیدا ہو جائے ورنہ سارے قصیدے کا مزہ زائل ہو جائیگا۔ قصیدہ اپنی صنفی شناخت کے اعتبار سے گویا مطلع سے لے کر مقطع تک ہر مرحلے پر تخلیق کار سے مشاقی کا متقاضی ہے۔ قصیدے کی حسن وخوبی کا دارومدار بڑی حد تک انھی چاروں اجزاء کے باہمی ربط پر ہوتا ہے۔ کڑیوں سے کڑیاں ملانا اور تسلسل کے ساتھ مضمون بندی کر کے ایک اکائی کی صورت میں مربوط شکل دینے کے حوالے سید ڈاکٹر اُم ہانی اشرف رقم طراز ہیں:

> ''مختلف اجزائے ترکیبی تشبیب، گریز، مدح، خاتمہ کے باوجود قصیدے کے اشعار آپس میں مربوط اور منسلک ہوتے ہیں۔ کوئی شعر اندرونی طور پر دوسرے شعر لاتعلق نہیں رہتا۔ اس لیے قصیدے کا نشانِ امتیاز اس کی فنکارانہ وحدت ہے۔'' (۱۸)

قصیدے کی خوب صورتی تاج محل کی طرح اس کی فنی پختگی اور اسلوب کی مینا کاری میں پنہاں ہے۔ فصیح وبلیغ اندازِ تکلم، پر شکوہ الفاظ، ترّفع، نادر تشبیہات، جدید لب ولہجہ، ندرت خیال، نئی نئی اصطلاحات زبان کی چاشنی قصیدے کو مرصّع اور پر شکوہ لب ولہجہ عطا کرتی ہے۔ اس کے برعکس ثقیل، رقیق اور عام الفاظ اس پر برا اثر ڈالتے ہیں۔ ڈاکٹر ابو محمد سحؔر لکھتے ہیں:

> ''قصیدے کے لیے ندرت شرط ہے علوِ فکر اور رفعتِ خیال اس کا خاص جوہر ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قصیدہ ثقیل الفاظ، مغلق تراکیب، علمی اصطلاحات اور بعید از فہم خیالات کے مجموعے کا نام ہے۔'' (۱۹)

عیوب قصیدہ

صنفِ قصیدہ اصنافِ فن وادب کے داخلی وخارجی معیارات اور تقاضوں کے باعث ناقدین کی تنقید کا نشانہ ٹھہری ہے کیوں کہ یہ صنف عربی سے فارسی ادب میں داخل ہوئی۔ زمانی ومکانی اثرات اس کا اثاثہ ہیں۔ عربی شعراء کے ہاں اپنی جبلّت اور طبع کے عین مطابق حریّتِ فکر پر مبنی قصائد ملتے ہیں۔ غیرت وحمیت کی پاسداری اور صلہ وستائش سے بے نیاز ہو کر قصیدہ

لکھنا ان کی اخلاقی اور سماجی اجتماعی سوچ کی دلیل ہے۔قصیدہ نگار دروغ گوئی، خوشامد اور للچائی ہوئی طبع سے کوسوں دور فن کی سچائی اور فنی حقیقت کے پروردہ تھے۔عربی شعرا کے ہاں خوشامد کرنا صنفِ قصیدہ کے عیب میں شامل ہے۔

فارسی شعراء نے قصیدے کی ہیئت میں کچھ بنیادی تبدیلیاں بھی کیں یعنی فارسی شعرا نے قوافی کے ساتھ ردیف کا بھی اضافہ کیا اور پھر التزام کے ساتھ اس کا اہتمام بھی کرتے رہے۔یوں قصیدے کے لیے اب قافیہ اور ردیف دونوں لازم وملزوم ٹھہرے جسے کسی نہ کسی طرح قبولیّت کا درجہ حاصل ہوگیا۔تاہم فارسی زبان و ادب کے شعراء کی درباروں اور سرکاروں سے وابستگی ہونے کے باعث قصیدہ جھوٹی تعریفوں، خوشامد، ملمع کاری، دروغ گوئی اور غیر حقیقی کرداروں کی آماج گاہ بن گیا۔سچائی پر مبنی واقعات اور کردار سازی کا پہلو ماند پڑ گیا۔عوام الناس مافوق الفطرت کرداروں اور نظریات کی بھینٹ چڑھ گئے۔قومی اور اجتماعی ملی رویہ راست گوئی کی بجائے مبالغہ آرائی کی طرف مائل ہو گیا۔مبالغہ آمیزی اور رائی کا پہاڑ بنانے کی دوڑ میں شعرا نے پوری استعداد کار صرف کردی۔ فارسی کا یہی طریق اور انداز اردو قصیدے پر غالب آ گیا۔اس طرح ایک تہذیب سے دوسری تہذیب اور ایک طرزِ نگارش سے دوسرے کا اُسلوب متاثر ہوا۔یہی عیب اردو زبان میں بھی ودیعت ہوگیا۔بادشاہوں اور امراء کی جھوٹی ستائش نے اسے علم ومعرفت اور حقیقت پسندی سے دور کر دیا۔ڈاکٹر محمد صادق کی رائے ملاحظہ ہو:

> ''انعام کے لالچ، طمع اور حرص میں مبتلا شعرا نے قصیدے میں گل کاریاں کیں۔بلند و بانگ اور بعید از قیاس موضوعات کو زیب قرطاس لائے۔زورِ بیان، مشکل اُسلوب، بلند تخیّل، نایاب اور غیر معروف تشبیہات واستعارات کا بے دریغ استعمال کیا۔مصنوعی پن اور مُبالغہ آرائی کے تمام ممکنہ جتن کیے اور مافوق الفطرت عناصر کو معیارات قصیدہ کا درجہ دے دیا گیا۔مسابقت کی جنگ میں ایسے ایسے قصائد بھی سامنے آئے جن میں شعراء نے زورِ بیان سے اور قافیہ پیمائی کر کے نئی جہات نکالیں۔ذہنی مشقت اور ریاضت کے

حوالے سے البتہ انھیں قابلِ تحسین قرار دیا جا سکتا ہے مگر اس سب
تگ ودو میں حقیقت پسندی اور ناقدین کی توجہ کا مرکز بنی۔''(۲۰)

اسی روش اور انداز پر تنقید کرتے ہوئے پروفیسر کلیم الدین احمد لکھتے ہیں:

''مدحیہ قصیدے کی غرض وغایت مبالغہ آمیزی سے کسی بادشاہ یا امیر کی تعریف کرنا ہے تا کہ اسے صلہ ملے۔ مذہبی قصیدے مذہبی رنگ میں رنگے ہوں یا بنیادی آلائشوں سے ملوث ہوں، غرض وہ کسی قسم کے کیوں نہ ہوں۔ ان میں تمام آورد ہوتی ہے اور وجہ صاف ہے کہ شاعر قصداً کسی بادشاہ کی تعریف، کسی بزرگ کی مدح پر کمرِ ہمت کستا ہے اور اس تعریف اور مدح میں مبالغہ کے انتہائی مدارج طے کرتا ہے۔''(۲۱)

تنقید کی پہلی معرکتہ الآراء کتاب مقدمہ شعر وشاعری کے مصنف مولانا الطاف حسین حالی کو بھی قصیدے میں عیب نظر آتے ہیں۔ ان میں وہ عشقیہ مضامین شامل ہیں جو شعرا کرام تشبیب میں بڑی چابک دستی اور مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے شاملِ سخن کرتے ہیں یہ اَن نیچرل (Unnatural) شاعری کے ذیل میں آتے ہیں۔ وہ غزل کی صنفِ سخن کی طرح قصیدے کی صنفِ سخن میں بھی اصلاح کے حامی ہیں۔ مولانا الطاف حسین حآلی اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

''اس (قصیدہ) کی بنیاد محض تقلیدی مضامین پر نہیں بل کہ شاعر کے سچے جوش اور ولولے پر ہو تو شعر کی ایک نہایت ضروری صنف ہے جس کے بغیر شاعر کمال کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔''(۲۲)

غزل کا ہر شعر ایک الگ اکائی کا درجہ رکھتا ہے تو قصیدہ کو چار مختلف ارکان کے ارتباط کے موجب غیر فطری صنف بھی قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اگر قصیدہ نگار قصیدے کی صنف کے طے کردہ تقاضوں کے مطابق عمدہ بُنت اور مدلل بیان کرنے میں کامیاب ہو جائے تو یہی ارکان اس کو ارفعیّت اور نگارشاتِ عالیہ کے درجے پر فائز کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سعادت سعید کی رائے ملاحظہ ہو:

''دائرہ المعارف اسلامیہ کے باب قصیدہ میں مقالہ نگار نے قصیدے کو مصنوعی اور غیر فطری صنفِ سخن کہا ہے۔ مصنوعی کو اگر صناعانہ مہارت کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ قصیدے کا عیب نہیں ہنر ہے۔''(۲۳)

قصیدہ نگار کا اپنی تہذیب کا نمائندہ اور قوم وملت کا ذہین سرمایہ ہوتا ہے۔ اس کا مطمحِ نظر نگارشاتِ عالیہ کے علاوہ اجتماعی مذہبی نظریات اور فلسفہ حیاتِ اسلامیہ کا نظریہ عین شریعہ اسلامیہ کی بنیادوں پر اُستوار کرنا ہوتا ہے۔ بحیثیت مسلمان ایک سخن ور کا اپنی وجدانی اور روحانی کیفیّات سے سرشار ہو کر مدحِ ربِ جلیل کی طرف راغب ہونا فطری امر ہے۔ علاوہ ازیں مسلمان اپنی تہذیب وتمدن جو صدیوں پُرانی اور مسلمہ ہے اس پر اپنی فکری بُنیادیں اٹھاتے ہیں۔ حقائق سے عاری اور مبنی بر دروغ قصائد سے معاشرہ اجتماعی گراوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اُردو قصیدہ نگاروں پر خواہ جتنے مرضی اعتراضات کیے جائیں تاہم یہ امر غور طلب ہے کہ شعراء نے لایعنی اور لغویات سے حتّی المقدور اعراض کرنے کی سعی کی ہے۔ تاہم ذم اور ہجویہ قصائد میں دشنام طرازی اور عیب جوئی کے مضامین کو بھی نظم کیا گیا ہے جو مقدار میں بہت کم ہے۔

ادبیاتِ مشرق میں خاص طور پر صنفِ قصیدہ میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر گزرا ہو جس نے بھلائی، احسان، نیکی، خیر خواہی، فلاحِ انسانیت، شکر، اخلاقیات، راست گوئی اور فلسفۂ توحید و رسالت کو موضوعِ سخن نہ بنایا ہو۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر احترامِ انسانیت، روحِ اسلام، پیشہ ورانہ اخلاقیات اور سعادت مندی کے موضوعات کو نظم کیا ہے۔ مدحیہ قصائد خوبیوں کو اُجاگر کرنے کا عمدہ نمونہ ہیں۔ اہلِ بیت اطہار کی شان، فضائل، سخاوت، شجاعت، بہادری اور شہادت کے لکھے گئے قصائد اردو زبان وادب کا حقیقی سرمایہ کا درجہ رکھتے ہیں۔

اگر مدح میں مبالغہ آرائی کی بات کی جائے تو ایسا کرنا محض صلہ کے حصول کے لیے تھا۔ مدح میں غیر معمولی مبالغہ آمیزی سے کام لینے کا واحد اور بڑا سبب ممدوح کی شان میں لفظوں کی مالا میں موتی پرونا ہوتا ہے۔ یہی طرزِ نگارش قصیدے کی اصل شان ہے۔ مدح سرائی کی اصلیّت پر مولانا شبلی نعمانی نے یوں خامہ فرسائی کی ہے:

''قصیدہ کا گویا صحیح استعمال نہیں کیا گیا لیکن یہ خیال غلط ہے کہ قصیدہ گوئی نے خوشامد اور ذات پرستی پیدا کردی، مادح اور ممدوح دونوں جانتے تھے کہ مدح میں جو خیالات ادا کیے جاتے ہیں محض مبالغہ اور لفاظی ہے۔''(۲۴)

اگر کسی ایک دربار سے منسلک شاعر کسی دوسرے دربار یا اس دربار سے منسلک افراد کی نسبت مدح کرتا تو اسے سخت ناپسند کیا جاتا۔ یوں پالا اور وفاداریاں بدلنے والے قصیدہ نگار کو ناراضی اور غضب کا سامنا کرنا پڑتا۔ یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ قصیدہ نگار اپنے فن کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اپنے ممدوح کی مسلسل وفاداری کا پابند بھی خیال کیا جاتا۔ اگرچہ بعض قصیدہ نگاروں نے ایک سے زیادہ ممدوحین کی مدح کی ہے اور وہ کسی بھی غیض وغضب کا شکار نہیں ہوئے۔ اگر قصیدہ نگاری کو محض فنکارانہ آرٹ کے پہلو سے دیکھا جائے تو قصیدے کو اپنی پوری شان وشوکت اور زورِ بیان کی بنیاد پر ممدوح کی مدح کا فرض سرانجام دینا ہوتا ہے نہ کہ اس کی شخصی وفاداری اور پیروکاری کرنی ہوتی ہے۔ تاہم قول وفعل میں تضاد اور بُعد عیوبِ قصیدہ ہی تصور کیے جائیں گے۔ قصیدے کے معائب کے تناظر میں چیدہ چیدہ نکات کا اجمالی خاکہ پیش کرتے ہیں جو قابلِ ستائش اور قابلِ غور ہیں۔

امرا، سلاطین اور مشاہیر کی مدح سرائی میں کوئی حرج نہیں اور نہ ہی یہ عمل زبان وادب کے حوالے سے معیوب سمجھا جاتا ہے۔ البتہ قصیدہ نگاروں کو شعور وفہم اور عدل وانصاف کے تقاضوں کو سراسر نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ لایعنیت، غیر منتج اور خوشامد کی بجائے پر متانت و حقیقت پسندانہ طرزِ نگارش ہی حسنِ نگارش کے درجہ پر فائز ہوگی۔ اپنے ارتقائی منازل کے اعتبار سے اردو قصائد روایتی اور تقلیدی روش کا شکار نظر آتے ہیں۔ مضامین میں کشادگی، معنوی وسعت، گہرائی اور گیرائی ہو نہ کہ غیر مانوس اسلوب اور سنگلاخ زمینیں ہوں۔ ہاں البتہ قصیدے کے نگارشاتِ عالیہ میں پُرشکوہ لب ولہجہ اور جوش وجلال کو کلیدی مقام حاصل ہے۔ قصیدہ خواہ قدیم وجدید اُسلوب کا مرقع ہی کیوں نہ ہو مگر اس میں تفہیم کا عمل مشکل نہیں ہونا چاہیے۔ ابلاغِ علوِ فکر اور تحرک کو قصیدے میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ خواہ بلند آہنگ ترتیب اور مبالغہ

آرائی اپنی انتہاؤں کو چھو رہی ہو پھر بھی ابلاغ سے عاری قصیدہ قاری اور ممدوح کی توجہ کا مرکز بننے سے قاصر رہے گا۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

"قصیدے کا زورِ بیان اور جوش و خروش بڑی حد تک مدح کا رہینِ منت ہے۔ کلام کی ہمواری کے خیال سے یہ خصوصیات قصیدے کے دوسرے اجزا کے لیے بھی ضروری ہو گئیں۔" (۲۵)

مختصر یہ کہ قصیدہ گو شتر گربہ سے شعوری طور پر گریز کرے حدود و قیود اور قواعد و ضوابط کی پاس داری کرے۔ اپنے خیالات کی حدود کا تعین کرے۔ واضح اور قابلِ فہم انداز میں ادبیت اور حُسنِ ادا کا جوہر دکھائے۔ بے سروپا علمی اصطلاحات سے اِعراض کرتے ہوئے موضوع کو فکری و فنی چابک دستی سے ادا کرے۔ یہی عمدہ قصیدہ نگاری کا راز ہے۔ اسی میں ہی اس کی کامیابی کا رازِ پنہاں ہے۔

حمدیہ قصیدے کے خصائص

ہم بحیثیت انسان وہم و گماں اور تخیّلات کے کتنے ہی گھوڑے دوڑائیں ہمارے شعور، فہم، ادراک اور سوچ کی پرواز کی وسعت و اُڑان ایک محدود حد سے نہیں بڑھ سکتی۔ یہی ہماری کم مائیگی ہے۔ خالق و مالک کی قوتوں اور عظمتوں کا بیان کرنا محض اپنے لیے دنیا و آخرت میں بخشش کا بہانہ تلاش کرنا ہے۔ انسان کو غور و فکر کی دعوت تو دی گئی ہے مگر انسان اپنے تدبّر و تفکّر کی اُڑان سے اللہ تعالیٰ کی ہیبت و جلالت کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ حمدیہ قصیدہ لکھتے ہوئے دیوانگی سے آگے بڑھ کر فرزانگی کی نورانی چھڑی (قرآن) کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنانا ہی سر چشمہ علم و عرفان ہے۔

حمدیہ قصیدے کا ایک وصف اپنا مافی الضمیر نہایت عاجزی اور انکساری سے بیان کرنا ہے۔ اگر اس میں شاعر فخر و تعلّی کو برتتا ہے اور نرگسیّت کا شکار ہو جاتا ہے تو اس سے بڑا نادان، نافہم اور گمراہ کوئی نہیں۔ تاہم استادانہ صلاحیتوں کے مالک اور کہنہ مشق شعراء کے ہاں یہ رنگ ادبی چاشنی کا حامل رہا ہے۔ یہ اُنھیں زیب بھی دیتا ہے۔ کیفیّت و کمیّت اور جدّت و روایت کا موثر میلان حمدیہ قصیدے کے خصائص کا وصف ہے۔ قصیدہ اردو شاعری کی وہ

معروف صنفِ سخن ہے جس میں ہر نام ور اور عظیم شاعر نے اپنا زورِ بیان دکھا کر اپنی مہارت کا لوہا منوایا ہے۔ یہ مقبول صنفِ سخن زمانی و مکانی تنوع اور بوقلمونیوں سے مالا مال ہے۔

حمد سرائی رسول ﷺ کی سنت اور کتبِ سماویہ کا پیغام ہے۔ حمدیہ شاعری کا ایک نمایاں وصف اظہار و بیان کا طنطنہ اور موزوں الفاظ کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر رہے جو کلیتاً اسلام اور شعائرِ اسلام کا خزینۂ علم و ادب ہے۔ دانش و بینش رکھنے والے لوگ حمدیہ قصیدہ لکھتے ہوئے اپنی چشمِ بینا سے کام لیتے ہیں۔ نعت گوئی اگر تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے تو قصیدہ گوئی شہ رگ پر رکھی ہوئی برہنہ شمشیر کی مانند ہے۔ اگر قصیدہ نگار نے طے شدہ اور مروج قواعد و ضوابط سے رُوگردانی کی تو اس کے فن کا قتلِ عام ہو جائے گا۔ دو بہتی ہوئی ندیوں کے سنگم سے جو پانی کے بہاؤ میں روانی پیدا ہوتی ہے اسی طرح قصیدے میں روانی اور جولانی کا پایا جانا ضروری اور لازمی امر ہے۔ قصیدے کو جُھرتی ہوئی آبشاروں سے پیدا ہونے والی نغمگی اور موسیقی کے شیریں احساس سے فطری مطابقت ہے۔ قدیم صنفِ سخن ہونے کے باعث اس کی روایت گہری اور کسی معتکف کی طرح یکسوئی کی حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قصیدہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد استاد شعراء ہی کی ہے۔

قصیدے میں شعراء کو اپنی صلاحیتوں کو بھرپور دِکھانے کا موقع ملتا ہے۔ خواہ مبالغہ کو مصنوعی پن سمجھا جائے لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہ اس کی خُوبی ہے۔ اس میں شاعر اپنی علمی موشگافیوں، اختراعات اور کشیدہ تفکرات و نظریات کا بھرپور اظہار کرتا ہے۔ اس میں موسیقی کی اصطلاحات اور علمی مندرجات کو بخوبی کام میں لایا جاتا ہے۔ دیگر اصنافِ سخن کی طرح حمدیہ قصیدے میں تخّیل کی اُڑان پر پابندی اور روک ٹوک نہیں ہے۔ غزل میں سادگی کو کلیدی درجہ حاصل ہے جب کہ قصیدے میں تمثیل پر تمثیل، تشبیہ پر تشبیہ اور نگارشاتِ عالیہ کو انتخاب میں لایا جاتا ہے۔ اس میں تخّیل اوج پر اور اشارے کنایے بڑے اعلیٰ درجے کے ہوتے ہیں، یہی قصیدے کو چار چاند لگاتے ہیں۔

حمدیہ قصیدے میں فلسفہ وحدت الوجود، فلسفہ وحدت الشہود اور فلسفہ واجب الوجود کو نہایت انہماک اور تدبّر و تفکّر سے موضوعِ سخن بنایا جاتا ہے۔ عامیانہ پن اور سطحی اُسلوب سے

مکمل اجتناب کیا جاتا ہے۔دنیاوی محبت وعقیدت کے معیار کا اسلوب مدح ربِ جلیل کے لیے ہرگز موزوں نہیں مثلاً جسے لوگ محبوب کا وصال کہتے ہیں ہم اسے عشق سمجھتے ہیں۔حمدیہ قصیدے کے خصائص میں معدودے چند تو وہ ہیں جو بالعموم کسی بھی ہیئت میں حمد کے لیے لازم وملزوم ہیں جب کہ چند باتیں بالخصوص ایسی بھی ہیں جو درباری قصائد سے بالکل الگ تھلگ اور جدا ہیں کیوں کہ ذاتِ کبریا کے اقتدار کی کُرسی زمین وآسمان سے وسیع تر ہے اور وہ زمین و آسمان کا نُور ہے۔اس لیے اس کے نُور کی تجلیات اور بادشاہت کی حکمرانی تمام جہانوں کو محیط کیے ہوئے ہے۔اس لیے حمدیہ قصیدہ تحریر کرتے وقت تخیّل کی پرواز پر قدغن نہیں لگائی جا سکتی۔یوں تمام رعنائیوں کے ساتھ حمد آئینۂ ادب میں عکس ریز ہو کر ہمارے رُوبہ رُو جلوہ گر ہو جاتا ہے۔علم وفن کی بوقلمونیاں ،قادر الکلامی کی انتہا اور سمندر کو کوزے میں سمونا صرف اسی صنفِ سخن کو زیب دیتا ہے۔سلاست وروانی اور ادبیت اپنی ممکنہ بلندیوں کو صرف قصیدے میں ہی چُھو سکتی ہے۔شاعر اپنی فکری اڑان کو پوری استطاعت کے ساتھ مشاہدے اور اِدراک کے حصول کے لیے آزاد چھوڑ دیتا ہے مگر تدبّر اور شعور کا دامن تھامے رکھتا ہے۔یوں مقامِ لاہُوت سے لے کر تحت الثریٰ تک علوِ فکر کے گوہر چُنتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ دیگر اصنافِ سخن کے مقابلے میں قصیدے میں علمی موضوعات کا بڑا خزینہ پایا جاتا ہے۔محمود الٰہی محاسنِ قصیدہ کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> ’’قصیدے کو ادب میں جو وقیع جگہ ملی ہے وہ اس کے زورِ تخیّل اور زورِ بیان کی بنیاد پر۔وہی قصیدہ اچھا مانا گیا ہے جس میں مضمون آفرینی، زورِ تخیل،شوکتِ الفاظ اور طمطراقِ ترکیب کارفرما ہو۔جس کے ہر مصرعے میں سمندر کا سا جوش وخروش ہو اور ہر شعر میں ہمالہ جیسی گھمبیرتا اور عظمت۔‘‘(۲۶)

اس سلسلے میں الفاظ کا مناسب اور برمحل انتخاب شاعر کی بنیادی ذمہ داریوں میں سے ایک ہے۔حمدیہ قصیدے میں جس طرح مدح کے مضامین ممدوح کے مقام ومرتبے کے اعتبار سے موزوں ہونا ضروری ہیں اسی طرح ہی الفاظ کا چناؤ بھی پاکیزگی اور عمدگی سے رونق

افروز ہونا لازم ہے۔حمدیہ قصیدے کا شعر راست بازی کے ساتھ ساتھ اثر آفرینی سے مالا مال ہو۔حقیقت نگاری کا مرقع ہو۔مبالغہ حدودِ شریعہ کے اندر رہ کر کیا گیا ہو۔مبالغہ معیوب لگنے کی بجائے کلام میں تاثیر کو دوبالا کرنے کا ہنر رکھتا ہو۔اس ضمن میں ڈاکٹر ریاض مجید مولانا محمد یوسف بنوری کی رائے پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مبالغہ اگر حدودشریعہ سے تجاوز نہ کرے تو گنجائش ہے،وہ مبالغہ جو کفروشرک اور صریح جھوٹ پر مشتمل ہو کسی حال میں درست نہیں۔''(۲۷)

اللہ تعالیٰ کی ذاتِ کبریا وہ ہستی ہے جسے متاعِ فخر میسر ہے اور اسے فخر کرنا زیب بھی دیتا ہے۔اس لیے مبالغے کی وہ تمام صُورتیں جائز ہیں جن سے توحید کے تقاضے مجروح نہ ہوں۔انسانی وجدان،ایمان،ایقان،گیان،شعور اور فکر کی مبالغہ آرائی اللہ تعالیٰ کی ذات اور قدرتوں کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔

اس لیے شارحین ومفسرین نے حمدیہ قصیدے میں لفظی شعبدہ گری سے زیادہ حقیقت نگاری کو شرفِ قبولیت بخشا ہے۔بے مہار تخیّل کی بجائے شرعی نزاکتوں کو ملحوظِ خاطر رکھنے پر زور دیا ہے۔شاعر کا سیر حاصل مطالعہ اور علم باعمل ہونا خصائص میں شامل ہے۔حمدیہ قصیدہ نگاری کے لیے قادر الکلامی شرط ہے مگر شانِ اُلوہیّت کے تقاضوں کا اِدراک اور پاس دار ہونا بھی ضروری ہے۔

قصیدے کی اقسام

ساخت اور ہیئت کے اعتبار سے شہنشاہِ اقلیمِ ادب کی دو اقسام ہیں۔قصیدے کا ہیئتی خمیر جن اجزاء سے گوندھا جاتا ہے۔

وہ درج ذیل ہیں:

ا۔تمہیدیہ قصیدہ   ب۔خطابیہ قصیدہ

ا۔تمہیدیہ قصیدہ

قصیدے کی ہیئت اپنے دامن میں تنوع اور نیرنگی خیال کے مثبت زاویہ نگاہ کے

موتیوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔قصیدے میں ہیئت کو کلیدی اور آفاقی درجہ حاصل ہے۔تکوینِ قصیدہ کی سرشت میں ہیئت وہ اکائی ہے جس کے بغیر اس کا امتیازی وصف ختم ہو جانے کے مترادف ہے۔قصیدے کی مخصوص ہیئت ہی اس کی شناخت ہے۔صنف قصیدہ تہذیبی روایات کا امین اور لسانی تنوع کا عکس بردار ہے۔روایتی اور عصری موضوعات کا سنگم اس کا جز ولاینفک ہے۔قوتِ مشاہدہ سے بکھرے ہوئی موتی سمیٹنا اور عمارت گر کی طرح فلک بوس قلعہ تعمیر کرنا قصیدہ نگاری کے لیے لازم ہے۔اردو ادب میں زیادہ تر تمہیدیہ قصائد ہی ملتے ہیں۔اس ضمن میں ڈاکٹر ام ہانی اشرف رقمطراز ہیں:

> ''تمہیدیہ قصائد کو ہی بیانیہ، تشبیبیہ اور غزلیہ بھی کہتے ہیں، اسی طرح اس کے تعمیری ڈھانچے میں چار ارکان شامل ہیں۔ (۱) تشبیب (۲) گریز (۳) مدح یا ذم (۴) دعا'' (۲۸)

درج بالا چار ارکان اپنے اندر فکری بالیدگی اور بوقلمونی رکھنے کے باوجود جذباتی انسلاک سے بھی مملو ہوتے ہیں۔باہمی ارتباط والحاق ایک دوسرے کو اساسی وحدت عطا کرتا ہے۔یہ قصیدے کو پر شکوہ آہنگ عطا کر کے دیگر اصنافِ قصیدہ کی علو بختی کو قابلِ رشک بنا دیتا ہے۔قصیدے کو شہنشاہِ اقلیم ادب کا درجہ اس کے اوصافِ عالیہ، نگارشاتِ عالیہ، شان و شوکت، تبحرِ علمی، استخراجِ علمی، استخراجِ مسائل، استنباطِ حقائق، ضابطہ اخلاق، تہذیب اور مدح کے باعث دیا جاتا ہے۔قصیدے میں قصیدہ نگار پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس کے دامن میں فکر بھی ہو اور وہ قصیدے کی صنفی تشکیل و ہیئت سے بھی آگاہ ہو۔نجم الغنی رام پوری نے اپنے خیالات یوں رقم کیے ہیں:

> ''شاعری کی تکمیل خاص قصیدے کی مشق و مہارت پر موقوف ہے۔جس شاعر نے قصیدے میں کمال بہم نہیں پہنچایا وہ مسلم الثبوت نہیں سمجھا گیا۔'' (۲۹)

اب یہ مغالطہ ختم ہونا چاہیے کہ قصیدے کا تعلق محض بھاری بھرکم الفاظ و تراکیب اور غیر مانوس محاورات کے استعمال سے ہے۔لفاظی کے گورکھ دھندے اور علمیت کے بے جا دعوے سے قاری و سامعین کو متاثر یا مرعوب کرنا مستحسن عمل نہیں ہے۔اگر ایسا ہوتا تو ہر لغت برتنے والا

شاعر الفاظ کے ڈھیر لگا کر خوب صورت اور عالی شان محل تعمیر کر لیتا ہے۔ایسا کرنے سے قصیدہ نگار شیریں کلامی ،ابلاغ اور خوش اسلوبی سے تہی دامن ہو جاتا ہے۔اس لیے مشق و مہارت کے علاوہ موضوع کا باہمی ارتباط مروجہ ہیئت میں ضروری ہے۔ ہر چند یہ کہ زورِ بیان بھی ہو، چاشنی بھی ہو،شکوہ الفاظ بھی ہو،علمیّت بھی ہو، اِدراک بھی ہو،فہم بھی ہو ،فراست بھی ہو،تزئینِ بندش بھی ہو،جدت طرازی بھی ہو،تنوع بھی ہواور علم بیان و بدیع بھی ہومگر پھر بھی قصیدہ اپنے فرضِ منصبی ابلاغ کا حامل ہو۔

گویا قصیدہ استادِفن ہونے کا پیمانہ اور ضمانت ہے۔قصیدے کے چاروں ارکان میں چستی بندش، رفعتِ خیال اور ممدوح کے مقام و مرتبہ کے مطابق شعر کہنا ہی اسے ادبِ عالیہ کے درجے پر فائز کرتا ہے۔

قصیدے کے تمہیدی اُمور کے تناظر میں ممدوح کے لیے مدح کا فرش بچھایا جاتا ہے۔تقریب کا آغاز تعارف ،تربیّت اور تنظیم پر اُستوار کرکے ممدوح کی شان کے لائق گلدستہ معانی کا چراغ روشن کیا جاتا ہے۔سرِ شام ہی لبِ بام قندیلیں قطار اندر قطار روشن کی جاتی ہیں تا کہ دیکھنے والا اس کے سحر میں مستغرق ہو جائے۔تمہیدیہ قصیدے میں ممدوح کے اوصاف کا بیان اس فنی پُرکاری اور عمدگی سے کیا جاتا ہے کہ ممدوح بھی مادح سے محبتِ قلبی کرنے کا اظہار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے یوں تمہیدیہ قصیدہ نہ صرف ممدوح کو ایک ہیرو کے طور پر پیش کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا بلکہ اسے قائدانہ صلاحیتوں اور بلا کا قوتِ فیصلہ کا حامل بنا کر پیش کرتا ہے کہ عوام النّاس میں اس کی مقبولیّت فزوں تر ہو جاتی ہے۔اس طرح مادح ممدوح کے لیے عوامی مقبولیت ہموار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اسے بطور سیاسی ہتھیار کے بھی بروئے کار لایا جاتا رہا ہے۔تمہیدیہ قصائد چاروں ارکانِ قصیدہ پر مشتمل ہوتے ہیں۔تمہیدیہ قصیدہ دراصل مرثیہ کی طرح اپنے ارکان کی وجہ سے ہی شہنشاہِ اقلیمِ ادب کہلاتا ہے۔قصیدے کی وساطت سے ممدوح کی شخصیت تمام تر رعنائیوں ،تابانیوں اور توانائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔تمہیدیہ قصائد میں طربیہ اور نشاطیہ اسلوب کے مضامین جگہ پاتے ہیں۔اس میں شاعرانہ اختراع کا اظہار بدرجہ اُتم ہوتا ہے۔

ب۔خطابیہ قصیدہ

اس نوع کے قصائد میں براہِ راست مدح سے آغاز کیا جاتا ہے۔قصیدہ نگار بلا تمہید ممدوح کی مدح یا ذم کا موضوع رقم کرتا ہے۔اس میں شاعر تشبیب اور گریز کا اہتمام نہیں کرتا۔ شاعر آرائش و زیبائش، بناؤ سنگھار اور نقش و نگار کی بجائے اپنے مدعا کو بیان کرنے پر کمر باندھتا ہے۔خطابیہ قصیدے میں تمہید مفقود ہوتی ہے اور بلا واسطہ مدح کا مضمون زیبِ قرطاس بنایا جاتا ہے۔

قصیدے کی ہیئت

قصیدے کی ظاہری ہیئت اور ساخت و بناوٹ غزل جیسی ہے۔پہلے شعر سے آخری شعر تک ایک ہی بحر میں مضمون بندی کی جاتی ہے۔پہلے شعر کو مطلع کہا جاتا ہے جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔باقی کے سارے اشعار کا دوسرا مصرع مطلع کے ساتھ ہم قافیہ ہوتا ہے۔اگر صرف قافیہ استعمال کیا گیا ہو تو باقی مصرعے ہم قافیہ ہوں گے اور اگر قافیہ کے ساتھ ردیف بھی استعمال کی گئی ہو تو باقی مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوں گے۔ درمیان میں بھی مطلع دیکھنے میں آیا ہے۔بعض قصائد میں دو سے زیادہ مطالع بھی دیکھنے میں آئے ہیں۔مطلعوں کی تعداد دو، تین یا اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے لیکن مطلعے لگاتار نہیں لائے جاتے بلکہ ایک مطلع کے بعد دوسرے تک دیگر اشعار لانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔اس طرح سے مطلعوں کے استعمال سے صنفِ قصیدہ کا امتیازی تشخص مزید پُرکشش، دل کش اور پُرشکوہ ہو جاتا ہے۔ہیئت کے تناظر میں قصیدے کی دو اقسام کے متعلق ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی یوں رقم طراز ہیں:

> ''ایک تمہیدیہ: جس میں قصیدے کے چاروں اجزاء (تشبیب، مدح، گریز، دعا) موجود ہوتے ہیں۔دوسرا مدحیہ: جو تشبیب اور گریز کے بغیر براہِ راست مدح سے شروع ہوتا ہے۔''(۳۰)

غزل کی طرح قصیدے کے آخری شعر کو بھی مقطع کہا جاتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس میں شاعر نے اپنا تخلص لازمی استعمال کیا ہو۔قصیدے کا مطلع اور مقطع اس قدر جاندار اور پُرکشش

ہو کہ قاری وسامع کو اپنے سحر میں جکڑ لے۔یہی قصیدہ نگار کے فن کا کمال اور امتحان بھی ہے۔

ڈاکٹر سعادت سعید قصیدے کے مطلع کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مطلع کے لیے ضروری ہے کہ وہ اتنی مقناطیسی طاقت رکھتا ہو کہ ممدوح ،قاری یا سامع اپنی دیگر تمام تر ذہنی مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر قصیدہ کے اشعار کی جانب متوجہ ہو جائے۔''(۱۳)

قصیدے کا مقطع یا آخری شعر شاعر کے مطمحِ نظر اور فن کی معراج ہے کیونکہ یہی وہ مقام ہے یہاں مادح ممدوح سے صلہ و انعام پاتا ہے۔اس میں شاعر اپنی تمام تر فکری جولانیوں اور ندرتوں کو بروئے کار لاتا ہے اور مزید بہتر کہنا ممکن نہ ہو۔تاکہ شہ پارہ ادب تخلیق ہو سکے۔یہی اس کے فن کی ارفعیّت ہے۔مقطع کے بارے میں ڈاکٹر سعادت سعید کا قول ہے:

''(قصیدے کا) خاتمہ اس قدر محکم ہو کہ اس پر اضافہ ممکن نہ ہو اور یہ بھی کہ اس کے بعد اس سے بہتر کی گنجائش نہ رہے۔''(۳۲)

قصیدے کی ہیئت کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے مگر اس کی روایت کا مطالعہ اس کی ہیئت کے نقوش واضح کرتا نظر آتا ہے۔قصیدے کی ہیئت کا تعین شمیم احمد ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''قصیدے کی صنفی حیثیت کے معاملے میں ایک مخصوص ہیئت پر اصرار غیر ضروری اور نامناسب ہے قصیدہ اپنے موضوعاتی تناظر کے لحاظ سے یوں ہی ایک محدود اور سکڑی ہوئی صنف ہے۔اس کے لیے کسی مخصوص ہیئت پر بے جا اصرار زیادتی کی بات ہے۔''(۳۳)

قصیدے کی ہیئت اگر زمانی ارتقا کے حوالے سے پرکھی جائے تو ہمیں اس کی ہیئت کے مختلف مدارج و مراحل کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔کیوں کہ قصیدے کے احوال و آثار کا مطالعہ ہمیں نتیجہ خیز رائے قائم کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔ادبیاتِ مشرق کے ضمن میں ہمیں قصیدے کی ہیئت کی مخصوص ساخت کا قائل ہونا پڑے گا۔ڈاکٹر سعادت سعید کا منطقی انداز اور پُر مغز اقتباس ملاحظہ ہوں:

''قصیدہ میں ہیئت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔مسدس، مخمس،

ترکیب بند، ترجیع بند، مثنوی یا کسی اور غیر غزلیہ ہیئت میں لکھی گئی
نظموں مدحیہ نظمیں تو کہا جائیگا ،صنفِ قصیدہ کی حدود میں انھیں
شامل نہیں کیا جا سکتا۔قصیدہ کے پہلے شعر کے دونوں مصرعوں کا اور
بقیہ اشعار کے دوسرے مصرعوں کا ہم قافیہ وہم ردیف ہونا ضروری
ہے۔'' (۳۴)

قصیدہ بنیادی طور پر ہیئت ہے۔اس میں موضوع کی قید نہیں ہے۔اس کے مدح میں حمد،نعت، منقبت، ہجواور معاشرتی موضوع آ سکتے ہیں۔اسی طرح تشبیب کے موضوعات میں فلسفہ، اخلاق، بہار، عشقیہ مضامین اور سراپا نگاری اور بے شمار چیزیں آسکتی ہیں۔ان میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہے۔مدح اور تشبیب کے الگ الگ موضوعات ہیں تاہم ان میں ہیئت مشترک ہے۔دورانِ مطالعہ یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ اردو قصیدہ روایتی اور تقلیدی ہے۔اردو قصائد کا تفصیلی مطالعہ عربی اور فارسی ہیئت کا مقلد نظر آتا ہے۔تاہم ارتقائی منازل میں ارتباط نے ایک نئے مرقع ادب کو ترویج دیا ہے۔یوں قصیدہ اپنی مخصوص ہیئت کا متقاضی ہے۔

قرینِ انصاف یہی ہے کہ شمیم احمد کے نقطہ نظر کی تائید نہیں کی جاسکتی۔کیوں کہ قصیدے سے اس کی ہیئت ہی چھِن جائے (جو کہ اس کی پہچان ہے) تو پھر پیچھے کیا بچے گا؟اسی طرح مرثیے اور ڈرامے سے اگر اُس کی ہیئت (ارکان) نکال دیئے جائیں تو وہ اپنی پہچان کھو دیں گے۔اس مادی دنیا میں ہر شے اپنی مخصوص شکل، ہیئت اور کمیت ہی سے اپنی پہچان رکھتی ہے۔

قصیدے کی مخصوص ہیئت ہی اس کی شناخت اور پہچان ہے نہ کہ مخمس، مسدس وغیرہ۔شمیم احمد دیگر ہیئتوں پر مشتمل کلام مدح کو مدحیہ کلام یا مدحیہ نظم کا نام تو دے سکتے ہیں لیکن قصیدے کی ہیئت نہیں بدلی جاسکتی کیوں کہ وہ قصیدے کی امتیازی ہیئت کو ملحوظ خاطر رکھنے کے حوالے سے لیت ولعل سے کام لیتے نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر سعادت سعید کے مطابق قصیدہ چار اجزاء (تشبیب، گریز، مدح، دعا) پر بھی

مشتمل ہوتا ہے۔قصیدہ اِنھی چاروں اجزا کی بنا پر شہنشاہِ اقلیمِ ادب کے مقام پر فائز ہوا ہے اور اسی سے قصیدہ کی جولانیوں اور تابانیوں کو کمال حاصل ہوا ہے۔ان کے مطابق قصیدہ دو اجزا پر بھی مشتمل ہوسکتا ہے۔تاہم بعض قصائد ایک جزو مدح پر ہی مشتمل ہوتے ہیں جو کہ بعض صورتوں میں زورِ بیان کی بنیاد پر کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔مدحیہ قصیدے کی ہیئت کے متعلق ڈاکٹر سعادت سعید کا خیال ہے کہ:

''مدحیہ مضامین پر مشتمل قصائد کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ایسے قصائد کے لیے ضروری ہے کہ ان کی ہیئت قصیدے کی ہو۔''(۳۵)

خود بخود تو گھاس پھوس، جنگلی حیات اور نباتات وغیرہ اُگتے ہیں ان ناکاشتہ اور خود رویدہ کا کوئی باغبان نہیں ہوتا جب کہ باغات تو انسان خود اگاتے ہیں، سمجھنے کے لیے یہ فرق ہی کافی ہے۔

حمد اور حمدیہ قصیدے میں فرق صرف ہیئت ہی کی وجہ سے ہے جب کہ دونوں میں مدحِ ربِ جلیل ہی موضوعِ سخن ہوتا ہے۔اسی طرح سے درود، سلام، نعت اور نعتیہ قصیدہ میں فرق ہیئت کے اعتبار سے ہے وگرنہ ان تمام کا مطمحِ نظر آنحضرت ﷺ کی تعریف وتوصیف بیان کرنا ہی ہے۔

قصیدے کے لیے ترفع، ارتباط وانبساط، مضمون بندی، جوشِ بیان، نگارشاتِ عالیہ پُرشکوہ لب ولہجہ اور خیالات کا تسلسل ضروری ہے اور یہ سب قصیدے کے مخصوص قافیائی نظام اور ہیئت کے نظام کے تحت ہی ممکن ہوسکتا ہے۔شاید یہی سبب ہے کہ شمیم احمد کا درج بالا مؤقف اہلِ دانش وبینش کی توجہ کا مرکز نہ بن سکا۔ادبی اجتہاد کے دوران اور قصیدے کی فطرت کی جانچ وپرکھ نے یہ جہت متعیّن ہوئی ہے کہ اسے ہیئت کا جامہ پہنا کر ہی امتیازی وصف سے متصف کیا جا سکتا ہے۔قصیدے کی ہیئت کے حوالے سے حفیظ صدیقی یوں رقم طراز ہیں:

''(قصیدہ میں) مدح وہجو، رزم وبزم، عرفان واخلاق سبھی کچھ بیان ہوتا رہا ہے لیکن قصیدہ اردو میں براہِ راست عربی سے نہیں بلکہ فارسی

کے توسط سے آیا ہے اور اردو کے قصیدہ گو شعرا نے قصیدہ نگاری میں بالعموم فارسی شعرا ہی کی تقلید کی ہے اور اردو شاعری کے آغاز کے وقت فارسی قصیدہ بڑی حد تک مدح کی تنگنائے میں محصور ہو چکا تھا، فارسی نمونوں کی تقلید کا نتیجہ یہ ہوا کہ قصیدے کو ایک سرکاری درباری صنف سمجھ لیا گیا۔ اس طرح قصیدہ اور مدح لازم وملزوم ہو گئے اور جب درباروں اور درباری ماحول کا خاتمہ ہوا تو قصیدے کو بھی ایک متروک اور مردود صنف سخن قرار دیا گیا۔''(۳۶)

قصیدہ کی ہیئت کے ضمن میں ''تمہیدیہ اور خطابیہ'' میں درجہ بندی کی گئی ہے۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر نے مضامین کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے قصیدہ کی چار قسمیں، ''مدحیہ، ہجویہ، وعظیہ اور بیانیہ'' کا ذکر کیا ہے۔ ہجو میں خواہ مدح کا مضمون قلمبند نہیں کیا جاتا پھر بھی انھوں نے ہجو(ذم) کو قصیدے میں ہی گردانا ہے لیکن اس ضمن میں شرط یہ رکھی ہے کہ وہ قصیدے کی مروجہ ہیئت میں ہو۔ ہجو کے صنف قصیدہ میں شامل کیے جانے کا واحد سبب مدح کے متضاد مضمون بندی اور یکساں ہیئت کا ہے۔ مزید برآں انھوں نے تشبیب کے مضامین کے اعتبار سے بھی قصیدے کی چار قسمیں ہی اپنی تحریر میں شامل کی ہیں۔ جن میں بہاریہ، حالیہ، فخریہ اور دعائیہ قصائد میں شامل ہیں۔(۳۷)

قصیدے کی اقسام کے حوالے سے ڈاکٹر صابر کلوروی اس طرح رقم طراز ہیں:

''۱۔ تمہیدیہ: ممدوح کے اوصاف کا بیان، قصیدے کے تمام اجزائے ترکیب کے ساتھ

۲۔ خطابیہ: ممدوح کی تعریف براہِ راست (تشبیب اور گریز کے بغیر)

۳۔ مدحیہ: صرف مدح کی گئی ہو

۴۔ ہجویہ: صرف برائی کی گئی ہو

۵۔ وعظیہ: پند ونصائح پر مبنی قصیدہ

۶۔ بیانیہ: رنگا رنگ موضوعات پر مبنی قصیدہ

۷۔ عشقیہ: جس قصیدے کی تشبیب عشق و عاشقی کے مضامین پر مشتمل ہو۔

۸۔ حالیہ: جس قصیدے کی تشبیب میں شاعر نے ذاتی حالات یا زمانے کی شکایت بیان کی ہو۔

۹۔ فخریہ: تشبیب میں اپنی سخن وری اور فنی مہارت کا اظہار کیا ہو۔'' (۳۸)

قصیدہ اپنی جامعیّت ، وسعت ،نوعیّت ، اہمیّت ، افادیّت ، اور ہیئت کے اعتبار سے ادب عالیہ کا درجہ رکھتا ہے۔ قصیدے کی صنف کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہ انفرادی سے اجتماعی، دینی سے دُنیاوی اور دیگر متعلقاتِ زندگی کے مضامین کو اپنے اندر سمو سکتا ہے۔ اس لیے درج بالا اقسام کے علاوہ بھی اقسام کا ذکر لازمی ہے۔ شمیم احمد یوں رقمطراز ہیں:

''شمیم احمد نے ایک اور قسم '' بہاریہ (اگر کسی قصیدے کی تشبیب کا موضوع بہار کے مضامین پر مبنی ہو) بھی بیان کی ہے۔'' (۳۹)

شمیم احمد ان کو قصیدے کی قسمیں تسلیم کرنے کی بجائے انھیں تشبیب کے مضامین قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک تمام قصیدوں کا موضوع تو مدح کرنا ہوتا ہے تاہم تشبیب میں ہمہ جہت اقسامِ قصیدہ میں سے کوئی بھی موضوعِ سخن کا حصہ بنایا جاسکتا ہے۔ شمیم احمد لکھتے ہیں:

''یہ تمام موضوعات دراصل قصیدے از خود قصیدے کی نہیں، اس نوع کے قصیدے کا ایک ہی موضوع ہے اور وہ ہے مدح۔ یہ سارے موضوعات دراصل قصیدے کے ایک ابتدائی جزو تشبیب کے ہیں۔ لہٰذا یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ ایک جزو کی کثیر الموضوع حیثیت کے سبب قصیدے کی پوری صنف کو کیوں کر موضوعات کے لحاظ سے تقسیم کیا جاسکتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مدحیہ قصیدے کی تشبیب نوع بہ نوع موضوعات پر مبنی ہوتی ہے۔'' (۴۰)

قصیدے کی جن اقسام کا ذکر کیا جا چکا ہے ان کی تقسیم اور درجہ بندی تشبیب کی موضوعات کی بنیاد پر مکمل قرار نہیں دے سکتے کیوں بدلتے ہوئے حالات و واقعات اور نظریاتی

وجغرافیائی تغیّر وتبدّل نے قصیدے کو موضوعاتی طور پر ضرور متاثر کیا ہے۔

قصیدے کا بنیادی اور کلیدی جزو مدح ہے، اس لیے مدح اور تعریف و توصیف کا موضوع یہی قصیدے کا سرنامہ وعنوان ہونا چاہیے۔اسی کو بنیاد بنا کر قصیدے کی قسم کا تعین و تکوین ہونا چاہیے۔

موضوع کے اعتبار سے قصیدے کی مزید قسمیں بھی مشاہدے میں آئی ہیں۔

۱۔ حمدیہ: جس قصیدے میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا ذکر ہو۔

۲۔نعتیہ: جو قصیدے آں حضرت ﷺ کی ذات وصفات کے مضامین پر مشتمل ہوں۔

۳۔دعائیہ: جس قصیدے میں دعائیہ کلمات اور نیک تمناؤں کا ذکر ہو۔

۴۔منقبتیہ : اس قصیدے میں خلفائے راشدین ،اولیاء کرام اور بزرگانِ دین کی تعریف و توصیف بیان کی جاتی ہے۔

۵۔منظریہ: وہ قصیدے جن میں شاعر اپنے ماحول اوراس سے پیدا ہونے والی کیفیات کی بندی کو زیبِ داستان لاتا ہے۔

۶۔وصفیہ: جس قصیدے میں اشیاء کی خوبیوں اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے اوصاف بیان کیے جائیں۔

۷۔عرفانی: وہ قصیدے جن میں علم وعرفان کے مدارج اور عروجِ آدمِ خاکی کا بیان ہو۔

۸۔فکری: اس قصیدے میں انفرادی و اجتماعی معاملاتِ زندگی کو فکری بالیدگی دے کر نکھارا جاتا ہے۔

۹۔صوفیانہ: تصوف اور طرزِ تصوف، رائے ہائے سربستہ اس کا موضوع ہوتا ہے۔

۱۰۔شہرآشوبیہ: جس قصیدے میں شہر کے اُجڑنے اور معاشرتی بدحالی کا فنّی مہارت سے ذکر کیا گیا ہو۔

۱۱۔رثائیہ: جس قصیدے میں کسی کی موت پر تعزیتی تقریر کا موضوع قلم بند کیا گیا ہو۔

۱۲۔جنگی : وہ قصیدے جن میں جنگی سازو سامان ، طریقہ جنگ اور جنگی حکمتِ عملی کے موضوعات کو بیاان کیا گیا ہو۔

۱۳۔رجزیہ:اس میں جنگجو اپنے نسلی تفاخر اور مہارتوں کا قصیدہ پڑھتا ہے۔
۱۴۔حماسے:جس قصیدے میں رزمیہ مضامین کو قلم بند کیا گیا ہو۔
۱۵۔بہاریہ:جس قصیدے میں موسمِ بہار،امن اور خوشحالی کے موضوعات کو بیان کیا جائے۔

درج بالا بحث کا حاصلِ کلام یہ ہے کہ قصیدے میں موضوع کی کوئی پابندی نہیں ہے کیوں کہ شاعری کی طرح قصیدے کا مرکزی اور کلیدی موضوع زندگی ہے۔جس طرح زندگی نشیب وفراز کا نام ہے اسی طرح زندگی اپنے اندر موضوعات کی بوقلمونی رکھتی ہے یُوں زندگی کی جتنی جہات ہیں اتنی ہی قصیدے میں موضوع بحث بنتی ہیں۔قصیدے کی اتنی ہی اقسام ادبی منظرنامے پر جلوہ افروز ہوں گی جتنی صورتوں اور پہلوؤں سے خود زندگی کو واسطہ پڑے گا۔ اس بدلتے ہوئے زمانی ومکانی رجحانات کے زیرِ اثر قصیدہ بھی مسلسل ارتقائی عمل سے گزر رہا ہے۔اس کے زیرِ اثر قصیدہ کی اقسام ہزاروں تک پہنچ سکتی ہیں مگر دورِ حاضر کا منظرنامہ صنفِ قصیدہ کے لیے زیادہ موزوں نہیں ہے۔ اصنافِ ادب میں صنفِ داستان کے زوال پذیر ہونے کی وجہ بھی اس کی طوالت تھی۔شاید قصیدہ عام قاری کے فہم سے بلند تر اور فلسفیانہ صنفِ سخن ہونے کے باعث ہی غیر مقبول ہورہا ہے۔ہمیں اس کے بقا کے لیے ٹھوس اقدامات اُٹھانا ہوں گے۔تاکہ مدحِ ربِّ جلیل کے نئے نئے گوشے ہماری فکری،نظریاتی،مذہبی اعتقادی اور دینی پہلوؤں سے آبیاری کرسکیں۔

قصیدے کے ارکان

یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ کوئی بھی عمارت ستونوں کے بغیر تشکیل نہیں پاسکتی۔یہ بھی حقیقت ہے کہ ستون اگر پُرکشش،خوب صورت، دل کش اور فنِ تعمیر کا شاہکار ہوں تو عمارت دیدنی ہوجاتی ہے۔یہی حال صنفِ قصیدہ کا ہے۔اس کے چاروں ارکان اسے دیدہ زیب بھی بناتے ہیں اور شہنشاہِ اقلیمِ ادب کے درجے پر فائز بھی کرتے ہیں۔قصیدہ اپنی اس شان وشوکت اور عظمتِ خیال کے باعث قدیم ادوار سے ہی ذخیرہ علمی کا وسیلہ رہا ہے۔صنفِ قصیدہ دستیاب دستاویزات کے مطابق دورِ جاہلیہ سے لے کر عہدِ جدید کے انتہاؤں تک پھیلا ہُوا ہے۔بعض قصائد دو اجزاء پر مشتمل ہوتے ہیں جنہیں خطابیہ قصائد کہا جاتا ہے۔ان میں

تشبیب اور گریز شامل نہیں ہوتے ، جبکہ وہ قصائد جن میں تشبیب ، گریز ، مدح اور دعا وغیرہ کے اجزا شامل ہوں انھیں تمہیدیہ قصائد کہا جاتا ہے۔تمہیدیہ قصیدے ہی فنِ قصیدہ کو ہم دوش ثریّا کرتے ہیں۔

بعض مدحیہ مضامین پر مشتمل قصائد بھی ہوتے ہیں انھیں بھی قصیدے میں شامل کیا جاتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ان کی ہیئت قصیدے کی صنف کے مطابق ہو۔قصیدے کے اجزا میں درج ذیل ارکان شامل ہیں ان کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

تشبیب

اردو قصیدے میں وہی ارکان شامل ہیں جو عربی اور فارسی قصیدے کا لازمی جزو تھے۔تشبیب کو قصیدے کی روح کا درجہ حاصل ہے۔یہ قصیدے کا پہلا رُکن ہے جو تمہیدی مضمون کا حامل ہوتا ہے۔ اسے نسیب بھی کہتے ہیں۔عشقیہ مضامین کو تشبیب سے خاص مناسبت ہے کیوں کہ اس میں شباب اور جوانی کا ذکر ہوتا ہے۔اس میں معاملاتِ عشق ، ناز اداؤں اور صفات کا ذکر ہونا فطری امر ہے۔عرب قصیدہ گو جب قصیدے کا آغاز کرتے تو محبوب کے شباب، حسن ،نوخیزی ، جوبن، عُنفوانِ شباب اور جمالِ یار کا مضمون باندھتے تھے۔ وہ ایسا صرف اس لیے کرتے تھے تاکہ قاری وسامع کی بھرپور توجہ حاصل کی جاسکے اور یہی شعراء عرب کا مطمحِ نظر ہوتا تھا۔لیکن جغرافیائی وسعت پا جانے کے بعد فارسی زبان وادب اور پھر اردو تک کے سفر کے دوران میں قصیدے کا دامن مزید وسیع ہوگیا۔اب تشبیب محض اُٹھتی جوانی کے مزے دار تذکرے ہی تک محدود نہ رہی بلکہ اس کے موضوعات کی وسعت ہمہ گیر اور ہمہ جہت صورت اختیار کرگئی۔اس ضمن میں شمیم احمد یُوں لکھتے ہیں:

> ''ہر قسم کے مضامین تشبیب کے طور پر قلم بند کیے جانے لگے مثلاً دنیا کی بے ثباتی ،علوم وفنون کی بے قدری ، پند ونصائح ، شاعری کی تعریف، تاریخی واقعات، حکمت ونجوم، منطق وفلسفہ، ہیئت، موسیقی ،تصوف واخلاق ،موسم بہار، رندی وسرمستی کی کیفیات ،زمانے شکایت،خوشی وامید کے پیکر وغیرہ۔'' (۴۱)

عموماً تمہیدی اشعار جن میں بلا کی جوانی کا تذکرہ، محبوب کے لہو ولعب اور غزلیہ انداز وادا ہو تشبیب کہلاتا ہے۔ڈاکٹر ابو محمد سحرؔ تشبیب کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں:

''تشبیب سے مراد وہ اشعار لیے جاتے ہیں جو قصیدے کی ابتدا میں تمہید کے طور پر لکھے جاتے ہیں۔عربی شعرا اس میں عموماً عشقیہ اشعار قلمبند کرتے تھے۔اسی رعایت سے اس کو تشبیب یا نسیب کے نام سے موسوم کیا گیا۔فارسی اور اردو میں تشبیب عشقیہ مضامین کی تخصیص نہیں رہی۔'' (۴۲)

صنفِ قصیدہ کے گلشن میں رنگا رنگ بہار کا سماں اس وقت بندھتا ہے جب اس چمن میں چار سُو پھول اور اُن کی بھینی بھینی خوشبو، پرندوں کی چہکار اور نشاط وطرب کا ماحول ہو۔شباب اور متعلقاتِ شباب اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موجود ہو اور مزید یہ کہ شاعر کی تخیّلاتی دنیا اپنے تمام تر گل کاریوں کے ساتھ قوسِ قزح کے رنگ بکھیر رہی ہو۔شاعر جزئیات نگاری سے کام لے کر ایسی نزاکتوں اور موشگافیوں کو زینتِ قرطاس بنائے کہ لفظوں کے ربط کی سحر کاری اپنے کرشمے دکھائے۔شمیم احمد تشبیب کی درج ذیل خوبیوں کا ذکر کرتے ہیں:

''تشبیب کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ اس میں بیان کردہ مضامین، ممدوح کے منصب کے نہ صرف مطابق ہوں بلکہ بعد میں آنے والے مدحیہ اشعار سے معنوی ربط ومناسبت رکھتے ہوں۔'' (۴۳)

تشبیب کا موضوع اب وسیع تناظر میں فکری اُڑان بھرنے لگا ہے۔بدلتے ہوئے حالات وواقعات نے ادیبوں کی سوچ کے دھارے موڑ دیئے ہیں مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ قصیدہ میں تشبیب کا موضوع اپنی سابقہ روایت سے مکمل طور پر رُوگردانی کر کے کوئی نئی جہت اختیار کر چکا ہے۔محض اس ضمن میں فکری تنوّع کو پذیرائی ملی ہے۔تشبیب کے موضوع کا چُناؤ شاعر اپنی میلانِ طبع کے مطابق کرتا ہے۔نجم الغنی رام پوری یوں رقمطراز ہیں:

''شاعروں کے نزدیک تشبیب اور نسیب ان ابیات کا نام ہے جو قصیدے میں تمہید کے طور مدح یا ہجو کے پہلے لکھتے ہیں۔شاید پہلے یہ عادت ہو کہ ان شعروں میں مضمونِ عشقیہ ہی لکھتے ہوں لیکن اب

اس کی قید نہیں۔‘‘(۴۴)

نسیب کے حوالے سے یہ پہلو ملحوظِ خاطر رکھا جانا چاہیے کہ یہ قصیدے کا ایک ضمنی جزو ہے۔لہٰذا اس کے اشعار کی تعداد قصیدے کے اصل ’’مدحیہ اشعار‘‘ سے زیادہ نہ ہو، وگرنہ قصیدہ اپنے تناسب کی رعنائی، حُسن اور بانکپن کھو دے گا۔ رعنائی و زیبائی و محبوبی اور شوخیِ پیکرِ تصویر ارکانِ قصیدہ کے توازن میں پنہاں ہیں۔تشبیب اور نسیب میں موضوعاتی اعتبار سے فرق پایا جاتا ہے۔نسیب جذبات عشق محبت اور تشبیب حقیقی معاملاتِ التفات کا نام ہے جو شعراء پر اثرات مرتب کرے۔ڈاکٹر سعادت سعید اس پہلو پر یوں بات کرتے ہیں:

> ’’تشبیب میں غزلیہ تجربات کوائف کا اظہار نسیب ہے اور دیگر مناظر و امور کا تذکرہ تشبیب رمز و ایماء، خلوصِ اظہار، حقیقی یاد اور عشقیہ کیفیات کے آمیزے سے تیار ہونے والی تمہید نسیبی تمہید ہے اور رسمی عشق، روایتی خیالات اور تخیلی ناز و نیاز کے معاملات کے حوالے سے لکھی جانے والی تمہید نسیبی تمہید ہے۔‘‘(۴۵)

تشبیب کا پہلا شعر بلند پایہ، جدّت آمیز اور سحر انگیز ہو۔تشبیب کی غزل عام غزل سے موضوعاتی اعتبار سے مختلف ہو مگر تشبیب کی غزل صنفِ قصیدہ کی طرح پُر زور اور بلیغ ہو۔ تشبیب کا موضوع ضمنی نوعیّت کا ہو نہ کہ قصیدے کے اصل موضوع مدح طرازی کی طرز اختیار کرلے۔تشبیب تمہیدی نوعیّت سے تجاوز نہ کرے ورنہ مدح پیوندِ خاک ہو جائے گی اور مزاج پر گراں گزرے گی۔ مادح سامع پر سحر طاری کرنے کے لیے نادرکاری اور قادرالکلامی کے جوہر کو تشبیب کی زینت بناتا ہے۔گل و گلزار سی بہار، سیل رواں سی روانی و گھن گرج اور بادِ صبا جیسی حلاوت و مٹھاس نے تشبیب کو قصیدے کا لازمی جز بنا دیا ہے۔فکر و فلسفہ، علومِ سماویہ کی شرح و توضیح، صوفیانہ خیال انگیزیاں، عہدِ کُہن سے دورِ جدید تک کے عملیاتی موضوعات اس میں سموئے جاتے ہیں۔

تشبیب قصیدے کو سر برآوردہ مقام عطا کرتی ہے بغیر تشبیب کے قصائد نگارشاتِ عالیہ کے درجے پر فائز نہیں کیے جا سکتے۔تشبیب جس قدر سجیلی اور نوتراشیدہ ہوگی اُسی قدر اس کی چاشنی اور قدر و منزلت اہمیّت اختیار کرتی جائے گی۔

اُم ہانی اشرف قصیدے کے تمہیدی اور کلیدی رُکن ''تشبیب'' کے لیے درج ذیل لازمی شرائط بیان کرتی ہیں۔

(۱) تشبیب کونشاط انگیز ہونا چاہیے کیونکہ اس کا مقصد ممدوح کے ذہن کو مدح یا ہجو سننے کے لیے ہموار کرنا ہے۔

(۲) اس کے اشعار مدح یا ہجو سے کم ہوں ورنہ اصل مقصد فوت ہو جانے کا خطرہ رہتا ہے۔

(۳) تشبیب کے اشعار کو ممدوح کے مرتبے اور حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے۔

(۴) تشبیب میں بعض اوقات جو غزل شامل کی جاتی ہے اس کو بھی قصیدے سے ہم آہنگ ہونا چاہیے تشبیب کے اشعار مدح کے اشعار مدح کے اشعار سے زیادہ نہ ہوں۔(۴۶)

گریز

قصائد میں تمہید کے بعد اصل مضمون (مدح) کی طرف جانے سے قبل جب تشبیب اور مدح کو باہمی طور پر ملایا جاتا ہے تو اس باہمی ارتباط کے عمل کو فکری چابک دستی سے انجام دینے والا فن پارہ ہی دراصل گریز ہے۔ گریز تشبیب اور مدح کے درمیان میں پُل کا کام کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری و سامع بلا تعطّل خوش طبعی سے اس سنگم کو قبول کرتے ہیں اور یہ ان کی طبع نازک پر ناگوار بھی نہیں گزرتا۔ مولوی سید احمد دہلوی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''قصائد میں اشعار حالیہ و بہاریہ وغیرہ کے بیان کرتے کرتے ایک دفعہ ہی حرف فاصل کے لائے بغیر ممدوح کی مدح پر جھک پڑنا یعنی ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف دوڑ جانا۔''(۴۷)

تشبیب کے بعد قصیدہ نگار کسی قرینے اور ڈھنگ سے ممدوح کے مدح شروع کر دیتا ہے۔ اس کو گریز کہا جاتا ہے۔ محمود الٰہی نے ابنِ رشیق کا یہ قول نقل کیا ہے:

''نسیب سے مدح یا دوسرے موضوع کی طرف بہترین حیلے سے نکل جاؤ۔''(۴۸)

گریز کے لیے طویل اشعار کے ضرورت نہیں۔اس کے لیے ایک یا ایک سے زائد اشعار بھی بروئے کار لائے جاسکتے ہیں۔گریز بہ طور خاص مرکزِ نگاہ ہو۔ یہ ایک ایسی کڑی ہو جو بہت سی دوسری کڑیوں کو ملانے کے بعد ان میں مدغم ہو جائے۔ یہی انضمام وانسلاک اس کا خاصہ ہے۔اتصال سے قصیدے کی بُنت میں خوش گوار تاثر پیدا ہوتا ہے۔اس پہلو کو اُم ہانی اشرف یوُں بیان کرتی ہیں:

> ’’عربی تنقید میں اس ہنر کو دوسرکش بیلوں کو ایک جوئے میں جوتنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔جس کا سبب یہ ہو کہ مذکورہ حصہ تشبیب اور مدح کے بے ربط اجزا میں ربط پیدا کرتا ہے۔گریز کا سب سے بڑا حسن یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تشبیب کہتے ہیں۔شاعر مدح کی طرف اس طرح گھوم جائے جیسے بات میں بات پیدا ہوگئی ہو۔گریز کی یہی وہ خوبی ہے جس کی وجہ سے وہ قصیدے کا مہتم بالشان حصّہ اور شاعر کے کمال کا معیار سمجھا جاتا ہے۔‘‘(۴۹)

گریز قصیدے کا مشکل مرحلہ ہے۔شاعر کڑی آزمائش سے گزر کر مطابقت پیدا کرتا ہے۔گریز قصیدہ کی جان ہے۔

مدح

قصیدے کا تیسرا اہم رکن مدح یا ذم ہے اگر تعریف وتوصیف پر مبنی ہو تو مدح اور اگر ملامت، سرزنش، مذمت اور ہجو پر مبنی ہو تو اسے ذم کہا جاتا ہے۔ مدح میں شاعر حضرات اپنے ممدوح کی تعریف وتوصیف خوب مبالغہ آرائی سے کرتے ہیں۔اسی خوبی کو مدِنظر رکھتے ہوئے زورِ بیان کی بناء پر مدح سرائی کی جاتی ہے۔

پُراثر مدح سن کر ممدوح ستائش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مدح میں شخصی خصائص،شمائل و کردار، نفاستِ طبع، جاہ وجلال، خاندانی اصالت، مہر ومحبت، جود وسخا، حریّت، حمیت، پیشہ ورانہ اخلاقیات، شجاعت وبہادری، جدوجہد، تزکیہ نفس، علم ومعرفت، کشف وکرامات، فقہ و اجتہاد اور دیگر انفرادی واجتماعی خوبیوں کو بیان کرتا ہے۔

جنگجوؤں کی جنگی مہارتوں ،صوفیوں کے صوفیانہ افکار، صالحین کی کرامات ، مذہبی ہستیوں کے مزارات اور اسلامی عمارات کے تقدس کو بھی تعریف وتو صیف کے ذریعے خراجِ تحسین پیش کیا جاتا ہے۔

یہ میدان شاعر کی مبالغہ آرائی اور فکری جولانیوں کے جوہر دکھانے کا ہے۔تخیّلات کا اختراع اس قدر محنت سے کیا جاتا ہے کہ زمین وآسمان کے قلابے ملا دیئے جاتے ہیں۔شمیم احمد اس ضمن میں اپنے خیالات یوں قلم بند کرتے ہیں:

'' قصیدے کا یہ وہ حصہ ہے جہاں شاعر کی قوتِ اظہار اور تخیل آفرینی کے تمام تر جوہر ایک ایک کر کے کھلتے جاتے ہیں۔۔۔نہ صرف یہ کہ اس حصے میں ممدوح کی ذات ہی موضوعِ اظہار ہوتی ہے بلکہ اس کے جملہ متعلقات مثلاً سازو سامان ، سپاہ ، ہاتھی ، گھوڑے اور تلوار وغیرہ کو بھی موضوع بنایا جاتا ہے اور ان سب چیزوں کی تعریف میں بھی وہی زورِ بیان صرف کیا جاتا ہے، جو ممدوح کی ذات وصفات کے بیان میں کیا جاتا ہے۔''(۵۰)

مدح کرتے ہوئے انھی صفات کو بیان کیا جانا چاہیے جن صفات سے ممدوح متصف ہو۔ یہ طریق کار قرینِ انصاف،مؤثر اور راست گوئی کا علمبردار ہے یوں ممدوح کی مدح بھی ہو جاتی ہے اور ابلاغِ حق وصداقت بھی بطریقِ احسن انجام پا جاتا ہے۔مگر مدحِ ربِّ جلیل کے لیے شاعر جتنی فکری اڑان بھر سکتا ہو بھرے۔سید عابد علی عابد مدح کے حوالے سے یُوں رقمطراز ہیں:

''مذہبی قصائد کے حوالے سے تو مدح میں مبالغے ،غلو اور اغراق کی انتہائی صورتوں کو ہمارے نقادوں نے شرفِ قبولیت بخشا ہے۔تاہم وہ بھی کہتے ہیں اگر ممدوح برائے نام بادشاہ ہو اور حقیقی قدرت و اختیار نہ رکھتا ہو تو مدح کا ناجائز اغراق میں تبدیل ہو جانا لازمی ہے۔ایسے موقعوں پر نکتہ سنج شاعر غالب کی طرح تشبیب کی دل پذیری کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔''(۵۱)

مدح میں قصیدہ گو جگر سوزی کر کے اپنے مقصد کا حصول ممکن بناتے ہیں۔ مدح کیوں کہ شاعر کی نگارش کا نقطۂ عروج ہوتا ہے اس لیے وہ اپنی تمام تر توانائیوں کو بروئے کار لاتا ہے۔

بعض صورتوں میں قصیدہ نگار صدق و کذب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے محض پینترے بدل بدل کر مُبالغہ آرائی سے زورِ کلام پیدا کرتا ہے مگر اس زورِ بیان میں غلو کی حد سے آگے نکل جاتا ہے۔ انعام و اکرام اور صلہ کے لالچ میں بے اعتدالیوں کا مرتکب بھی ہو جاتا ہے۔

مگر پھر بھی ہمیں مدح سرائی کی حوصلہ افزائی کرنی ہوگی تا کہ ملک وملت اور مشاہیر اسلام کی جاں فروشی اور خدمتِ خلق کی داستانوں کے ذریعے خراجِ تحسین پیش کیا جا سکے۔ اس عمل سے نہ صرف ان کی قدر و منزلت کا تعیّن ہوگا بلکہ سرفروشوں کی سرفرازی کی داستان آنے والی نسلوں کے لیے سرمایۂ افتخار اور مشعلِ راہ ہوگی۔

اگر ایسا نہ کیا گیا تو خدانخواستہ دُشمن ہماری تاریخ کو مسخ کر دے گا جس سے بحیثیت مجموعی ہمارا اپنی روایات، تاریخ اور داستانِ سرفروشی سے ایمان اُٹھ جائے گا اور یہی قوموں کا عظیم نقصان ہوا کرتا ہے کہ وہ خود اعتمادی کھو بیٹھتے ہیں۔ اپنی اقدار کی پاس داری اور اُنھیں زندہ رکھنے کے لیے ہمیں مدحِ راست کو اپنانا ہوگا کیوں کہ پھول بانٹنے والے ہاتھوں میں خوشبو رہ ہی جاتی ہے۔ اسی طرح حمدیہ قصائد بھی لکھے جانے چاہئیں تا کہ ربِّ کریم سے تجدید عہدِ وفا ہوتا رہے۔ توحید اور تقاضائے توحید پر کاربند ہو کر اسلامی روایات و اقدار کو فروغ دیا جا سکے۔

اس ضمن میں محتاط رَوَیّہ اپنانے کی ضرورت ہے۔ بعض بے اعتدالیوں نے صنفِ قصیدہ کو بدنام کیا ہے۔ اگر قصیدے کو بطور آرٹ کے لیا جائے اور اس کے عیوب کو غالب نہ آنے دیا جائے تو دیگر اصنافِ سخن کی طرح قصیدہ کو بھی قبول بنایا جا سکتا ہے۔ محض قصیدے سے ''اللہ واسطے کا بیر'' اس صنفِ عالیہ کی گردن دبانے کے مترادف ہے۔ اس روّش کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے قصیدہ نگاری کو بہ طورِ خاص اپنایا جانا چاہیے تا کہ اردو زبان و ادب میں ادب عالیہ کا

اضافہ ہوتا رہے۔ مدح کے اشعار کی تعداد تشبیب کے اشعار سے زیادہ ہو ورنہ قصیدے کا مقصد مکدر ہو جائے گا اور شاعر کی روانی طبع اسے پسِ پشت ڈال دے گی۔

حسنِ طلب اور دعا

دعا قصیدے کا چوتھا اور آخری رکن ہے۔ دُعا کو حسنِ طلب کا نام بھی دیا جاتا ہے کیوں کہ اس میں شاعر عمدہ اشاروں اور رمز و ایما سے کسی شے کو مانگتے ہیں۔ اسے غرضِ مطلب کے نام سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے تاہم اس کا مطمحِ نظر دعا ہی ہوتا ہے۔ اس نازک مقام کی کامیابی طرزِ دعا پر منحصر ہے۔ عرضِ مطلب، مدعا، حُسنِ طلب اور خاتمہ میں قصیدہ گو اپنا تخلص استعمال کرتا ہے اس لیے اس میں مقطع بھی پایا جاتا ہے۔ فنکاری اور صنّاعی سے اپنا مدعا بھی بیان کر دیا جاتا ہے اور ممدوح کی طبع پر گراں بھی نہیں گزرنے دیا جاتا۔ ممدوح کو دعاؤں اور نیک تمناؤں کا گل دستہ پیش کیا جاتا ہے اور دشمنوں کے لیے دُشنام، طعن اور بد دعائیں بڑی فنّی چابک دستی سے دی جاتی ہیں۔ حسنِ طلب کے بارے میں ڈاکٹر ابو محمد سحرؔ لکھتے ہیں:

> ''حسنِ طلب میں شاعر اپنا مدعا ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے یہ بھی کافی نازک مقام ہوتا ہے۔ اس موقع پر ممدوح کی نفسیات کا پورا پورا خیال رکھ کر اظہارِ مطلب اس ڈھنگ سے کرنا چاہیے کہ اس کی طبیعت پر گراں نہ گزرے۔'' (۵۲)

حسنِ طلب اور دعا کو ایک ہی ضمن میں تصور کیا جانا زیادہ قرینِ انصاف ہے۔ قصیدے کا آخری حصہ بھرپور ہونا چاہیے۔ دعا کے اشعار کے متعلق ڈاکٹر سعادت سعید یوں رقم طراز ہیں:

> '' دعا کے اشعار کی تعداد زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔ دو، تین یا زیادہ سے زیادہ پانچ اشعار کی دعائیں دیکھنے میں آتی ہیں۔'' (۵۳)

خاتمہ اس قدر مستحکم ہو کہ اس میں ردّ و بدل ممکن نہ ہو۔ ایجاب و قبول اور بے ساختی شرطِ اول ہے تاکہ مادح ممدوح سے راضی ہو کر نوازشات اور انعام و اکرام سے نوازے۔

قصیدے کا موضوع

موضوع کے لحاظ سے قصیدے کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ہر قسم کے خیالات و نظریات

قصیدے کی زینت بن سکتے ہیں۔ جمادات، نبادات، حیوانات، سائنس، طبیعات، کیمیا، طب اور صنعت وحرفت اس کے متنوع دامن میں سما سکتے ہیں۔

جنگ وجدل، جہاد، تبلیغ، واعظ ونصیحت، پند ونصائح، درس وتدریس اور علوم وفنون کے موضوعات قصیدے کے لازمی جزو ہیں۔ عشقیہ مضامین قصیدے کا عام موضوع ہے۔ مدح، تعریف وتوصیف، ستائش، ہجو اور ذم کے وغیرہ کے موضوعات قصیدے میں بالعموم پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح سے چہار سُونکہت وانوار کے اتصال وانفصال کا ذکر بھی اس کا موضوع ہے۔ عربی زبان وادب کا مطالعہ بالخصوص دورِ جاہلیّت کے قصائد بالعموم عشقیہ مضامین کا احاطہ کرتے تھے۔ داستانِ عشق ومحبت، وارداتِ قلبی کے تحت منظر نگاری، ماحول کی عکس بندی، معاشرت، اخلاقِ حسنہ، عدل وانصاف اور رسوم واطوار کا بھرپور اور دلکش بیان کیا جاتا ہے۔ دورِ جاہلیّت کی لایعنیّت اور لغویّت کا طرزِ نگارش عہدِ رسالت میں تغیر وتبدّل سے ہمکنار ہوا۔ سوچ کے زاویے کا دھارا بدلا، اقدار تبدیل ہوئیں۔ قصیدہ نگاروں نے قرآن کی تعلیمات کا اثر لیا۔ قرآنِ مجید فرقانِ حمید کے اثر میں اکثر شعراء نے شاعری ترک کر دی۔ اگر کسی نے شاعری جاری رکھی تو اُن کے قصیدوں میں موضوعات اور فکری اُڑان نے نئی کروٹ لی۔ بدلتی ہوئی اقدار اور معاشرت نے انفرادی واجتماعی معاملاتِ زندگی پر اَن مٹ نقوش مرتّب کیے۔ توحید کے پرستاروں اور شمع رسالت کے پروانوں نے قصیدوں میں اللہ تبارک وتعالیٰ اور پیارے پیغمبر نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی توصیف وتمہید کو بیان کرنا شروع کر دیا۔ اس ضمن میں حضرت حسانؓ بن ثابت کا اسمِ گرامی بڑی عزتوں کے درجے پر فائز ہے لیکن جلد ہی اللہ تعالیٰ، آں حضرت ﷺ اور جیّد صحابہ کرامؓ کی مدح کی بجائے دورِ بنوامیّہ کے دور میں قصیدے نے کروٹ بدلی اور شخصی مداحی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دروغ گوئی نے دورِ جاہلیت کی سی روش اختیار کر لی۔ انعام واکرام کے لالچ نے چاپلوسی کو جنم دیا۔ شعرا نے زمین وآسمان کے قلابے ملا کے اپنے ممدوح کو مافوق الفطرت مخلوق ثابت کیا۔ دورِ عباسیہ میں قصیدے کا کینوس پھر سے وسعتوں کو اپنے دامن میں سمونے لگا۔ مضامین کا تنوّع، جزئیات نگاری، تغزل، واقعہ نگاری اور امرا اور رؤسا کی مدح وستائش کے باوجود صدق وراست گوئی کو کلیدی درجہ حاصل رہا تاہم

فطری چاشنی اور کردار سازی بھی برقرار رہی۔

عربی قصیدہ علاقائی اور مقامی سرحدوں کو عبور کر کے ایران تک پہنچا۔ پرائے دیس میں آ کر قصیدہ مکمل طور پر اپنی ہیئت اور موضوعات کا دفاع نہ کر سکا۔ یہاں کی آب و ہوا نے قصیدے کا حقیقی چہرہ بدل ڈالا۔ کچھ نئے تجربات ہوئے۔ قصیدے کی نوک پلک سنواری گئی۔ اپنے تہذیب و تمدّن، افکار، خیالات، طرزِ معاشرت، نقطہ نظر، فہم و اِدراک، سماج، معیشت اور معاشرت کو قصیدے کی زینت بنایا گیا۔

قدیم افکار کی جگہ جدید اور نئے خیالات نے لے لی۔ سکّہ بند قصیدہ گو شعرا نے جدید عصری تقاضوں کو قصیدے میں ڈھالنا شروع کیا۔ یُوں ایرانیوں کے نابغہ عصر اور صاحب اسرار شعرا نے ایرانی تہذب کا مکمل نمونہ آنے والی نسلوں کے لیے پیش کر دیا۔ یہ دور قصیدے کی نئی جہات اور اُٹھان کا دور تو تھا مگر عربی قصیدہ نگاروں کے برعکس ایرانی شعرا درباروں کے رسیا ہو گئے، شومئی قسمت کہ شعرا کے لیے درباروں کے علاوہ سرپرستی کرنے والا اور مالی معاونت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ لہٰذا مالی طور پر خزاں رسیدہ شعرا کے لیے شاہی دربار جاوداں تھے۔ یُوں بھٹکے ہوئے شُتر بانوں کو گلشنِ استراحت میں وقتی عشرت کدہ مُیسر ہوتا۔ گو ہر عشرت کو آبِ عشرت سے چمکا کر عشرت کدہ میں رہنے کے جتن کرتے رہتے تھے۔ سلاطین، امرا، رؤسا اور شہنشاہوں کی عنایات کے باعث قصیدہ نگاری میں موضوعات کا تنوّع اور تصنّع دیکھنے میں آیا۔ تمہید میں بہار و خزاں کے موسموں کی تصویر کشی، علمی بحث و مباحثہ، حسن و عشق، جشنِ نو روز، مولود نامہ، انبیاء، رسل، اہلِ بیت اطہار، کربلا کا جزوی اور کلی تذکرہ اور صوفیا و اولیاء کرام سے محبت و عقیدت کے موضوعات قصائد کا حصہ بنے۔ قصیدہ گوئی کے برعکس ہجو گوئی کے میدان میں شعرا نے اپنی ذات پسند و ناپسند، نظریاتی و ذاتی چپقلش اور عصری چشمک کے باعث بھرپور طبع آزمائی کی۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا اگر سلاطین نے انعام و اکرام سے نہ نوازا تو پھر اُن کی ہجو گوئی کی جاتی۔ یُوں طعن و تشنیع اور دُشنام درازی کے میدان میں تمام تر تخلیقی قوّتوں کو بروئے کار لایا جاتا۔

قصیدے کے دامن میں ہر قسم کے خیالات اور نظریات سمو سکتے ہیں۔ جمادات،

نباتات، حیوانات، سائنس، طبیعات، کیمیا اور صنعت وحرفت اس کے متنوع دامن میں سما سکتے ہیں۔ عشق ومعرفت کے مضامین بھی قصیدے کا موضوع رہے ہیں۔

مدح، تعریف وتوصیف، ستائش، ہجو اور ذم وغیرہ کے موضوعات ہی قصیدے میں پائے جاتے ہیں۔ اگر حمدیہ قصیدے کے موضوع کے حوالے سے بات کی جائے تو قصیدہ گو شعرا نے صفاتِ ربِ جلیل: رحمان، رحیم، غفار، حنان، منان، دیان، قہار، جبار، ستار، سمیع، بصیر، خبیر، ممیت، مقیت، باسط، وکیل، حیّی، قیوم، علیم، رافع، رزاق، واجد، واحد، مغنی، مجیب، ولی، عظیم، علی، رقیب، بدیع، معز، لطیف، عفو، حفیظ، حمید، باطن، جامع، غفور، متعالی، فتاح، متکبر، مجید، مہیمن اور قادر کا ذکر کیا ہے۔

توحید کے پرستاروں نے خوشبوؤں اور رنگوں کو دل آویز انداز سے موضوعِ قصیدہ بنایا۔ یہ اندازِ بیان دل ودماغ کو عرفان وایقان کی دولت سے مالا مال کر کے نہاں خانوں میں تہلیل کی تسبیح کو زبان پر جاری کر دیتا ہے۔

کائنات کی تخلیق، وجہ تخلیقِ کائنات، مدارِ کہکشاں واجرامِ فلکی، فلک، ستاروں، سورج، سمندروں، دریاؤں، جنگلوں، صحراؤں، آبشاروں اور چشموں کا ذکر قصیدے کا موضوع ہے۔ شجر، حجر، پربت، بیاباں، گلستاں، کوہساروں کی تخلیق، بناوٹ اور ان کی حرکات وانجماد کو حمدیہ قصیدے میں موضوع بنایا جاتا ہے۔ درج بالا پہلوؤں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے اقتدار کی وسعتوں اور اختیارات کے اِدراک کو حمدیہ قصیدے کا موضوع بنایا ہے۔ رات کے اندھیروں سے صبح کا نُور پھوٹنا اور سورج کا اُگنا خورشید وماہ وانجم کا تخلیقی عمل قصیدے کا موضوع رہا ہے۔ کائنات، مظاہرِ فطرت، اہلِ انعام اور خود خالقِ کائنات قصیدے کے موضوع ہیں۔ قصیدے کے موضوع کے حوالے سے امداد امام اثرؔ یوں لکھتے ہیں:

> ''اس میں امور ذہنیہ از قسم مسائل اخلاق وتدبیر المنز ل، سیاست مدن مذہب وشریعت، طریقت، عرفان وتوحید، عدل ونبوّت وامامت، محاورہ قوانین وغیرہ معاملات خارجیہ از قسم مضامین مشاہدات اسمائے سماویہ وارضیہ ومابینہا احاطہ نظم میں در آئیں۔'' (۵۴)

بعض قصیدہ نگاروں نے مقامی، ملکی، عوامی، قومی، انفرادی واجتماعی معاملات کو بھی موضوع بنایا ہے۔ اس ضمن کی عمدہ مثالیں سودا کا قصیدہ ''تضحیکِ روزگار'' اور مولانا اسماعیل کا قصیدہ ''جریدۂ عبرت'' شہرِ آشوبیہ اور نوحہ ہے۔ ملکی بگڑتی ہوئی سیاسی حالات کی عکاسی قصیدے کا موضوع ہے۔ قومی و بین الاقوامی مسائل کی نشان دہی بھی اس کا موضوع ہے۔

قصیدے کا اساسی محرک

حمدیہ قصیدے کی تخلیق وترویج کا نمایاں محرک یہ ہے کہ انسان ایک ایسی ذی روح اور ذی شعور ہستی ہے جو تحیرّ و تجسّس کے پیچیدہ ترین ذہنی نظام کی حامل ہے جس میں تفکر و تفہم اضطراب، حصولِ علم کی تشنگی، سوچنے، سمجھنے اور وجوہات تلاش کرنے کی فطرت ہے۔ اس عظیم ترین کائنات کی تخلیق اور اس کے خالق، خدا، انسان، زندگی کے بحرِ بیکراں، آفاقی اسرار و رموز اور ان گنت تصورات تحریک بن کر اس کے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ انسان میں تجسّس کا مادہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت کردہ ہے۔ کائنات میں ہر شے کی تخلیق کا ماخذ ایک آفاقی اصولِ قوّت ہے۔ کن فیکون کی جامع اصطلاح اور قرآنی نص کا ذکر انسانی ذہن اور تصور و تخّیل کو عملی اور منطقی طور پار تسلیم کرنا معراجِ علم ہے۔ فلسفیانہ بصیرت سے وجودِ عظمٰی کے وجود کی گواہی دینا انسانی شعور کا بنیادی محرک ہے۔ ارادے کا منبع و سرچشمہ انسانی شعور ہے تاہم انسانی ذہن باطنی معاملات کا مکمل اِدراک کرنے سے قاصر ہے۔ اس لیے ہر لحہ اِنکشاف وظہور کا سفر جاری و ساری رہتا ہے۔ ان گنت ذہنی اور فکری تردّدات نے انسان کو گھیرا ہوا ہے جس کے باعث اس کی جبلّت میں شامل ہے کہ وہ کسی نہ کسی کے دامن میں پناہ تلاش کرتا ہے۔ حمدیہ قصیدہ نگاری بھی اسی ضمن کی ایک کڑی ہے۔ قصیدہ کے اساسی محرکات کی نوعیّت تین طرح کی ہے۔ ایک اساسی محرکاتِ حمدیہ قصیدہ جس کا دائرہ کار اور تعلق اس صنف کی تخلیق سے ہے اور دوسرا محرکاتِ حمدیہ قصیدہ وہ ہے جس میں حمدیہ قصیدے کے فروغ اور ترویج و اشاعت کے حوالے سے عملی اقدامات اٹھائے جاتے ہیں۔ تیسرا اساسی محرک توشہ آخرت اور بخشش کے لیے کوشش و کاوش ہے۔ حمدیہ قصیدے کے اساسی محرکات میں اللہ ربُ العزّت سے بندگی کے رشتے، محبت، اطاعت و فرماں برداری اور نعمت و احسانات کے حوالے سے رضائے الٰہی کے حصول کی

سعی شامل ہے۔تمام تر سعی، جدوجہد، جتن اور کوشش و کاوش کا محور حصولِ بخشش و عطا ہے۔اسی طرح ثانوی محرکات کا براہِ راست واسطہ حمدیہ قصیدے کی اختراع و ایجاد اور تخلیق کے ساتھ ساتھ اس کے فروغ، ابلاغ اور تشہیر و ترویج سے ہے۔قصیدہ گوئی کا بنیادی محرک خالقِ کائنات سے بندگی کا رشتہ ہے۔اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات کی معرفت اور عقیدہ توحید و وجوبِ محبتِ خالقِ کائنات کا سبب ہے۔تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے کہ مصداق احسانات رب جلیل کی ممنونیت ہم پر لازم آتی ہے۔یہی جذبہ جب شعر کا روپ دھارلے اور مروجہ ہیئت کے مطابق ہو تو حمدیہ قصیدہ تشکیل پاتا ہے۔حمدیہ قصیدہ نگاری کا ایک اور اساسی محرک اطاعتِ الٰہی کا جذبہ ہے۔ممنونِ نظر اور مرہونِ کرم شاعر قرآنِ کریم کے اسلوبِ اطاعت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے پیروی و اطاعت میں انعام و بخشش پاتا ہے۔محرکاتِ حمدیہ قصائد میں اطاعت و اتباع کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔ابتدائے آفرینش سے ہی حضرتِ انسان اپنے خالق کی مدح سرائی کسی نہ کسی صورت میں کرتا آیا ہے۔حصولِ خیر و برکت بھی قصیدہ نگاری کے محرک کا درجہ رکھتی ہے۔حمد نگاری اور حمدیہ قصیدہ نگاری میں تمام مکتبۂ فکر نے ہمیشہ حصہ لیا ہے۔حتّٰی کہ غیر مسلم شعرا اپورب کشن اور پرشاد وغیرہ نے بھی عمدہ حمدیہ قصیدے لکھے ہیں۔

حمدیہ قصیدہ نگاری محض شعری صنف سخن ہی نہیں باعث برکت بھی ہے۔بحیثیت مسلمان کا اس کا سننا، سنانا، پڑھنا، لکھنا، چھپنا، چھپوانا عین عبادتِ الٰہی کے مترادف ہے۔حمدیہ قصیدہ نگاری کا ایک محرک یہ بھی ہے کہ حمدیہ قصیدہ گو اسے تہلیل و تسبیح کا درجہ دیتے ہیں اور فنا فی اللہ ہونا اپنی بقاء خیال کرتے ہیں۔یہ محض ان کا خیال ہی نہیں بلکہ عین ایمان بھی ہے۔حمدِ خدا وندی سیاہ دلوں کو توحید کے نور سے مستنیر کرتی ہے۔بڑے بڑے شعرا کرام نے اپنے دواوین کلیات اور مجموعات کے شروع میں برکت و رحمت کے لیے حمدیہ کلام یا پھر حمدیہ قصائد کو شامل کیا ہے۔اس کے پیچھے ایک ہی محرک ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ با برکت کو اپنی تمام نگارشات میں اوّلیت درجہ دینا تا کہ رضائے الٰہی کا حصول یقینی بنایا جا سکے۔وہ شعرا جو شعر گوئی کی رغبت رکھتے تھے وہ قصیدہ نگاری کی طرف متوجہ ہوئے انھوں نے وارداتِ قلبیہ، مشاہدات

اور وجدان کو حمد یہ قصیدہ نگاری کا جامہ پہنایا۔حمد یہ قصیدہ نگاری کا ایک محرک مدد واعانتِ الٰہی اور حصولِ رزق ہے۔ یہ کائنات بڑی وسیع وعریض ہے جس میں صحرا، جنگل، پہاڑ اور دریا ہیبت وجلال کے حامل ہیں۔انسان ان وحشتوں اور الجھنوں پر قابو پانے کے لیے تسبیح وتہلیل کی طرف راغب ہوتا ہے۔حمد یہ قصیدہ نگار بھی اپنے معاشی ومعاشرتی مسائل کے حل اور خاتمے کے لیے بارگاہِ ربِ کریم میں التجا کرتے ہیں۔ یہ بھی قصیدہ نگاری کا اساسی محرک ہے۔برِّ عظیم کے بڑے بڑے شہروں میں مشاعرے منعقد ہوتے تھے جس سے اس کی ترویج ہوئی۔سماع کی محفلوں میں حمد یہ کلام پڑھا جانا اساسی محرک کے زمرے میں آتا ہے۔تزکیہ نفس، فنا فی اللہ، وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے مکتبۂ فکر کے شعرانے اپنے کلام کو دولتِ مکاشفہ سے نوازا۔اساسی ومجلسی محرکاتِ حمد یہ قصیدہ اور شعرائے کرام کے شغف وتوجہ کے ساتھ ساتھ ذرائعِ ابلاغِ عامہ نے اللہ تعالیٰ کی بزرگی، جاہ وجلال اور مدح کو عوام الناّس تک ابلاغ کا کام انجام دیا۔رسائل وجرائد نے بھی حمد یہ قصیدے کی ترویج میں اساسی محرک کے طور پر کام کیا۔مختلف مذہبی رسائل وکُتب میں توحید اور حمدِ باری تعالیٰ کو خصوصی طور پہ شائع کیا گیا۔

عالمی ادب کا مطالعہ کرنے سے یہ بات عیاں ہوئی ہے کہ ادب میں مختلف میلانات ورجحانات پائے جاتے ہیں لیکن ان تمام تر رجحانات میں تمام مذاہب میں غالب عنصر اپنے اپنے پُرستیدہ کی مدح وتوصیف بیان کرنا ہے۔ جسے ادباء اپنے کلیات، دواوین اور مجموعات کے آغاز میں حدیہ تبریک کے طور پر شامل کرتے آرہے ہیں۔اس مکتبہ فکر کے فکروفن کا مطالعہ سے مدح کے اساسی محرکات آشکار ہوتے ہیں۔انسان اپنے ماحول سے براہ راست اثر قبول کرتا ہے اور ادبیاتِ مشرق پر جغرافیائی طور پر مسلم معاشرے کے اثرات نمایاں ہیں۔یہی وجہ ہے کہ عربی، فارسی اور اُردو زبانوں میں حمد یہ قصائد پائے جاتے ہیں۔حمد یہ قصیدے کے اساسی محرکات میں مسلم معاشرے کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔عالمی ادبی منظرنامہ تہ بہ تہ مذہبی و تہذیبی محرکات اور عوامل کا آئینہ دار رہا ہے۔ادب وادیب اپنی بصیرت، جبلّت، سنجیدگی، منطقی و مدلل قلمی گہرافشانیوں سے پُرستیدہ کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔ہمارے یہاں شعرا کا حمد یا حمد یہ قصیدہ لکھنا اور اسے اپنے دیوان میں شامل کرنے کی روایت رہی ہے۔اس روایت سے

انحراف بہت مشکل ہے۔اس کا واحد محرک کارِثواب اور وسیلۂ نجات ہے۔ یہ محض رسماً نہیں بلکہ عقیدتاً ہے۔اظہارِخیال میں الفاظ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مافی الضمیر اس کی ادائیگی میں وسعت پیدا کرتا ہے اور اپنی فکر کو زینتِ قرطاس بناتا ہے۔ انسان اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے فطری مُظاہر کو سمجھنے اور اس کے رازو نیاز کا اِدراک چاہتا ہے۔اس لیے شعور وفہم سے محو گفتگو رہتا ہے۔ یہ کائنات کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ ہے اور اس میں اہلِ دانش وبینش کے لیے نصیحت ہے اس لیے بنیادی محرک کے طور پر یہ موضوع ہمارے قصیدہ نگاروں کے ہاں پایا جانا فطری عمل ہے۔کائنات کے پنہاں رازوں کے انکشاف کے دوران میں حمدیہ قصیدہ نگار اللہ تعالیٰ کی قدرتِ خلاقی کی مدح وتوصیف بجالاتا ہے یوں یہ عمل قصیدہ کے اساسی محرک کے طور پر کام کرتے ہوئے لامکاں سے تحت الثریٰ تک کے گوہر چن چن کر قصیدہ نگار کے دامن میں سجا دیتا ہے۔ Logical Sense کے تناظر میں قرآنی فلسفہ افلا یتفکرون، افلا ینظرون اور افلا یتدبرون جیسی اصطلاحات پیش کرتا ہے۔شعراء نے قصیدہ نگاری میں انھی اساسی محرکات کو بروئے کار لاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کو بیان کیا ہے حمدیہ قصیدے کا ایک اور اساسی محرک اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے حالات و واقعات، تفکر وتردّدات، مصائب وآلام اور مشکلات کا اظہار کر کے مدد ونصرت طلب کرنے کی سعی کے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ بابرکات سے استغیث اور استمداد کا حصول ہے۔ بارگاہِ ربِ جلیل میں فریادو مشکل کشائی اور حاجت روائی کی استدعا کرتا ہے۔قصیدہ نگاری کی وقت شاعر کے پیشِ نظر جو اساسی محرک ہوتا ہے اس میں دفعِ بلیّات، دافع مشکلات، شفائے امراض، حصولِ رضائے الٰہی اور دیگر درپیش معاملات زندگی سے نجات حاصل کرنے کی التجا شامل ہیں۔ دبے دبے لفظوں اور دل ہی دل میں اپنی اور امتِ مسلمہ کی واماندگی و بے چارگی کا ذکر بھی قصیدہ نگاری کے اساسی محرک کے طور پر دیکھنے میں آیا ہے۔قرآنِ مجید فرقانِ حمید بھی حمدیہ قصیدہ نگاری کا ایک کلیدی اور اہم مآخذ، منبع اور خزینہ ہے۔ ہر زبان وادب اور ہر دور کے شعراء نے اللہ تعالیٰ کی توحید (فلسفہ وحدت الوجود، فلسفہ وحدت الشہود اور فلسفہ وحدت الوجوب)، اختیارِ اعلیٰ، اقتدار اعلیٰ اور اسماء الحسنیٰ سے اپنے کلام کو مزیّن کیا ہے۔حمد گوئی کے مبارک شغل سے

انسلاک انسان کو اپنی تخلیق کے روزِ اوّل ہی سے ہے۔ فکر وفن کو حمد رُ ورکھنا اللہ تعالیٰ کی توفیقِ خاص اور سعادت مندی ہے۔ قصیدہ نگاروں کا وفورِ جذبات وفورِ اظہار، شوقِ بیاں، شکوہِ لفاظی اور معنوی تار و پود کا گلدستہ ان کی عقیدت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ کشاکش حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے بندہ اپنے ربّ کی طرف رجوع کر کے مدد و اعانت طلب کرتا ہے۔ مشکل کشا سے سہارا طلب کرنا حمد سرائی کے در وا کرتا ہے۔ حمدیہ قصیدے کے اساسی محرک میں عرفانِ ربِّ کائنات کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ شرک سے بے زاری کا جذبہ بھی حمدِ باری تعالیٰ کا اساسی محرک ہے۔ شرک کی بیماری اور مہلک ترین خطرات کے پیشِ نظر حمدِ باری تعالیٰ کا فہم و ادراک ضروری ہے۔ تا کہ غیر اللہ سے بے زاری اور لاتعلقی کا رویّہ پنپ سکے۔ آنحضور ﷺ کے امتی بنا کر پیدا کرنے کے باعث بھی شکرانے کے طور پر بھی شعراء حمد و توصیف بجالاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی جانے والی نعمتوں اور فضل و کرم کے حوالے سے حمدیہ پہلو نکالنا بھی حمدیہ قصیدے کا اساسی محرک ہے۔ سورہ الرحمٰن کا اُسلوب اور تذکرہ احسانات ِربی ۶۳ اس کا منبع ہے۔ ''علیم بذات الصدور'' کے قرآنی مضمون کو شعری قالب میں ڈھال کر اللہ رب العزت کی علمیّت کا اعتراف کرنا حمدیہ قصیدے کے اساسی محرک کے طور پر سامنے آتا ہے۔ جب کوئی بندہ مومن قرآنِ مجید کی تلاوت کرتا ہے۔ تو براہِ راست اللہ تعالیٰ کے طرزِ تکلم سے آگہی حاصل کر رہا ہوتا ہے۔ یوں اُسی انداز سے اپنی زبان میں حمدِ ربِّ جلیل کا اہتمام کرتا ہے۔ کیوں کہ قرآن اور صحائفِ آسمانی کے حوالے سے شعری متن تشکیل پاتا ہے اس لیے اس کے اشعار میں قرآن سے متنی رشتہ اُستوار رہتا ہے۔ حمدیہ قصیدے کا ایک اساسی محرک یہ بھی ہے اللہ تعالیٰ کی عظمتوں آقائے دو جہاں واقف ہیں اور محمد اللہ تعالیٰ کی شان سے واقف ہیں۔ آں حضرت ﷺ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بجالاتے ہیں اس لیے قصیدہ نگار بھی حمد سرا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر علی محمد خان و ڈاکٹر اشفاق احمد ورک (مرتبین): ''اصناف نظم ونثر'' الفیصل ناشرانِ کتب، لاہور،۲۰۱۴ء ،ص ۶۴

۲۔ مولانا سعد حسن خان (مترجم): ''المنجد'' دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۵۷ء، ص ۸۰۸

۳۔ ڈاکٹر سعادت سعید: ''قصیدہ کا تہذیبی وفنی مطالعہ'' (مقالہ پی ایچ ڈی اردو) شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، س ن، ص ۲۹

۴۔ مولانا سعد حسن خان (مترجم): ''المنجد'' ص ۸۰۷۔۸۰۸

۵۔ سید احمد دہلوی: 'فرہنگ آصفیہ'' ترقی اردو بئ دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۴۷۵

۶۔ نور الحسن نیر: ''نور الغات''، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، طبع سوم، ۲۰۰۶ص ۸۶۵

۷۔ ڈاکٹر سعادت سعید: ''قصیدہ کا تہذیبی وفنی مطالعہ'' (مقالہ پی ایچ ڈی اردو) ص ۳۱

۸۔ ڈاکٹر ابو محمد سحرؔ: ''اردو میں قصیدہ نگاری'' تخلیق کار پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۰ء، ص ۲۰۷

۹۔ شمیم احمد: ''اصنافِ سخن اور شعری ہئیتیں'' مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۳۸ء، ص ۴۳

۱۰۔ مولوی نجم الغنی رام پوری: ''بحر الفصاحت (حصّہ اول)''، مرتبہ: سید قدرت نقوی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۷۲

۱۱۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی: ''کشاف تنقیدی اصطلاحات'' مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۵، ص ۴۲

۱۲۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی: ''اصنافِ ادب'' سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۴۴۔۴۵

۱۳۔ ڈاکٹر محمد افتخار شفیع : ''اصنافِ شاعری'' کتاب سرائے، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۴۳

۱۴۔ ڈاکٹر ابو محمد سحرؔ: ''قصیدہ صنفِ سخن کی حیثیت سے'' مشمولہ: اردو شاعری کا فنی ارتقاء، مرتبہ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، الاعجاز پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء ص ۲۰۷۔۲۰۸

۱۵۔ ڈاکٹر محمود الٰہی: ''اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ'' مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۷۴، ص ۳۰

۱۶۔ ڈاکٹر سعادت سعید: ''قصیدہ کا تہذیبی وفنی مطالعہ'' (مقالہ پی ایچ ڈی اردو) ص ۴۰

۱۷۔ امداد امام اثر: ''کاشف الحقائق'' ترقی بیورو، نئی دہلی، ۱۹۲۸ء، ص ۲۳۲
۱۸۔ ڈاکٹر ام ہانی اشرف: ''اردو قصائد کا سماجیاتی مطالعہ'' ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۹ء، ص ۲۵
۱۹۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر: ''قصیدہ صنفِ سخن کی حیثیت سے'' مشمولہ: اردو شاعری کا فنی ارتقاء، ص ۲۱۴
۲۰۔ ڈاکٹر محمد صادق: ''LiteratureUrduofHistory'' آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن، س ن، ص ۳۰۔۳۱
۲۱۔ کلیم الدین احمد: ''اردو شاعری پر ایک نظر'' حصّہ اول نیشنل بک فاؤنڈیشن ۱۹۸۸ء، ص ۲۱۷۔۲۱۸
۲۲۔ الطاف حسین حالی: ''مقدمہ شعر و شاعری'' مرتب: ڈاکٹر وحید قریشی، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵، ص ۲۰۱
۲۳۔ ڈاکٹر سعادت سعید: ''قصیدہ کا تہذیبی و فنی مطالعہ'' (مقالہ پی ایچ ڈی اردو) ص ۶۷
۲۴۔ مولانا شبلی نعمانی: ''شعر العجم، پانچویں جلد)'' دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۹۱ء، ص ۳۰
۲۵۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر: ''قصیدہ صنفِ سخن کی حیثیت سے'' مشمولہ: اردو شاعری کا فنی ارتقاء، ص ۲۱۳
۲۷۔ ڈاکٹر ریاض مجید: ''اردو میں نعت گوئی'' اکادمی، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۳۲
۲۸۔ ڈاکٹر ام ہانی اشرف: اردو قصائد کا سماجیاتی مطالعہ'' ایجوکیشنل بک فاؤنڈیشن، بار دوم، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۱۵
۲۹۔ مولوی نجم الغنی رام پوری: ''بحر الفصاحت (حصّہ اول)'' مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۷۵
۳۰۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی: ''اصنافِ ادب'' سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۴۱
۳۰۔ ڈاکٹر سعادت سعید: ''قصیدہ کا تہذیبی و فنی مطالعہ'' (مقالہ پی ایچ ڈی اردو) ص ۵۷
۳۲۔ ایضاً، ص ۵۶
۳۳۔ شمیم احمد: ''اصنافِ سخن اور شعری ہیئتیں'' ص ۵۵
۳۴۔ ڈاکٹر سعادت سعید: ''قصیدہ کا تہذیبی و فنی مطالعہ'' (مقالہ پی ایچ ڈی اردو) ص ۴۰
۳۵۔ ایضاً، ص ۴۱

۳۶۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی: ''کشاف تنقیدی اصطلاحات''ص ۴۲
۳۷۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر: ''قصیدہ صنفِ سخن کی حیثیت سے''مشمولہ: اردو شاعری کا فنی ارتقاء، ص ۲۱۴
۳۸۔ منور رؤف، صابر کلوروی (مدیران): ''خیابان (سہ ماہی)'' پشاور یونیورسٹی، پشاور، ۲۰۰۱ء، ص ۳۴
۳۹۔ شمیم احمد: ''اصنافِ سخن اور شعری ہئیتیں''ص ۴۶
۴۰۔ ایضاً، ص ۴۸
۴۱۔ ایضاً، ص ۴۹
۴۲۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر: ''اردو میں قصیدہ نگاری''ص ۱۳۔۱۴
۴۳۔ شمیم احمد: ''اصنافِ سخن اور شعری ہئیتیں''ص ۵۰
۴۴۔ مولوی نجم الغنی رام پوری: ''بحر الفصاحت (حصہ اول)''ص ۱۷۵
۴۵۔ ڈاکٹر سعادت سعید: ''قصیدہ کا تہذیبی و فنی مطالعہ'' (مقالہ پی ایچ ڈی اردو) ص ۴۳
۴۶۔ ڈاکٹر ام ہانی اشرف: ''اردو قصائد کا سماجیاتی مطالعہ''ص ۱۷
۴۷۔ سید احمد دہلوی: ''فرہنگ آصفیہ''ص ۲۴۸
۴۸۔ ڈاکٹر محمود الٰہی: ''اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ''ص ۴۹
۴۹۔ ڈاکٹر ام ہانی اشرف: ''اردو قصائد کا سماجیاتی مطالعہ''ص ۱۹
۵۰۔ شمیم احمد: ''اصنافِ سخن اور شعری ہئیتیں''ص ۴۹
۵۱۔ سید عابد علی عابد: ''اصولِ انتقادِ ادبیات''، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۰ء، ص ۴۵۴
۵۲۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر: ''قصیدہ صنفِ سخن کی حیثیت سے''ص ۲۱۳
۵۳۔ ڈاکٹر سعادت سعید: ''قصیدہ کا تہذیبی و فنی مطالعہ'' (مقالہ پی ایچ ڈی اردو) ص ۵۵
۵۴۔ امداد امام اثر: ''کاشف الحقائق'' (جلد دوم) ص ۴۷۵

☆☆☆☆☆☆☆

باب دوم

اُردو حمدیہ قصیدے کی روایت

دونوں جہاں میں کون ہے ایسے کمال کا
لکھے جو ایک حرفِ ثنا ذوالجلال کا
(تمنامرادآبادی)

اُردو حمدیہ قصیدے کی روایت

حمد کیا ہے؟

حمد کا مادہ ''ح م د'' ہے۔

عربی زبان کا اسم مؤنث ہے۔جس کے معنی خدا کی تعریف کے ہیں۔

حمد کا لفظ تخصیص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تعریف، خدا کی بزرگی اور عظمت بیان کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

حامِد: تعریف کرنے والا اسمِ فاعل حامِد کہلاتا ہے۔

محمود: جس کی تعریف کی جائے وہ اسمِ مفعول محمود کہلاتا ہے۔

اصطلاحی مفہوم

اصطلاحی طور پر حمد اللہ تعالیٰ کی تعریف و توصیف کو کہا جاتا ہے۔ وہ کلامِ موزوں (نظم) جس میں خدائے بزرگ و برتر اللہ تبارک وتعالیٰ کی تعریف بیان کی جائے اُسے حمد کا نام دیا جاتا ہے۔رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

> ''حمد کے معنی اللہ تعالیٰ کی تعریف کے ہیں۔اصطلاح میں حمد وہ نظم ہوتی ہے،جس میں باری تعالیٰ کی صفات اور عظمت وقدرت کا بیان ہوتا ہیاوراس کی ہمہ پہلو تعریف کی جاتی ہے،حمد کا موضوع اتنا وسیع اور متنوع ہے جس قدر خدا اور اس کائنات۔گویا اس کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں۔''(۱)

لغوی طور پر نہ سہی مگر اصطلاحی طور پر اللہ جلّ شانہ کی ذاتِ با برکات کی صفات، تعریف، مدح اور ثنا کرنا حمد کے زمرے میں آتا ہے۔تمام مخلوقاتِ ارض وسماء اپنی زبانِ حال سے توحیدِ صفاتی و معرفتِ صفاتی میں مگن ہیں۔نعرۂ تکبیر اس کی سرشت میں موجزن کر دیا گیا ہے۔مگر حضرتِ انسان اشرف المخلوقات ہونے کے موجب حمد وثناء کا عمل شعوری طور بجالاتا

ہے۔فہم و اِدراک ،شعور،خرد، دانائی ،سوجھ بوجھ،علم وفن ،درایت ، دانش وبینش اور با اختیار ہونے کے باعث شکرگزاری وناشکری میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتا ہے۔

حمد سرائی کے لیے فکرِ فرسائی شرطِ اوّلین ہے۔کائنات اور مافیہا میں عرفان ربِّ کریم کے مظاہر اور تخلیقی وجدان کی خوش سلیقگی لازم ہے۔شاعر کا باطن کے پنہاں بھیدوں سے ظاہر کے عیاں ومسلمّہ حقائق تک مشاہدہ حمد کے لیے کلیدی اہمیّت رکھتا ہے۔خارجی ماحول اور زمین پر پھیلے وسیع آثار کے توسّل وتوسط سے عرفانِ ذاتِ کبریا حاصل کرنا حمد کے لیے لازمی جزو ہے۔

اردو زبان وادب کے روزِ اوّل ہی سے حمد کا آغاز ہو گیا ہوگا۔اردو شاعری کے انتہائی ابتدائی نمونوں ہی سے مدح ربِّ کریم اور حمدِ الٰہی کے نقوش ملتے ہیں۔آثار ونشانات کی مدد سے حقیقت دریافت کرتے ہوئے یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ صوفیا کرام نے صفاتِ خداوند کا تذکرہ اپنے تبلیغی مشن کا جزو لاینفک بنا رکھا تھا۔

رزم ہو کہ بزم ،سفر ہو کہ حضر ،خلوت ہو کہ جلوت ، دن ہو کہ رات ، راحت ہو کہ اضطراب ،ظاہر ہو کہ باطن ،عشرت ہو کہ عسرت ، کامیابی ہو کہ ناکام یابی ،شہید ہو کہ غازی ، تاریکی ہو کہ اجالا ،عروج ہو کہ زوال ، ہر آن اور ہر گھڑی اس اوّل وآخر ذات کی حمد وثناء کا سلسلہ جاری وساری ہے۔تغیّر وتبدّ ل اور زمانی نشیب وفراز کے ہر دور میں واحدہ لاشریک کی صنعتِ کاملہ، قدرت ، حقانیّت ، کمالات اور شہنشاہیت کا تسلسل تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے۔قرآنِ مجید بڑی عمدگی سے مدح ربِّ جلیل کی وسعتوں کا ذکر فرماتا ہے۔

"وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَۃٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ یَمُدُّہٗ مِنْ بَعْدِہٖ سَبْعَۃُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ کَلِمٰتُ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ الرَّحِیْمٌ"(۲)

ترجمہ:"اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں (سب) قلم ہوں اور سمندر (روشنائی ہو) اس کے بعد اور سات سمندر اسے بڑھاتے چلے جائیں تو اللہ کے کلمات (تب بھی) ختم نہیں ہوں گے۔ بیشک اللہ غالب ہے حکمت والا ہے۔"

حمد نگاری کا عمل ابتدئے آفرینش سے جاری وساری ہے۔روزِازل سے تاابد یہ عمل جاری رہے گا۔اس کی حدود کا تعین کرنا ممدوح کا احاطہ کرنے کے مترادِف ہے جو کہ مخلوق کے شمار و حصار سے بالاتر ہے۔خود خالقِ ارض وسماء نے کتبِ سماویہ میں اپنی حمد بیان کی ہے۔ توراتِ مقدس، انجیل مقدس، زبور مقدس، قرآنِ مجید فرقانِ حمید اور دیگر آسمانی صحیفوں میں مختلف مقامات پر مدحِ ربِّ جلیل کے مختصر اور جامع مضامینِ مدحت ملتے ہیں۔

قرآنی حمد میں زمین وآسمان اللہ کی حمد سرائی میں مگن، پورب وپچھّم کے کارساز کا تذکرہ، ربّ کے نام کی پاکی، حاکمیّت اعلیٰ، اسماء الحسنیٰ، لا الہٰ الا اللہ، عالم الغیب، ربّ العالمین، زمین وآسمان کا نور، لاثانی ولافانی، وسیع حکمتوں والا، واحد ویکتا، حیّ القیوم، نعم الوکیل خیرالرّازقین، علیم وحلیم، مولیٰ ومددگار، ہدایت دینے والا، غفّار، ستّار، قہّار، جبّار، رؤف ورحیم کے بے پناہ حکمتوں بھرے الفاظ سے اللہ تعالیٰ کی تعریف وتوصیف کی گئی ہے۔کہیں آیت کی صورت میں، کہیں زیادہ آیات پرمبنی، کہیں سورۃ فاتحہ وسورۃ اخلاص اورآیت الکرسی میں مہتمم بالشاّن انداز میں حمد بیان کی گئی ہے۔زبان سے سرّی وجہری اور قلم سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفاتِ عالیہ کی تعریف کرنا حمد کہلاتا ہے۔حمد شکر کے مترادف تذکرۂ نعمتِ خداوندی ہے۔حمد رحمت وفیضان اور تذکرۂ اسمائے حسنیٰ کی تعریف وتوصیف کے مترادِف ہے۔حمد کے ضمن میں ایک خاص بات ملحوظِ خاطر رکھی جانی چاہیے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی مدح اور تعریف وتوصیف کا بیان ہی ہمارا مطمحِ نظر ہو۔حمد میں مناجات، طلب، صلہ اور دعا کا مضمون باندھا گیا ہوتو وہ نظم دعا ہوسکتی ہے حمدیہ قصیدہ نہیں، تاہم حمدیہ قصیدے میں ان کا اہتمام لازم آتا ہے۔

عنایاتِ رحمٰن کے موضوع میں گلوں کی رنگا رنگی، کلی کی نازکی وتازگی، چمن کا حسن، بہاروں کے نظاروں کی دل کشی اور جذبۂ صادق کی مہک کو لفظوں کا جامہ پہنانے کی سعادت حاصل کرنا بھی حمد ہے۔قرآن مجید فرقانِ حمید خالق ارض وسما کی حمد وثنا سے معمور ہے۔مگر ہمارے شعراء کا ایک بڑا طبقہ قرآن خوانی کی بجائے حمد اور حمدیہ کلام کی طرف رغبت رکھتے ہیں۔ایسا محض تن آسانی کے باعث ہے۔ پندونصائح کا بار اٹھانے سے شاید گریزاں ہیں۔ تاہم یہ ایک ضمنی اور نجی نوعیّت کا معاملہ ہے۔

حمد کے گلدستے میں درج ذیل پھول سجائے جاتے ہیں:

حمد مدحِ ربِّ جلیل ہے۔

حمد منتہائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے۔

حمد بقائے کائنات ہے۔

حمد رازِ نیابتِ الٰہی ہے۔

حمد خیر کی ابتدا ہے۔

حمد خیر کی انتہا ہے۔

حمد عرشِ ربِ کریم کی زینت ہے۔

حمد عطر وعنبر سے عظیم ترین ہے۔

حمد صحرا کے لیے سامانِ استراحت ہے۔

حمد سمندر کی لہروں کی تسبیح ہے۔

حمد لوحِ محفوظ کی دل کشی کا سامان ہے۔

حمد قرآن کا صفحہ نورانی ہے۔

حمد آقائے دو جہاں نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سر کا تاج ہے۔

حمد صحابہ کرام کے قلبِ مطمئنہ کی جان ہے۔

حمد اُلوہیّت کی رفعتوں کا نشان ہے۔

حمد تکوینِ کائنات کا کمال ہے۔

حمد بیت اللہ پر رحمتوں کا نزول ہے۔

حمد کی غذا کے بنا حیاتِ بشریت فضول ہے۔

حمد صبحِ نو کی تہلیل ہے۔

حمد آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑی انسانیت کی بریّت کی دلیل ہے۔

حمد بندہ ناچیز کی اپیل ہے۔

حمد میں پنہاں تحت الثریٰ کی تشکیل ہے۔

حمد ازالہ تکسیر ہے۔

حمد آلِ تطہیر کی تقریر ہے۔

حمد خلفائے راشدین کے اقتدار کی تحدید ہے۔

کلمہ طیبّہ حمد کی وہ قسم ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ و مرغوب ہے۔یقیناً کلمہ طیبّہ میں حمد کا وہ پیرائے وصف ہے جس کی بدولت انسان دائرہ اسلام میں داخل ہو کر مشرف بہ اسلام ہوتا ہے۔اس کلمہ حمد کی ادائیگی سے بندہ اپنے رب کی بارگاہ سے رحمتوں کا امیدوار ہو جاتا ہے۔حمد (کلمہ توحید) کی بدولت ہی بندہ اسفل سافلین سے صاحبِ منزل ہو جاتا ہے۔توحید کا اقرار کر کے بندہ پیوندِ خاک ہونے کے باوجود صاحبِ منزل ہو کر دنیا و آخرت میں سرخرو ہو جاتا ہے۔کلمہ طیبہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حمدِ باری تعالیٰ کا جو ڈھنگ اور سلیقہ اللہ تعالیٰ نے خود سکھلایا ہے وہ انسانی فکر کی تمام تر جولانیوں سے عالی مرتبت اور مقبول ہے۔انسان اللہ تعالیٰ کی حمد و توصیف کماحقّہ بیان کرنے سے قاصر ہے تاہم اپنی دانش و بینش،عطائے ربِّ جلیل اور بصیرت کو بروئے کار لا کر عمدہ قسم کی حمدِ باری تعالیٰ زینتِ قرطاس بنائے۔قرآن کی ابتدا حمد سے اور اذان کی ابتدا بھی حمد سے کی گئی ہے۔حمد اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔

شرک کے بندی خانوں سے نکل کر حمد کے تقاضوں کو پختہ افکار اور اعتقادِ راست کی بنیاد پر بیان کرنا آفاقی پیغام ہے۔صریرِ خامہ سے قادر ومقتدر کی آواز آئے۔''حمد'' لکھنا، پڑھنا،اور اس کا اِدراک صالحین میں سے ہونے کی دلیل ہے۔قرآنِ مجید کا بڑا فصیح و بلیغ پیغام ہے کہ ''فاذکرونی اذکرکم'' پس تم میرا ذکر کرو میں تمھارا ذکر کروں گا۔جو جس قدر حمدِ ربِّ کریم میں محو و مگن ہوگا اسی قدر اس کی قدرومنزلت و مقام و مرتبہ اور اقبال بلند ہوگا۔اللہ تعالیٰ اپنی مدح سرائی کے اعزاز میں اُس بندۂ حمد سرا کی محبت لوگوں کے دلوں میں موجزن کر دے گا۔

حمد دنیا کے طول وعرض میں ہر زبان اور ہر صنفِ ادب میں اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ کہی جارہی ہے۔وظیفۂ حمدِ ربِّ جلیل ہر صاحبِ ایمان اور صاحبِ علم و دانش پر لازم ہے۔ اردو زبان و ادب میں حمد نگاری کا آغاز اردو کے آغاز اور روزِ اوّل سے ہو گیا تھا۔

ثواب اور توشۂ آخرت کی نیّت سے حمد کا اہتمام کیا جاتا تھا۔اردو میں پہلی حمد

فخر الدیّن نظامی بیدری نے لکھی۔ حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر جیسے جلیل القدر صوفیا کے ہاں بھی حمد کے نمونے ملتے ہیں۔

حمدیہ قصیدہ کیا ہے؟

وہ منظوم کلام جس میں غزلیہ ہیئت اور قصیدے کے ارکان (تشبیب، گریز، مدح اور دعا) کو قصداً بروئے کار لاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی مدح کو موضوعِ سخن بنایا جائے، حمدیہ قصیدہ کہلاتا ہے۔

اردو حمدیہ قصیدے کی روایت

اردو شاعری میں قصیدے کو کلیدی درجہ حاصل ہے۔ اصناف شاعری میں قصیدہ سب سے زیادہ پُر شکوہ صنف گردانی جاتی ہے۔ قصیدے کی اہمیّت سے انکار ممکن نہیں۔ قصیدہ وہ صنفِ سخن ہے جس کے دامن میں اتنی وسعت اور لچک ہے کہ وہ اپنے موضوعات کا جُزوی اور کلی طور پر مدلّل اور پُر مغز ابلاغ کر سکتا ہے اور جس کی بدولت بیان کردہ موضوع اپنی تمام تر فکری وسعتوں اور زمانی تقاضوں کا احاطہ کر سکتا ہے۔ عُلوِ فکر اور سوچ کے نئے دریچوں کو بڑی کمال فنیّ مہارت سے تسلسل کے ساتھ بیان کر کے نئی جہاتِ علم وفکر کو پروان چڑھایا جاسکتا ہے۔ شاید یہی سبب ہوگا کہ ایک زمانے میں قصیدہ مقبول ترین صنف ادب کے طور پر جانا جاتا رہا ہے۔

مگر پھر بھی قصیدہ کی ادبی اہمیّت کو پسِ پشت ڈال کر حقائق سے چشم پوشی کی گئی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ قصیدے کی روایت میں بطور صنفِ سخن نشیب وفراز کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ کبھی بادشاہوں کی خوشامد میں قصیدے کو کھپایا گیا تو کبھی امراء اور رؤسا کی مدح سرائی میں زورِ بیان دکھایا گیا۔ کبھی ہجو گوئی، ذم، طعن و تشنیع اور دشنام طرازی کرنے کے لیے قصیدہ نگاروں نے اس صنف کا استعمال کیا۔ اس کے دامن میں کبھی آشوب زمانہ کا ذکر کیا گیا۔ قصیدہ اپنے اندر شعور و وجدان، حُریّت و جرأت، جذبہ ایمانی کی تلاطم خیز موجوں اور جذبۂ احساس کے ساتھ ساتھ حیات و کائنات کی پُر اسرار انتہاؤں اور وسعتوں کو تسخیر کرنے کی صلاحیّت رکھتا ہے۔ اردو شعروادب میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ بابرکات سے والہانہ محبّت کا جذبہ چشمۂ شوق کی طرح اُبلتا ہوا ملتا ہے۔ اردو حمدیہ قصیدہ ایک دقیع اور اعلیٰ مقام ومرتبہ کا حامل

ہے جس میں علم وعرفان کی جہات ،فلسفۂ توحیداورزندگی کی منازل کا قابلِ قدرذخیرہ موجود ہے۔ قصیدہ اپنے وجود کے روزِ اوّل سے ہی دیگر اصنافِ سخن کی نسبت تہذیب وتمدّن کا علمبردار سمجھا جاتا ہے اور بحیثیتِ مسلمان ہماری تہذیب وتمدّن کا مرکز ومحور مدحِ ربِ جلیل ہے۔ اردو حمدیہ قصیدہ نگاری میں مسلمان شعراءکرام نے کلیدی نوعیّت کا کردار ادا کیا ہے۔انھوں نے اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات وصفات کو بھی موضوعِ سخن بنا کر عقلیت پسندی اور تثلیث کا ارتداد کیا ہے۔

اردو حمدیہ قصیدہ اپنے آغاز سے حال تک کے سفر کے دوران میں زورِ بیان کے مختلف اسالیب سے مزیّن رہا ہے۔اس صنفِ سخن کی حقانیّت ،جلالیّت ، جامعیت ،اوجِ کمال اور وسعت اٹل حقیقت ہے۔کلمہ طیبہ حمدیہ قصیدے کے حرفِ آغاز کی مانند ہمارے ماتھے کا جُھومر اور سر کا تاج ہے کیوں کہ اللہ باری تعالیٰ ہمارا خالق و مالک ہے اور ہم مخلوق ہونے کے ناتے اس کی حمد وتوصیف اپنے لیے توشۂ آخرت سمجھتے ہیں۔حمدیہ قصیدہ نگاروں نے اپنے عقیدۂ توحید کی روح کے مطابق زمین وآسمان کے نور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفاتِ عالیہ کو موضوعِ سخن بنا کر ثنویّت وتثلیّث اور مظاہر پرستی کا رد کیا۔ اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کا مآخذ قرآنِ مجید، احادیث ،علومِ شریعہ، استدلال واستفہام اور مظاہر فطرت پر مبنی ہے۔

اردو زبان وادب میں حمدیہ قصیدہ نگاری کا مطالعہ کرنے سے قبل دیگر مذاہب میں حمد کے تصور کا اجمالی ذکر ضروری ہے۔ ہندومت اپنے عقیدے کے مطابق حمد سرائی کرتے ہیں۔ اسی طرح سکھ مذہب کے پجاری بھی اکال کی صورت میں کارسازِ جہاں کی مدح وتوصیف کرتے ہیں۔اکالی سکھ قوم کا ایک فرقہ جس کا نعرہ ''ست سری کال'' ہوتا ہے۔اسی طرح دیگر مذاہب کے ماننے والے جن میں اہلِ کتاب بھی شامل ہیں ان میں بھی حمدِ خدائے بزرگ و برتر کا تصور پایا جاتا ہے۔تورات مقدس ،زبور مقدس اور انجیل مقدس کتب سماویہ ہونے کے باعث توحید اور وحدتِ ذاتِ ربِّ جلیل کا منطقی اور مفصل ذکر بیان کرتی ہیں۔عقلیت پسندی کی دور سے قبل کے تمام مکتبہِ فکر، مذاہب اور ادیان میں خدا کا تصور موجود رہا ہے۔قدیم مصری تہذیب ، گندھارا تہذیب اور موہنجوداڑو کے احوال وآثار ،کتبوں اور تختیوں پر کندہ عبارتیں حمدیہ کلام اور حمدیہ اشعار کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔قدیم یونانی اہلِ علم ودانش اپنی تصانیف کے

شروع میں ہدیہ تبریک کے طور پر حمدیہ کلام شامل کرتے تھے۔ جواس موقف کی تائید کرتا ہے کہ تمام یونانی ادیب شاعری کی دیوی ’’Muse‘‘ سے مدد طلب کر کے اپنے آپ کو صاحبِ مرادتصور کرتے تھے۔عربی زبان وادب ہو کہ ایرانی تہذیب وتمدن اورثقافتِ ایرانی کا منظر نامہ ہوحمد وتوصیف کا عنصر لازمی پایا گیا ہے۔قدیم ترین پنجابی زبان وادب کی شعری روایت اورابتدائی منظر نامے سے لے کر دورِ وسط تک اور حالاتِ حاضرہ تک کا سفراس صنف کی اہمیت کا مژدہ سناتا ہے۔

حضرت بابا فریدالدّین مسعودِ گنج شکر ہو کہ میاں محمد بخش اپنے کلام کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی حمد،توصیف اور مدح سرائی کرتے تھے۔بحیثیت انسان ہماری جبلّت اور سرشت میں شامل ہے کہ ہم کسی نہ کسی کو اپنا الہٰ،معبود،خدا، دیوتا،مشکل کشا اور حاجت روا مانتے ہیں اور بالخصوص مصیبت اور پریشانی کے دنوں میں ان کے سامنے اپنے دکھوں اور غموں کو پیش کر کے ان کے مداوا کی التجا کرتے ہیں۔اس تناظر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ تمام مکتبہ فکر کے ہاں خدا کا تصور پایا جاتا ہے اوراسی معبود کی پُوجا کی خاطر مدح وستائش بھی کی جاتی ہے،اسی طرح سے قدیم اردو شاعری میں قصیدہ ہو کہ مثنوی، داستان ہو کہ حکایت ان کا آغاز حمدیہ اشعار سے ہوا ہے۔اردو شاعری کا مرکز دکن رہا ہے یہی وجہ ہے اردو کے ابتدائی نقوش اسی مقام پر تشکیل پائے۔قلی قطب شاہ اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر کے طور جانے جاتے ہیں۔انھوں نے اپنے قصیدوں میں حمد ونعت کے اشعار کو حصولِ برکت کے لیے شامل کیا لیکن اب تک کی تحقیق کی مطابق پہلا دستیاب حمدیہ قصیدہ دکن کے بادشاہ علی عادل شاہ ثانی شاہی کا ہے جو بیجاپور میں برسرِ اقتدار تھا۔

اردو اصنافِ شاعری کی تمام اصناف کے ابتدئی نقوش دکن کے طُول وعرض میں ملتے ہیں۔ دکن جس طرح دیگر اصنافِ ادب کا مرکز ومحور بنا اسی طرح دکن کی علمی وادبی لیبارٹری میں قصیدے کی صنف کو جنم دیا گیا۔ یوُں قصیدہ دکن کی سرزمین سے سبزِ نوخیز کی طرح نخلِ نوخیز بن کر ادبی منظر نامے کی زینت بنا۔ مزید برآں جس سے اس صنف کو تقویّت ملی وہ اسلام اور مسلمانوں کا دکن اور دکن کی تہذب وثقافت پر گہرا اثر ہے۔مسلمان مبلغین،صوفیائے کرام، سیّاح،واعظین اور فاتحین کا اس علاقے میں کلمہ توحید اور نعرۂ تکبیر بلند کرنا تھا جس سے حمدیہ قصیدہ اور حمدِ باری تعالیٰ اپنی ابتدائی صورتوں میں پنپنے لگی۔نثر نے بھی اپنے ارتقائی سفر کو کامیابی سے طے کرنا

جاری رکھا اور مخلوط زبانوں کے ارتباط سے اپنی کامیابی کیا مکانات روشن کیے۔ایسی صورت میں بہمنی دور میں شاعری بھی اپنی ارتقائی منازل طے کر رہی تھی اور قصیدے کے نقوش گہرے ہو رہے تھے۔ اس حوالے ڈاکٹر ایم کمال الدین نے نصیر الدین ہاشمی کا یہ قول اپنی کتاب میں نقل کیا ہے:

''بہمنی دور میں اور اصناف کے ساتھ قصیدے بھی اپنی واضح شکل اختیار کر چکے تھے۔قصیدوں میں جو لوازم اس کے مخصوص تھے یعنی تمہید، گریز، مدح، اور خاتمہ ان ہی کی پابندی کی جاتی تھی۔''(۳)

دکنی دور

دکنی دور کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اردو زبان و ادب کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر قلی قطب شاہ کا تعلق دکن سے تھا بلکہ قلی قطب شاہ شہنشاہِ ریاست تھے۔قلی قطب شاہ اعلیٰ پائے کے شاعر اور دل کش طرزِ تحریر کے مالک تھے۔اُن کے قصائد میں حمد اور مناقب پائے جاتے ہیں۔انہوں نے دکنی دور کو تاب ناک بنایا۔یہی وجہ ہے کہ دکنی دور کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کا ذکر ضروری ہو جاتا ہے۔انھیں دکنی دور میں نمایاں مقام حاصل ہے لیکن اردو حمدیہ قصیدے کے سلسلے کا درخشندہ ستارہ اور نشان اوّل عادل شاہ ثانی شاہی ہے۔اب تک دستیاب قصائد میں عادل شاہی حکومت کے آٹھویں حکمران علی عادل شاہ ثانی شاہی کو اردو حمدیہ قصیدہ نگاری میں اوّلیت حاصل ہے۔ جو ان کے لیے اعزاز اور باعثِ شرف ہے۔انھوں نے دیگر اصنافِ شاعری کے علاوہ ایک نونیہ اردو حمدیہ قصیدہ بھی لکھا۔ڈاکٹر ایم کمال الدین اُن کے متعلق رقم طراز ہیں:

''عادل شاہی حکومت کے آٹھویں فرماروا علی عادل شاہی (۱۰۳۷ تا ۱۰۶۷) کا کلیات دستیاب ہو چکا ہے۔اس میں علاوہ اور اصناف کے چھ قصائد بھی ہیں۔اور آخر میں بارہ اماموں کی منقبت ہے۔جو ''در منقبت دوازہ امام'' کے عنوان سے درج ہے۔اس کے سبھی قصیدے حمد و منقبت میں ہیں۔''(۴)

علی عادل شاہ ثانی شاہی نے بڑی عمدگی سے حمدیہ قصیدے میں خلوص، راست گوئی، ادبی طمطراق اور علوِ فکر سے مضمون باندھا ہے۔فلسفیانہ خیالات اور برمحل الفاظ کے موتیوں کا

چناؤ اور جڑاؤ ان کی فنّی بصیرت ،مہارت ،مذہبی جوش وولولے اور عقیدت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اُنھوں نے توحید کی منطق کو مظاہرِ فطرت اور نظامِ کائنات سے کشید کیا ہے۔

ان کے حمدیہ قصیدے میں عقل کے موضوع پر آٹھ اشعار موجود ہیں جبکہ عقل کا لفظ گیارہ بار استعمال ہوا ہے۔ جو اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ عقل وشعور کا وجود اہمیّت کا حامل ہے۔عقل کو اگر عشق کی بنیادوں پر استوار کیا جائے تو عرفانِ ذاتِ ربِّ جلیل کے در وا ہونا شروع ہوجاتے ہیں اور اندازِ نظر ہی بدل جاتا ہے۔شاعر کے ہاں لفظ عقل کا بار بار استعمال معنی خیز ہے۔

شاعر کا قوّتِ مشاہدہ مبنی بر حقیقت ہے۔رموزِ کائنات اور مظاہرِ فطرت کے پنہاں رازوں کو بڑی فہم وفراست اور عمیق نگاہی سے عیاں کرنے کی سعی کی ہے۔کلیاتِ شاہی ستائیس اشعار پر مشتمل حمدیہ قصیدہ علم وعرفان کی منازل کو طے کرنے کے لیے فلسفہ عقل کا دامن تھامنے کا درس دیتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کے شاہکار کو عام آنکھوں پر آشکار کیا اور مدحِ ربِّ جلیل بہت عمدہ انداز میں بیان کی گئی ہے۔اشعار ملاحظہ ہوں:

آب و آتش ملا، خاک و ہوا تے کلا
چار عناصر لگا، دیہ سنواریا ہمن
دور پھریں جو تمام سجدہ کریں صبح شام
لے کے ستاریاں سنگات چاند سورج ہور گگن
نور کا جھلکات دے حوُر و پری لگ سنوار
سات طبق سرگ کے پور رکھیا ذوالمنن (۵)

علی عادل شاہ ثانی شاہی کا یہ قصیدہ مقامی ادبی رنگ کا حامل ہے۔جس میں مقامی طرزِ تکلّم، اسلوب اور رنگ غالب ہے۔اس حمدیہ قصیدے کا مطلع دستیاب نہیں ہُوا ہے۔یہ سر بریدہ قصیدہ اُن کی شعری ریاضت اور اُستادانہ رنگ کا مظہر ہے۔زینت ساجدہ ان کے بارے میں رقم طراز ہیں:

’’علی نہ صرف شاعر اور شاعروں اور عالموں کا مربی تھا۔ بلکہ اُس کو خود علوم وفنون میں دست گاہ حاصل تھی۔‘‘(۶)

قصیدے کے لیے علوِ خیال ،شان وشوکت ،پُر شکوہ الفاظ ،ترفعیّت ،زورِ بیان اور

ابلاغ جیسی صفات لازم خیال کی جاتی ہیں، تاہم ان کا کلام تصنّع اور اسلوب کی کچھ کمزوریوں کے باعث بھی قابلِ قدر اور ابتدائی اثاثہ ہے۔ شاہی کے حمدیہ قصیدے میں مناجات کی لجاجت، الحاح، جاہ وجلال و جمال کے اوصاف کا موضوع عمدگی سے نبھایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قلبِ مومن کو عشق کے نور سے مستنیر کیا ہے تا کہ وہ روشن دماغ اور قلبِ سلیم سے ثنائے کبریا کرے اور روحانی طور پر قلبِ مطمئنہ سے سرشار ہو سکے۔ بیجاپور کے قصیدہ گو شعراء میں علی عادل شاہ ثانی شاہی امتیازی مقام پر براجمان ہیں۔ موضوعات کا تنوّع ہو کہ فکری وفنّی محاسن، مقامی لب ولہجہ، ڈکشن ہو کہ ژرف نگاہی دکنی قصیدے میں علی عادل شاہ ثانی شاہی قصیدے اس کا اعلیٰ نمونہ پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ کلیاتِ شاہی کی مرتب مبارزالدین رفعت لکھتے ہیں:

> ’’شاہی بیجاپور کا ایک بلند پایہ قصیدہ نگار ہے اور اس صنف کا مزاج شناس معلوم ہوتا ہے۔‘‘ (۷)

غواصی گولکنڈہ کا شہرت یافتہ شاعر تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کا سفیر اور اس کے دربار کا ملک الشعرا ہونے کا شرف رکھتا ہے۔ غواصی پیشے کی اعتبار سے تو سپاہی تھا مگر اس کی شہرت قلم کا سپاہی ہونے میں ہے۔ اردو زبان وادب کے دیگر شعرا کی طرح غواصی کی بھی مُلا وجہی سے معاصرانہ چشمک تھی۔ شاید اس کی وجہ غواصی کی قادرالکلامی، زبان و بیان کو کرداروں کے مطابق نبھانا اور دکنی سکول کے رجحانات کی نمائندگی ہے۔ وہ مختلف فطری مناظر، کیفیّات حسن وقدرت، سراپا موضوع۔

اردو کو عادل شاہی حکمرانوں کے سرکاری زبان کا درجہ دینے کے باعث اس کی جڑیں دکن میں مضبوط ہو رہی تھی۔ دکنی اردو دراصل اردو کی قدیم شکل کی جدید صورت میں ڈھلنے کا نام ہے۔ ایسے میں کچھ افراد نے اردو کو درجہ بہ درجہ ابتدائی شکل میں ڈھالنے کا کام انجام دیا۔ جس میں غواصی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ غواصی کی کلیات میں جتنے بھی قصائد ہیں ان کا آغاز اس نے حمدیہ اشعار سے کیا ہے جو کہ غواصی کی مذہبی عقیدت اور برکت کے حصول کا ذریعہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ دکن کے سب سے بڑے قصیدہ نگار تو نہیں ہیں، تاہم ان کے قصیدوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ اس ضمن میں وہ سب سے بڑے قصیدہ نگار کہلائے جانے کے حق دار ہیں۔ انھوں نے صنفِ قصیدہ کو اپنے دور کے دیگر شعرا کی نسبت زیادہ خوش اسلوبی اور

عمدگی نبھایا ہے۔کلیاتِ غواصی میں غزلوں کے علاوہ قصائد بھی ملتے ہیں تاہم با قاعدہ حمد یہ قصیدہ دستیاب نہیں ہوا۔اُردو حمد یہ قصیدے کی روایت میں غواصی نے بھر پور تمہید یہ حمد یہ قصیدہ نہیں لکھا، تاہم اس کے قصیدوں میں حمد کے خوب صورت نمونے پائے جاتے ہیں جس کے باعث غواصی کا ذکر روایت کا حصّہ ہے لیکن انھیں اردو حمد یہ قصیدہ نگار قرار نہیں دیا جا سکتا۔

غواصی کے بارے میں محمد علی اثؔر لکھتے ہیں:

''غواصی نہ صرف دبستانِ دکن کا ایک مقبول ترین شاعر تھا، بلکہ اس کی شاعرانہ عظمت کے چرچے شمالی ہند میں بھی ہونے لگے۔''(۸)

غواصی نے با قاعدہ درباری قصیدے لکھ کر اس میں اوّلیت کا درجہ پایا مگر مداحی برائے مداحی کے قائل نہیں۔اُن کے ہاں مذہب اور مذہبی فرائض کی ادائیگی کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔وہ صاحبِ اُسلوب قصیدہ نگار تھے۔وہ جذبات میں ڈوب کر قصیدے لکھتے اور یہ کیفیّت حمد،نعت،اور منقبت میں مزید غالب آجاتی۔وہ اپنے ایک قصیدے کی تشبیب میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا یُوں بیان کرتے ہیں۔شعر ملاحظہ ہو:

تحت الثریٰ تھے تا بہ ثریا رواج دے
قدرت ہر ایک چیز میں اپنی عیاں کیا (۹)

غواصی کے قصائد میں مدح،حُسن طلب اور دعا کی ارکان کو بھر پور برتا گیا ہے مگر حمد میں حمد یہ قصیدے کے ارکان کا اہتمام نہ ہونے کے باعث ہم غواصی کو اردو حمد یہ قصیدہ نگاروں میں باضابطہ شمار کرنے سے قاصر ہیں۔غواصی نے ایک اور قصیدے میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور وحدانیت کو موضوعِ سخن بنایا ہیاس کی ہاں اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ جلیل القدر وحدہ لاشریک ہے۔سورۃ الاخلاص کے مضمون سے مزیّن حمد میں دلکش پیرائے میں خالقِ کائنات کی صفات اور مدح وتعریف بیان کی گئی ہے۔حمد کا شعر ملاحظہ ہو:

آپ ہو آیا اپے ،کوئی نہ لیایا اُسے
سب کوں لے آیا سووے کوئی نہ شریک اُس نہ یار(۱۰)

نصرتی ممتاز مثنوی نگار کی حیثیّت سے جانے جاتے ہیں وہ مثنویوں کی علاوہ قصائد

میں بھی تخصیصی درجے پر فائز ہیں۔قصیدہ نگاری کے لیے حسِ فہم وفراست، دانش وبینش، عمیق نگاہی شعورو ادراک، بلند خیالی، بُنت اور تسلسل وارتباط کی ضرورت ہوتی ہے۔وہ اس ریاضت کی اہمیت سے بخوبی آگاہ تھے۔علاوہ ازیں نصرتی نے قصیدوں میں ہجو گوئی کو باقاعدہ استعمال کر کے اس میں اوّلیت حاصل کی۔نصرتی کے قصائد فطری نوعیّت کے حامل معلوم ہوتے ہیں۔وہ تمام اصنافِ سخن میں دسترس رکھتے تھے۔وہ اصنافِ شاعری میں مثنوی، قصیدہ، غزل، رباعی، تاریخ، قطعہ اور ہجو نگاری میں کمال رکھتے تھے۔مولوی عبدالحق ملاّ نصرتی کی قصیدہ گوئی کے ضمن میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''علاوہ مثنوی کے قصیدہ گوئی میں بھی اس کا پایا بہت بلند ہے اور اس صنف میں قدیم اردو کا کوئی شاعر اسے نہیں پہنچتا۔شوکتِ لفظی، علوِ مضامین اور زورِ بیان جو قصیدے کی خاص صفات ہیں وہ نصرتی کے قصائد میں بخوبی پائی جاتیں ہیں۔'' (۱۱)

نصرتی کا شہید کیا جانا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ معاصرین اور درباری اس کی شہرت کی وجہ سے حسد کا شکار ہو گئے ہوں گے۔علم وفضل اور ادبی مقام ومرتبہ کا مقابلہ نہ کر سکنے والوں نے کم ظرفی سے اپنی راہ صاف کی ہوگی۔

ان کا قلم بڑی عمدگی سے چلتا تھا۔انھوں نے دیگر اصنافِ شاعری کی حمد میں بھی طبع آزمائی کی۔انھیں باضابطہ اردو حمدیہ قصیدہ نگاروں کی فہرست میں تو شامل نہیں کیا جا سکتا۔تاہم ان کے کلام میں حمدیہ کلام روایت کا حصّہ ہے۔اُن کے ہاں ایک قصیدے یومِ عاشورہ کا آغاز حمد کے عمدہ نمونے سے ہوا ہے۔شعر ملاحظہ ہو:

کہتا ہوں اول حمد میں عالم کے سرجن ہار کا
افلاک کا اونچا چھجا باندیا ہے کس بستار کا(۱۲)

نصرتی کے ہاں مسلم روایات، تہذیب وتمدن کے علاوہ مقامی ہندی روایات کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ہاں البتہ ایسا مسلم شعراء کے ہاں ہندو روایات کے اثرات اور ہندو شعراء کے ہاں مسلم تہذیب وتمدن اور فکر کا پایا جانا اچنبھے کی بات نہیں۔نصرتی کے ہاں حمدیہ

قصیدے کے تمام ارکان کا اہتمام نہیں ہے اس لیے انہیں اردو حمدیہ قصیدہ نگار قرار نہیں دیا جاسکتا۔

وؔلی دکنی شمالی ہند اور دکن کے دوراہے پر کھڑا وہ ادیب ہے جو گزشتہ اور فردا کا رازداں اور نباض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مقلدین کی ایک بڑی جماعت دلّی اور شمالی ہند میں پائی جاتی تھی۔ وؔلی دکنی جدید اردو غزل کا باوا آدم کہلاتا ہے مگر قصیدہ نگاری میں اپنے ہم عصروں کے ہم پلہ شمار نہیں کیے جاتے، تاہم خیال آفرینی اور مضمون آرائی کے ماہر تھے ویسے بھی اورنگ آباد میں ان کی عقیدت سلسلہ قادریہ سے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں مذہبی عقیدتوں کے موضوعات میں نعت ومنقبت کے مضمون بھی پائے جاتے ہیں۔ ولی کی قصیدہ نگاری کے بارے میں ڈاکٹر محمود الٰہی رقم طراز ہیں:

> ''وؔلی کی آزاد طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ مغلیہ سلطنت کے امرا سے جلبِ منفعت کے لیے وابستگی اختیار کریں۔ اس لیے وہ مدحیہ قصیدے تو نہ کہہ سکے لیکن جس شاعر کے شعر عرش پر قدسی پڑتے ہوں، جس کی فکرِ رساحدِ بشر سے باہر ہو۔ جو بحرِ معانی کا غواص ہو۔ جس کے شعر میں شرابِ پرتگال جیسا اثر ہو جس کی گفتگو ہر جانب تحفہ میں لائی جاتی ہو اور جس کے سینے میں ہزاروں گوہرِ معانی ہوں اور اپنی قادرالکلامی اور شاعرانہ عظمت وجامعیت کا سکّہ بٹھانے کے لیے قصیدے کیوں نہ کہتا۔'' (۱۳)

انھوں نے اردو شاعری کو فکر کی پرواز اور خیال کی نُدرت سے نئی زندگی بخشی ہے۔ حمد باری تعالیٰ ایمان کا حاصل ہے اور اس نگینے کو ذکرِ الٰہی سے نکھارنا اسے باکمال بنا دیتا ہے۔ ولی دکنی نے باقاعدہ اردو حمدیہ قصیدہ تو نہیں لکھا مگر وہ حمد کے چراغ جلا کر ان سے دنیا وآخرت کی بھلائی کی روشنی کشید کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کلیات میں ایک قصیدہ حمد، نعت اور منقبت کے مضمون سے مزیّن ومستنیر ہے۔ وؔلی دکنی کے قصیدے لامیہ میں حمد کے آثار پائے گئے ہیں۔ نمونے کے طور پر حمد کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

لائق حمد نئیں ہے اس بن اور
آسماں اور زمیں کے سب ساکن

یاد کرتے ہیں اس کوں ہر پل پل
شکر اس کا محیط اعظم ہے
وہ ہے سلطان بارگاہِ ازل (۱۴)

ولؔی دکنی کے نزدیک عشق کی پہلی منزل عشق مجازی وانسانی حُسن ہی عشق حقیقی کے لیے محرّک اور کلیدی درجہ رکھتا ہے۔علی عادل شاہ ثانی شاہؔی دکنی دور کا واحد با قاعدہ اردو حمدیہ قصیدہ نگار ہے۔غواصؔی،نصرتؔی اور ولؔی دکنی حمدیہ قصیدہ نگار نہیں۔ان کا تذکرہ اس لیے کیا گیا ہے تا کہ حمد اور حمدیہ قصیدے میں پایا جانے والا صنفی اور ہیئتی فرق سمجھا جا سکے۔

اردو زبان وادب میں ادوار کی درجہ بندی ہمیں اپنے دور کے ادبی کارناموں کی تفصیل فراہم کرتی ہے۔ادبی منظر نامہ اپنے دور کی انفرادی اور اجتماعی تہذیب وثقافت،سوچ، فکر اور طرزِ زندگی کی حقیقی تصویریں پیش کرتا ہے۔خوشحالی کے دور میں فرحت، استراحت، فارغ البالی،لہو ولعب اور مسرت وشادمانی کے مضمون کو شعری قالب میں ڈھالا جاتا ہے جب کہ افراتفری اور گراوٹ کے دور میں آشوبیہ اور غم والم کے موضوعات کو کلام میں سمویا جاتا ہے۔مسلمان ہر دو حالتوں میں اپنے خالق ومالک کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوتا ہے۔اُسی کی مدح وتوصیف بیان کر کے روحانی تسکین اور سرور آگیں جسمانی کیفیت محسوس کرتا ہے۔ ہر دور اللہ تعالیٰ کا ہے اور ہر دور میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان ہوتی رہی ہے۔دیگر اصنافِ ادب کی طرح صنفِ قصیدہ کی ہیئت میں بھی اللہ تعالیٰ کی مدح کا سلسلہ جاری وساری ہے۔

میر وسودا کا دور

میرؔ وسوؔدا کے دور کو اردو زبان وادب کی تاریخ کا زریں دور قرار دیا جاتا ہے۔سوؔدا نے قصیدہ وہجو گوئی میں اور میر تقی میرؔ نے غزل گوئی میں اپنا لوہا منوایا۔ان کی خدمات کی بدولت اردو زبان میں اصلاح اور روانی پیدا ہوئی۔دونوں اپنے اپنے شعبہ میں استاد کے درجے پر فائز تھے۔قصیدہ نگاری میں مرزا محمد رفیع سوؔدا یکتا تھے تاہم ان کے کلام میں حمدیہ قصیدہ نہیں ملتا۔

میرؔ وسوؔدا کے دور میں قصیدے کے حوالے سے ڈاکٹر ایم کمال الدین یوں رقمطراز ہیں:

”سوؔدا و میرؔ کے عہد میں اور بھی کئی قصیدہ نگار شعرا تھے۔ان میں

بعض کا کلام تو ملتا ہے لیکن زیادہ تر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور
ہیں۔سوداؔ اور میرؔ کی دیوہیکل ادبی شخصیت کے سامنے ان لوگوں کی
شاعری کا چراغ ٹمٹماتا رہا اور ان کی قصیدہ نگاری کے متعلق زیادہ تر
تذکرے بھی خاموش ہیں۔'' (۱۵)

اس دور کے دستیاب قصائد میں سے اردو حمدیہ قصیدہ نگاروں کی تعداد بہت کم ہے۔تاہم اس صنف میں لکھنے والوں نے اس میدان میں طبع آزمائی کرتے ہوئے توحید کے فلسفے کو بیان کر کے علم و فضل کا قابلِ قدر سرمایہ فراہم کر دیا ہے۔

میرؔ و سوداؔ کے دور میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری میں جعفر علی حسرتؔ، غلام حسین ہدایتؔ، میر تقی میرؔ کے بھانجے میر محسن تجلّیؔ اور مرزا مظہر علی خان ولاؔ نے عقیدت و محبت سے بھرپور حمدیہ قصائد لکھے۔یوں دیگر اصنافِ شاعری کی طرح اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کے بھی اس دور میں عمدہ نمونے پائے گئے ہیں۔اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کی روایت میں میرؔ و سوداؔ کے دور کی خدمات پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔''میر جعفر علی حسرتؔ کی وفات کے بارے میں ڈاکٹر سعادت سعید لکھتے ہیں:

''میر جعفر علی حسرتؔ (م:۱۷۹۱ء) کا تعلق بنیادی طور پر دہلی سے تھا۔''(۱۶)

اُن کا اصل شعبہ اور میدان غزل گوئی ہے تاہم ان کے کلیات میں آٹھ قصائد بھی موجود ہیں جو ان کے صنفِ قصیدہ سے گہری رغبت کا ثبوت ہے۔اُن کا پہلا قصیدہ در حمد و نعت و منقبت و مدح حسنین کے نام سے معنون ہے اس قصیدہ میں مختصر سی تشبیب کا بھی اہتمام کیا گیا ہے لیکن حمدیہ قصیدے کے لیے رائج چار ارکان (تشبیب، گریز، مدح، دعا) کا اہتمام نہ ہونے کے باعث جعفر علی حسرتؔ کو اعلیٰ تر درجے کا اردو حمدیہ قصیدہ نگار قرار نہیں دیا جاسکتا۔تاہم اس روایت میں انھیں قصیدے کے ابتدائی نمونے کے باعث شامل کیا جا رہا ہے۔حسرتؔ نے دیگر اصنافِ شاعری میں بھی اندازِ بیان کی عمدگی کے نمونے چھوڑے ہیں۔قصیدے میں حمد کے اشعار ملاحظہ ہوں:

سبحۂ سجادہ و اسلام و حرم چاروں ایک
عاشق و بتکدہ و کفر و صنم چاروں ایک
یہ فلک وہ ہے کہ جس سے بہر موجودات
ملیں عنصر تو کریں روبعدم چاروں ایک (۱۷)

ان کے فن کی مشاقی اور علوِ فکر کے باعث چاروں ایک کا استعمال خوبصورت اور قابلِ ستائش ہے۔جس میں نیا پن اور مناسب موازنہ ہے۔یہ ان کا قوت مشاہدہ ہے کہ وہ کھوج لگا لگا کر چاروں ایک کی درجہ بندی کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔دو چشم ،دو ابرو چاروں ایک ،آبشارِ چمن، جامِ مے، شبنم اور ابرو چاروں ایک اور اس طرح سے ہر شعر مکمل مضمون کا عکاس ہے۔اللہ تعالیٰ کی حمد و توصیف اور خلاقی کو بڑی عمدگی سے زینتِ قرطاس بناتے ہیں۔

غلام حسین ہدایت نے ''گوہرِ ثنا'' کے عنوان سے بڑا عمدہ قصیدہ لکھا ہے جس میں بارہ مطلعے ہیں۔انھوں نے ''گوہرِ ثنا'' قصیدے کا آغاز حمد سے کیا ہے۔جس سے ثنائے رب جلیل کے علاوہ اللہ تبارک و تعالیٰ کو مشکل کشا قرار دے کر توحید کے موضوع کو بڑی خوب صورتی سے سمویا ہے۔مطلع اوّل ملاحظہ ہو:

ہزار شکر بہ درگاہِ پاک یزدانی
ہے جس کے فضل سے سب مشکلوں کو آسانی (۱۸)

ان کے ہاں عمیق نگاہی اور شعری ریاضت پائی جاتی ہے۔البتہ ان کے ہاں حمدیہ قصیدے کے ابتدائی آثار تو ملتے ہیں تاہم انھیں اعلیٰ پائے کا حمدیہ قصیدہ نگار قرار نہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے قصیدے کی مروجہ ہیئت کو پُوری طرح استعمال نہیں کیا لیکن انھیں حمدیہ قصیدہ کے بانیان ہونے کا شرف حاصل ہے۔انھوں نے حمدیہ قصیدے کے خدوخال متعیّن کیے۔

میر محسن تجلّی کا ایک حمدیہ قصیدہ دستیاب ہوا ہے۔جو پنجاب یونیورسٹی لاہور کی طالبہ سیّدہ نادرہ زیدی کے ایم اے اردو کے مقالے میں شامل ہے۔میر محسن تجلّی کی وفات کے بارے میں ڈاکٹر سعادت سعید لکھتے ہیں:

''میر محسن تجلّی (م : ۱۷۹۸/۱۷۹۹ء)مشہور شاعر محمد حسین کلیم (جنہوں نے فصوص الحکم کے چند ابواب کا ترجمہ بھی کیا تھا) کے بیٹے تھے۔''(۱۹)

میر تجلّی کو خدائے سخن میر تقی میرؔ کے بھانجے ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں اس ''اُم الاصناف'' کو بڑی فنّی پُرکاری اور صنفی اعتبار سے بڑی عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔قصیدہ نگاری ''اُم الاصناف'' ہونے کی وجہ سے دیگر اصنافِ شاعری نے

اس کے بطن سے جنم لیا ہوگا جیسا کہ غزل۔

میر محسن تجلی نے قصیدے کے اجزائے ترکیبی کا استعمال کیا ہے۔اس سے قصیدہ گو نے اپنی علمیّت اور قادرالکلامی کے جوہر دکھانے کی بھر پور سعی کی ہے۔اجزائے ترکیبی کے اہتمام والتزام کے باعث میر تجلی کے اس حمد یہ قصیدے کو اردو حمد یہ قصیدے کی روایت میں اہم مقام حاصل ہوا ہے۔انھوں نے اپنے قصیدے کو پُر جوش بنانے کے لیے اندازِ بیان پُر تاثیر بنایا ہیا اور وہ اس میں کسی حد تک کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔

اُنھوں نے اپنے اٹھائیس اشعار کے اس حمد یہ قصیدے میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیّت تخلیق کائنات وتخلیقِ انسان کی دل کش پیرائے میں مدحِ ربِّ جلیل کی ہے۔اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ،تخلیقی صناّعی،کائنات میں اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کے نشانات اور''احسن تقویم'' کی اصطلاح کو عمدگی سے نبھایا ہے۔فلسفہ وحدت الوجود اور فلسفہ وحدت الشہو د کی تاروں کو بھی چھیڑا ہے۔آپ کا حمد یہ قصیدہ شاعرانہ صلاحیتوں کا عکس گر ہے کیوں کہ آپ نے اخلاص فراواں سے حمد یہ قصیدے سے وابستگی اُستوار کی ہے۔آپ کے اخلاص اور خداداد ہنر کے اوصاف سے آگہی کے لیے حمد یہ قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کر اس دفتر کو اس کی حمد سے چل ، اے قلم انشا
کہ جس یکتا نے صنعت سے دو عالم کو کیا پیدا
بسایا شہر دل کا مملکت میں جسم کی ان میں
تماشا اپنا دکھلانے کو آپ ہی سیر کو آیا
ہزاروں طرز کے جلوؤں میں وہ خود کو دکھاتا ہے
تماشا مفت ہے غافل ذرا مژگاں کتیں کردا (۲۰)

میر محسن تجلی شعر کو سخن کا پردہ کرتا اور مزاج کی بوقلمونیت سے اسے اپنا فن بنا کر پیش کرتا تھا۔میر محسن تجلی کے حمد یہ قصیدے میں قرآن مجید میں مختلف مقامات پر بیان کردہ مضامین کر موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔جس سے ان کے ٹھوس علمی بنیادوں کا سراغ ملتا ہے۔موافقت واضداد کے تعامل کا تذکرہ کلام کی معنویّت بڑھا دیتا ہے۔ان کے ہاں متصوّ فانہ رجحان دیکھنے میں آیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ دنیاوی ممدوحین کی بجائے برگزیدہ ہستیاں ان کی نظر کا انتخاب ٹھہریں۔

اُردو حمدیہ قصائد میں ذاتِ الٰہی کی معرفت ،عرفانی تجربات ،قلبی و باطنی کیفیات ،جبر وقدر کی معرفتوں سے معرکہ آرائی اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول مطمح نظر رہا ہے۔اس سوچ پر کاربند ہوتے ہوئے میر تجلی عمدہ حمدیہ قصیدہ رقم کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔اُن کے ہاں حمدیہ قصیدہ مہ پارہ سے مہ کامل بن کر مایہ ناز سرمایۂ ادب کا سفر طے کرتا دکھائی دیتا ہے۔

مظہر علی خان وِلاؔ (م:۱۸۱۶ء) خوب صورت نثر نگار اور شاعر تھے۔انھیں اردو، فارسی اور سنسکرت پر عبور حاصل تھا۔فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ساتھ ہی آپ اس ادارے سے منسلک ہو گئے۔کالج میں قیام کے دوران میں انھوں نے کئی کتابیں لکھنے کا اعزاز حاصل کیا۔ان خدمات کی بدولت انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔دیگر اصنافِ ادب کی طرح انھوں نے ایک اردو حمدیہ قصیدہ بھی لکھا۔جو ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مرتب کردہ نسخے ''دیوانِ ولا'' میں شامل ہے۔ان کے تحریر کردہ پینتیس (۳۵) قصائد میں سے پہلا قصیدہ حمد کا ہے جو چوّن (۵۴) اشعار پر مشتمل ہے۔آپ مترجم ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھے۔اٹھارویں صدی کا نصف ثانی اور انیسویں صدی کا ربع اوّل شورشوں، اضطراب اور بدامنی کا دور تھا۔اس کے اثرات ان کے حمدیہ قصیدے میں بھی پائے گئے ہیں۔مظہر علی وِلاؔ خود کو بلبل کی مانند گل کا دیوانہ قرار دے کر اس کی حمد سرائی میں مگن ہو جاتا ہے۔جب تک سانس میں سانس ہے اسی کے مبارک نام کی مالا جپنا اس کا نغمۂ سرمدی ہے کیوں کہ ماسوائے اس کے دنیا ہیچ ہے۔یادِ الٰہی میں گزرا لمحہ اصل متاعِ حیات ہے۔ارض وسماء کی تخلیق میں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی صناعی کے کمالات دکھائے وہ فقط اسی کریم ذات کو زیب دیتے ہیں۔زبان و بیان کی کشش اور نگارشاتِ عالیہ کے انتخاب نے مدحِ ربِّ جلیل کو شہ پارۂ فن بنا دیا ہے۔مدح سرائی رباب روح کی نغمہ سرائی کی طرح دل آویز ہے۔قصیدے کے اشعار ملاحظہ ہوں:

صاف کر آئینے کو دل کے وِلاؔ
طوطیِ طبع تا کہ ہو گویا
جُز خدائے یگانہ سوچ کے دیکھ
ہیچ دنیا ہے اور مافیہا(۲۱)

ولاؔ کے قصیدے میں مطلع اول کے بعد مطلع ثانی بھی پایا گیا ہے۔ جو قصیدے کی تشبیب کی عمدگی، پختگی اور فنکارانہ دل آویزی کی نوید ہے۔ مطلع ثانی کے ضمن میں صیغۂ واحد اور صیغۂ حاضر میں مدح سرائی کی گئی ہے۔ صنفِ قصیدہ فن و اظہار اور صنفی شناخت کے اعتبار سے یہ ایک جامع اور انسلاک و ارتباط کا عمدہ نمونہ ہے۔ جس میں استقرائیت و استخراجیت اور علمی و احوالیائی تاثریت ہے۔ تخلیقِ عالمِ موجودات کے چند پہلوؤں کے اشعار ملاحظہ ہوں:

پھول پھل دے کے ان میں رنگا رنگ
ذائقہ بو کیا ہر اک کا جدا
کہیں پیدا کیا دُر و مرجان
کہیں معدن کیا جواہر کا (۲۲)

ذوقؔ و غالبؔ کا دور

اردو ادب کی روایت میں غالبؔ اور ذوقؔ کو ہم عصر مانا جاتا ہے۔ غالب اردو کا عظیم شاعر تو ذوقؔ خاقانیِ ہند ہے۔ دونوں شعراء کو آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا استاد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ذوق نے غزل اور قصیدہ نگاری میں نام پیدا کیا۔ ان کی غزلیات پر قصیدے کا رنگ نظر آتا ہے۔ ذوقؔ و غالبؔ کے معرکے خود اردو ادب کا ایک حوالہ ہیں۔ غالب جیسے جیّد شاعر اور شیخ ابراہیم ذوقؔ جیسے تشبیہوں اور استعاروں کے بادشاہ نے اردو ادب کا مستقبل تاب ناک کر دیا تھا۔ ان کے ہاں اعلیٰ پائے کے قصائد موجود ہیں۔ تاہم اردو حمدیہ قصیدہ دستیاب نہیں ہے۔ ذوقؔ و غالبؔ کے دور میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری میں انشا اللہ خاں انشاؔ، شیخ غلام علی ہمدانی مصحفیؔ، محمد علی مہکری خانہ زادؔ، شہزادہ سلیمان شکوہؔ، کرامت علی کرامتؔ شہیدی، نظام الدین ممنونؔ دہلوی اور مومن خان مومنؔ نے اللہ تعالیٰ کی شان میں حمدیہ قصیدے لکھ کر اردو حمدیہ قصیدے کی روایت میں گراں قدر اضافہ کیا۔ اس دور کا مطالعہ اردو حمدیہ قصائد کے تاب ناک مستقبل کا تابندہ حوالہ دیتا ہے۔ یہ قصائد فنی اعتبار سے بھی کلاسیکی دور کے امین معلوم ہوتے ہیں۔

نے کل دس (۱۰) قصیدے لکھے۔ ان قصائد میں ایک حمدیہ قصیدہ، تین قصائد شانِ مولا علیؑ میں اور چھ (۶) قصائد درباری مدح و تعریف میں لکھے گئے ہیں۔ انشاء اللہ خاں انشا

کی وفات کے بارے میں ڈاکٹر سعادت سعید لکھتے ہیں:

''انشاء اللہ خاں انشا (م ۱۸۱۸ء) جو کہ دبستانِ لکھنو کے اہم نمائندے متصور ہوتے ہیں۔''(۲۳)

ان کا لکھا گیا حمدیہ قصیدہ ۴۴ اشعار پر مشتمل ہے۔ حمد کے موضوعات کا چشمہ ہر لحظہ نئی آن اور نئی شان کے ساتھ پھوٹتا ہے۔ کیوں کہ صفاتِ خدا بلا تعطل وقوع پذیر ہو رہی ہیں۔ انشاء کے حمدیہ قصیدے میں قوافی عربی زبان کے برتے گئے ہیں۔ یہ حمدیہ قصیدہ ہر قافیے کے آخری حرف ''قاف'' پر مشتمل ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے فارسی یا اردو الفاظ کی بجائے عربی الفاظ و تراکیب کا استعمال شعوری طور پر کیا ہے۔ یوں قصیدے میں ادبی رعنائی اور علوِ فکر کی دولت دَر آئی ہے۔ انشاؔ کے حمدیہ قصیدے کا آغاز مدح ربّ جلیل سے ہوا ہے۔ انشاؔ کے حمدیہ قصیدے کا مطلع کا شعر ملاحظہ ہو:

اے خداوندِ مہ و مہر و ثریا و شفق
لمعۂ نور سے تیرے ہے جہاں کو رونق (۲۴)

تشبیب میں بڑی فنی چابکدستی اور عمیق نگاہی پر مبنی مشاہدات کی بنیاد پر تخلیقِ انسانی کا ذکر کیا ہے۔ حسیّات اللہ تعالیٰ کی عطائے عظیم ترین ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی انشاؔ کی حمدیہ اقدار کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''انشاؔ کے پاس حمدیہ، نعت اور منقبت کے اشعار کی کمی نہیں۔ کلیات کے تقریباً دس پندرہ فیصد اشعار انھی مضامین پر ہیں۔۔۔ حمدیہ مضامین انشا کے ہر دیوان اور ہر صنفِ سخن میں لکھے ہیں۔۔۔ جس سے ان کے راسخ یقین اور معرفت کا احساس ہوتا ہے۔''(۲۵)

شیخ غلام علی ہمدانی مصحفیؔ (م: ۱۸۲۴ء) اردو قصائد میں جودت طبع اور علوِ فکر کے جوہر دکھانے میں امتیازی مقام رکھتے تھے۔ وہ صرف فصیح و بلیغ شاعر ہی نہ تھے بلکہ اعلیٰ پائے کے ناقد بھی تھے۔ وہ فارسی اور اردو شعراء میں درخشندہ و تابندہ ستارے کی طرح چمک رہے ہیں۔ انہوں نے ۴۸ قصائد کو سپردِ قلم کیا۔ جن میں پہلا حمدیہ قصیدہ ہے۔ مصحفیؔ کا اردو حمدیہ

قصیدہ ۶۱ (اکسٹھ) اشعار پر مشتمل ہے۔ انھوں نے اس مقدس موضوع سے پہلو تہی نہیں برتی بلکہ اس میں ادبی و دینی محاسن و نکات کا سرمایہ سمویا ہے۔ مدح ربّ جلیل میں ایمان و عقیدت کی حرارت وادبیّت کا سرمہ لگا کر صنفِ قصیدہ کو دلکش اور نادر بنا دیا ہے۔ وہ قادر الکلام قصیدہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ہم رنگ ہم طبیعت شاعر تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات کے علم و حکمت و عرفانِ تمحید و مجید میں مگن ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ربوبیّت، خلاّقیت اور احدیّت و واحدیّت کی فلسفیانہ تعبیروں کو اس قصیدے میں وارفتگی شوق سے سرشار ہو کر بیان کیا گیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

قابل حمد و ثنا ہے وہ خداوندِ کریم
جس نے انساں کے تئیں طرزِ سخن کی تعلیم
مدرکہ کنہ کو کیا ذات کی اس کے پاوے
یہ براہین و دلائل جو نہ ہووے تفہیم (۲۶)

پروفیسر نذیر احمد رقم طراز ہیں:

''قصیدہ گوئی کے لیے جس علوئے فکر اور قادر الکلامی کی ضرورت ہوتی ہے، مصحفی کے قصائد کو دیکھتے ہوئے، کہا جا سکتا ہے کہ ان کے یہاں بھی یہ خصوصیت موجود ہے۔'' (۲۷)

انھوں نے وحدت الوجود، وحدت الشہود اور توحید واجب الوجود کی فلسفیانہ نزاکتوں کو زینت قرطاس بنایا ہے۔ اشعار دیکھیے:

کس کی وحدت سے ہے ہر چند کہ پیدا کثرت
لیکن اعداد کی واجب نہیں اس کو تکریم
ذات اگر اس کی ہو علّت ایجادِ جہاں
رہے یہ مسئلہ علّت معلول سقیم (۲۸)

مصحفی نے حمدیہ قصیدے میں علومِ جدید، طبیعات، ارضیات، فلکیات، علمِ ہندسہ، جمادات، نباتات، معدنیات اور حیاتیات کو موضوع بنایا ہے۔ منطقیانہ زاویہ نظر سے انسانی فکر کو جھنجھوڑا ہے کہ کائنات میں اہل دانش و بینش کے لیے نشانیاں ہیں۔ ان کے ہاں بعض اشعار اعلیٰ

وارفع اور نگارشات عالیہ کا نمونہ ہیں۔ اردو حمد یہ قصیدے کی روایت میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی کا تحریر کردہ اردو حمد یہ قصیدہ اپنے موضوع کی بوقلمونیوں، وسعتوں اور دل کش نظائر کا گل دستہ ہے۔ عمدہ تشبیہات کے استعمال سے کلام کی چاشنی، مٹھاس اور عقدہ کشائی میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ قصیدہ اردو حمد یہ قصیدے کی روایت میں ایک فکری رنگارنگی اور علمی کہکشاں کا عمدہ اضافہ ہے۔

ہر مسجود کے لیے ساجد کا ہونا ضروری ہے۔ ہر مجعول کے لیے جاعل کا ہونا ضروری ہے۔ ہر مخلوق کے لیے خالق کا ہونا ضروری ہے۔ ہر مصنوع کے لیے صانع کا ہونا ضروری ہے۔ اس طرح مصحفی کو ہندوستانی ادب کا معمار قرار دینا ضروری ہوگا کیوں کہ جتنے شاگرد مصحفی کو ملے اتنے شاگرد بہت کم شعراء کو نصیب ہوئے۔ مزید یہ کہ ان سے فیض اٹھانے والوں نے اردو شاعری کو ماں کی طرح لوریاں دیں اور محبوبہ کی طرح اس کے نخرے اٹھائے۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ اور قصیدہ نگار کے درمیان میں چکور اور چاند کا رشتہ پایا گیا ہے لیکن مصحفی کی وجہ شہرت قصیدہ نہیں بلکہ غزل ہے، تاہم قصیدہ گوئی میں بھی وہ پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔ بالخصوص حمد یہ قصیدے میں گنجینۂ اسرارِ خدا کے موتی چُن چُن کر لاتے ہیں۔ جس سے اُن کی شعری عظمت عیاں ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

ملک العرش ہے وہ کارکن ہر دہ جہاں
نہ کوئی اس کا وزیر اور نہ کوئی اس کا ندیم
اور جب تک یہ رہے زیست کی مسند پر چلیں
اس کے محکوم رہیں بادشہ ہفت اقلیم (۲۹)

محمد علی مہکری خانہ زاد (م: ۱۸۲۴ء) کے کلیات گنجِ شائگاں میں پہلا حمد یہ قصیدہ ہے۔ یہ حمد یہ قصیدہ ۶۰ شعروں پر مشتمل ہے۔ اردو حمد یہ قصیدے کی روایت میں یہ ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ محمد علی مہکری خانہ زاد بڑے عالم و فاضل انسان تھے۔ آپ اعلیٰ پائے کے شاعر اور قصیدہ نگار تھے۔ آپ نے کمال ہنرمندی سے گزشتہ اور فردا کی شعر و سخن اور فکر و فن کو پیش کیا۔ آپ نے سیدھے سبھاؤ اور علمی و فنّی پُرکاری سے حمد یہ قصیدے کو زینتِ قرطاس بنایا ہے۔ کائنات کی عظیم ترین سچائی وجودِ ربِّ جلیل ہے جسے قرآنِ مجید فرقانِ حمید اور آنحضرتؐ کی

کامل ترین ذات کے ذریعے ہم تک لایا گیا ہے۔سخن گوئی کا راست معیار مدحِ خداوند ہے۔

قرآن کا اثر اردو حمدیہ قصیدے میں جا بجا ملتا ہے۔خوبصورت تلمیحات اور مختصر قرآنی اصطلاحات کو بروئے کار لا کر خانہ زآد نے حمدیہ قصیدے کے شان وشوکت اور علوِ فکر کو تابانی بخشی ہے۔حمدیہ قصیدہ نگار سطحی مضمون سے حامدوں کی جماعت کا رکن نہیں بن جاتا بلکہ اس عمیق نگاہی، گہرے اثرات، مشاہدات وانکشافات کا شعور ضروری ہے۔حقیقت وفلسفہ، شان وجلالِ خداوند، ربوبیت، عرش، کرسی وقلم، تسبیح وزنار، خورشید وافلاک، کہکشاؤں، طیّور، عرش وفرش، یوسف وخلیل اللہ، چرخ وآتش، اسرار وفہمیدگاں جیسے رنگا رنگ موضوعات بارگاہِ ایزدی میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔حمدیہ قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کیا تو ''کن'' کی کھیتی دو جہاں کو
بھی یک پل میں زمین و آسماں کو
دیا خورشید کو افلاک پر جا
رکھا بس دور اس سے کہکشاں کو(۳۰)

آپ کے کلیات ''گنجِ شائگاں'' میں کل ستر سے زائد قصیدے موجود ہیں جو ان کے مشاقی اور خیالات کے تنوع بُوقلمونیوں کے شاہکار ہیں۔ان میں حمدیہ قصیدہ توحید اور لوازماتِ توحید کے بیان کا گلدستہ ہے۔مضمون آفرینی اور حسنِ تعلیل کو بروئے کار لا کر اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ وحکمت وصناعی کا بیان بڑے جادۂ شوق سے کیا ہے۔اس حمدیہ قصیدے میں لفظ ''دیا'' چوبیس مرتبہ استعمال ہوا ہے۔جس کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس قصیدے میں اللہ تعالیٰ کی عطاؤں کا بطورِ خاص تذکرہ کیا گیا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دیا ہے بحر کو سامان بے حد
بھی بخشا ہے کرم سے مایہ کاں کو (۳۱)
دیا ہے لعل کو آبِ مصفا
نکالہ شعلہ سے یکسر دخاں کو(۳۲)

مرزا محمد سلیمان شکوہ (م:۱۸۳۸ء) برِّصغیر کی مغلیہ سلطنت کے مغلیّہ خاندان کے

چشم و چراغ ہیں۔اپنی خاندانی روایات کے مطابق قلم کے سپاہی ہونے کے ساتھ ساتھ سپہ سالار بھی تھے۔خاندانی وجاہت،علم وفضل اور شاہ عالم ثانی کے بیٹے ہونے کے علاوہ صاحبِ دیوان شاعر بھی تھے۔وہ سیدھے سادے اسلوب کے مالک تھے۔ان کے ہاں نگارشاتِ عالیہ کے نمونے بہت کم ملتے ہیں۔تاہم انھوں نے ریاضت ،قوّتِ تخیّل اور مشّاقی سے عمدہ فن پارے تخلیق کیے ہیں۔کلیاتِ سلیمان شکوہ میں ۴۸،اشعار کا ایک قصیدہ حمد،نعت اور منقبت مولا علیؑ کی صورت میں ملتا ہے جس میں صاف اور سادہ اُسلوب میں حقیقت نگاری کر کے حمدیہ قصیدہ قلم وقرطاس کی نذر کیا گیا ہے۔اندازِ بیان سہلِ ممتنع کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔وہ حمدِ باری تعالیٰ کے بیان اور رشحات قلم کی حد تک ''ہدیۂ تبریک'' کے لیے کاوش کرتے نظر آتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ فلسفیانہ موشگافیوں،بوقلمونیوں اور پُر زور وپُر شکوہ اندازِ تحریر جو قصیدہ نگاری کے لیے عمومی طور پر لازم تصور کیے جاتے ہیں ان کا التزام کم ہے۔قصیدے میں اسلوب کی گھن گرج، شان وشوکت، جاہ وجلال،مبالغہ آرائی اور تخیّل آفرینی ایک خاص حد تک سطوت کا احساس پیدا کرنا لازم ہے۔مگر ابلاغ کا گُن اس کے دامن میں سمایا ہوا ہے۔شہزادہ سلیمان شکوہؔ نے روح وقالب، ذوذوانب ،شہابِ ثاقب، اَحدیت ،مرتد وکاذب، وحدہٗ لاشریک لہٗ جیسے الفاظ کا چناؤ کر کے شعری فکر کو صفحہ قرطاس پر اُتارا ہے۔نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سب کا مالک وہ سب کا صاحب ہے
جس کے قبضے میں روح و قالب ہے
واقعی ممکنات کو شب و روز
ہر گھڑی فرض شکر واجب ہے (۳۳)

کرامت علی شہیدیؔ (م:۱۸۴۰ء) نے معمارِ ہندوستانی ادب غلام ہمدانی مصحفی سے زانوئے تلمذ کیا۔دیوانِ شہیدی کا آغاز ایک حمدیہ قصیدے سے ہوا ہے۔یہ حمدیہ قصیدہ ۱۵۲ اشعار پر مشتمل ہے۔افتخار امام صدیقی ان کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''کرامتؔ علی کرامتؔ کی شاعری میں جو فکری لَے ہے، وہ آج کی

شاعری میں کم کم نظر آتی ہے۔فکر و فلسفہ کی آمیزش نے ان کی
شاعری کو اعتبار بخشا ہے۔وہ دوسروں سے الگ ہو کر کہنے کی کوشش
کرتے ہیں اور یہ بڑی بات ہے۔''(۳۴)

موصوف کا حمدیہ قصیدہ دبستانِ لکھنو کی جمالیات کا حامل اور ربِ جلیل کی شانِ تخلیق ِ کائنات کا آئینہ دار ہے۔

رفعتِ خیال اور مضمون کے ارتباط و انسلاک نے قصیدے کے ابلاغ کو موثر بنا دیا ہے۔کرامت علی شہیدیؔ نے اپنے فکر و فن کے کینوس پر ایک عُمدہ حمدیہ قصیدے کا اضافہ کیا ہے۔انھوں نے اپنے شعری نظریے کو تخلیقی عمل کے ذریعے حمدیہ قصیدہ نگاری کے نو بہ نو موضوعات کی بازیافت میں صَرف کیا ہے۔کائنات کی فضائے بسیط کو رمزیات و کنایات کے ذریعے کثیر جہتی قالب میں ڈھالا ہے۔واجب الوجود، ممکن الوجود، گلستانِ خلیل، صبحِ رحیل، قلزم عرفان، رودِ نیل اور نامہ اعمال وغیرہ جیسے موضوعات کو قصیدے کی زینت بنایا ہے۔علوفکر اور عُمدہ ڈکشن کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

حسنِ سخن ہو وصف جمال اوس جمیل کا
گلگونہ جس کا اسم ، رخِ قال و قیل کا
تصویر ایک آئینہ انواع مختلف
کس وجہ میں نہ محو رہوں ہر شکیل کا (۳۵)

نظام الدین ممنونؔ دہلوی اکبر شاہ ثانی کے استاد ہونے کی وجہ سے فخر الشعرا کے لقب سے ملقب ہوئے۔آپ اردو ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔کلیاتِ ممنونؔ کو محمد اکبر الدین صدیقی نے مرتب کیا ہے۔رنگا رنگ بوقلمونیوں کے حامل ان قصائد کی تعداد ۳۲ ہے۔کلیاتِ ممنونؔ کا آغاز حمدیہ قصیدے سے کیا گیا ہے۔اُن کے حمدیہ قصیدے کا مطلع فلسفہ وحدت الوجود اور فلسفۂ وحدت الشہود کے تذکرے کے علاوہ صنعتِ تضاد کے عمدگی سے برتے جانے کا ثبوت ہے۔ڈاکٹر سعادت سعید نظام الدین ممنون کی وفات کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''میر نظام الدین ممنون (م ۱۸۴۴ء) معروف شاعر میر قمر الدین

منت کے فرزند ہیں‘‘(۳۶)

حضرت انسان اللہ تبارک وتعالیٰ کی شہکار تخلیق ہے۔یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہاں انسانی شعور، وجدان، ظاہر و باطن اور بندہ کی اپنے خالق سے رُوحانی وابستگی کا مضمون بڑی عمدگی سے باندھا گیا ہے۔حمدیہ قصیدے کا مطلع ملاحظہ ہو:

اے صفت و ذات میں تجکو ظہور و خِفا
چشمِ سرو چشمِ سر حسن پر تیرے فدا (۳۷)

مومن خاں مومنؔ (م:۱۸۵۱ء) کے کلیات میں نو قصیدے ملتے ہیں۔کلیاتِ مومنؔ میں پہلا قصیدہ حمدیہ ہے اس لیے حمدیہ قصیدے کو شروع میں رکھا گیا ہے۔ جو ۷۶ شعروں پر مشتمل نادرکاری کا عمدہ نمونہ ہے۔مدح میں مومن مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں تاہم اللہ تعالیٰ کی تعریف وتوصیف میں مبالغے کی کیا بساط ہے۔حمدیہ قصیدے میں صنعتوں کے استعمال اور صنائع بدائع کے اہتمام نے زورِ بیان پیدا کر دیا ہے۔خاندانی حکیم ہونے کے باعث ان کا قلم علم وحکمت میں خوب چلتا تھا۔مومن خاں مومنؔ کا حمدیہ قصیدہ تہ در تہ ہونے کے باعث قابلِ رشک اور خزینہ اسرارِ توحید ہے۔ان کا اصل میدان تو غزل ہے تاہم اُن کا حمدیہ قصیدہ اردو حمدیہ قصیدے کی روایت میں کشتِ زار ہے۔اللہ تعالیٰ کی عظمت و رفعت کا شعور کلام سے مترشّح ہے۔بیداریِ مغز، قلبِ منور اور مدحِ ربِ جلیل سے لبریز اذانِ توحید سنا کر حمدِ باری تعالیٰ کی ایک جامع سعی کی ہے۔نمونے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

الحمد لواہب العطایا
اس نے کیا کیا مزہ چکھایا
والشکر لصانع البرایا
جس نے ہمیں آدمی بنایا(۳۸)

مومن خاں مومنؔ دہلوی نے حمدیہ قصیدے میں عربی تلمیحات اور قرآنی اصطلاحات کو بڑی نادرکاری سے برت کر قصیدے کی معنویت میں اضافہ کیا ہے۔علمیاتی اصطلاحوں سے آراستہ و پیراستہ ہونے کے باعث فارسی قصائد کے ہمسر ہے۔قصیدے کو صنفی شناخت کے اعتبار سے

دیکھا جائے تو اردو ادب میں ممتاز قصیدہ ہے۔صلہ طلبی عقائد و نظریات کو مقدم جانتے ہیں۔اسلام، شعائرِ اسلام اور عقائد اسلام کے مبلغ و داعی ہونا ان کا مطمحِ نظر رہا ہے۔چند اشعار دیکھیے :

وہ عشق دے جس کا نام اسلام
وہ شیوہ نبیؐ نے جو بتایا
اس کا مرے دل پہ ایک پرتو
جس شعلہ نے طُور کو جلایا (۳۹)

اللہ تعالیٰ کے زمین و آسمان کا نور ہونے کے باعث اس کی صنّاعی کا مظاہرہ نظامِ کائنات میں جا بجا ہے۔جنھیں قصیدہ نگار نے تزک و احتشام اور طمطراق سے بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر سعادت سعید لکھتے ہیں:

> ''مومنؔ کے قصائد کا مطالعہ پہلی نظر میں اس حقیقت کا کاشف ہے کہ یہ سوداؔ اور ذوقؔ کے قصائد سے مختلف ہیں۔ان میں مومن نے منفرد اسلوب کی تلاش کی ہے۔قصائد میں دینی اصطلاحات ، اظہارِ علمیت ، تصنّع اور مشکل پسندی کے استعمال کا تذکرہ آئے تو ذہن مومنؔ کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔''(۴۰)

جنگِ آزادی کے بعد کا دور

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کے حالات بے یقینی کا شکار ہو گئے ۔زندگی اور مذہب سے فرار کا رجحان بڑھنے لگا۔زندگی کے متعلق رویّہ مختلف طبقوں میں بٹ گیا۔ایک طرف محکومیّت میں بقا کا سامان تلاش کیا جانے لگا جبکہ دوسری طرف مزاحمت اور آزادی کی ضرورت و اہمیّت کو ترجیح دینے کی حکمتِ عملی کو اپنایا گیا۔بدلتے ہوئے رجحانات نے اردو ادب کے منظر نامے پر گہرے نقوش مرتب کیے ہیں۔اصنافِ ادب میں مختلف افسانوی اور غیر افسانوی ادب پارے وقوع پذیر ہوئے۔سوچ کے دھاروں نے روایتی اسلوب کی بجائے بغاوت میں عافیّت جانی۔حب الوطنی،ملت،اتّحاد،انقلاب،آزادی، جہاد اور بیداریِ شعور جیسے موضوعات نے قوم کی اجتماعی ضرورت کا بیڑا اٹھایا۔جنگِ آزادی

سے تحریکِ آزادی تک کے سفر کے دوران میں مسلمانوں نے آزادی کی شمع روشن کرنے کیے لیے تمام فورمز پر جدوجہد کی ۔ یہ دور قدیم و جدید دور کے درمیان میں ایک پل کی طرح تھا۔قدیم دور کے نقوش اور جدید دور کے امکانات نے جستجو کو تحریک بخشی ۔اس دور کے ادباء نے تمام شعبہ ہائے زندگی کو زینتِ قرطاس بنایا۔سیاست ہو کہ ریاست،تہذیب ہو کہ تمدن، جنگِ آزادی ہو کہ تحریکِ آزادی، جہاد ہو کہ مذاکرات ، انفرادی ہوں یا اجتماعی مفادات اور مذہبی ہوں یا نظریاتی تمام پہلوؤں کا محافظ بن کر قلم کاروں نے دفاع کیا۔۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد بھی حمدیہ قصیدہ نگاری کا عمل جاری وساری رہا۔اردو حمدیہ قصیدہ نگاری میں مہدی علی ذکیؔ،قربان علی بیگ سالکؔ،صفیؔ ربلگرامی،نیاز احمد ہوشؔ بریلوی،صفدر علی خان رام پوری،سخنؔ دہلوی،منشی سورج نرائن مہرؔ،شیخ غلام یحییٰ حضورؔ عظیم آبادی،مولوی محمد حسین تمناؔ مرادآبادی اور محمد ابراہیم آزادؔ نے بارگاہِ ایزدی میں حمدیہ قصائد پیش کیے ہیں۔قیامِ پاکستان سے قبل کی اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کی روایت کے یہ درخشندہ ستارے عمدہ نمونے پیش کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

مہدی علی ذکیؔ (م:۱۸۵۶ء) کے کلیات کا آغاز حمدیہ قصیدے سے ہوا ہے۔ جو ۴۱ شعروں پر مشتمل ہے۔اس قصیدے میں مدح روایت سے ہٹ کر نئے اسلوب میں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔وہ اعلا پائے کے شاعر اور صاحبِ علم وفضل تھے۔وہ علمی استطاعت رکھنے کے ساتھ ساتھ صاحبِ اقتدار بھی تھے۔

ان کا حمدیہ قصیدہ پیچیدگی اور علمی موشگافیوں کی بجائے سادگی اور پُر کاری کا عمدہ نمونہ ہے۔فکری بالیدگی ،متنوع علوم وفنون اور شعروسخن کی بدولت قصیدے کو سریع التّاثیر بنانے کی سعی کی گئی ہے۔تشبیب میں شعروسخن کی اہمیّت کے موضوع نے استحسانِ شعریّت کا سحر پھونک کر کارگہ شیشہ گری کو فکری ومعنوی لباس پہنا دیا ہے۔اس قصیدے کے بیشتر اشعار قرآنی احکامات کی مصوری اور مظاہر عالم میں حاکمیّتِ ربِّ جلیل کا سراپا حمد کناں ہیں۔

اردو حمدیہ قصیدے کی روایت میں مرقع ،صنائع بدائع اور لوازماتِ شعری سے مزیّن ہونے کے باعث یہ قصیدہ ایک عمدہ اضافہ ہے۔ان کا طرزِ نگارش صنفِ قصیدہ سے آگہی اور فکری وفنّی بصیرت کا مُنھ بولتا ثبوت ہے۔چند اشعار دیکھیے :

یہ حسن معنی روشن ہے شمعِ بزم شعور
کہ ہے فروغِ سخن آفتابِ عالم نور
نہاں ہے شمع تجلی حجاب معنی میں
دکھائے جلوۂ نورِ نہاں سخن میں ظہور (۴۱)

قربان علی بیگ سالکؔ (م:۱۸۸۰ء) اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کی روایت میں مہکتے ہوئے پھول ہیں۔ اُنھیں فکر و موضوعات، طرزِ اظہار اور محاسن و روایت سے تہی دامن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان کے کلام میں خاص بات یہ ہے کہ ہر شعر ایک جامع اور مکمل مضمون کا حامل ہونے کے باعث معنوی اہمیّت کا حامل ہے۔ قربان علی بیگ سالکؔ کو مومن خاں مومنؔ دہلوی اور بعد ازاں مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کا شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ان کی شاعری میں اساتذہ کا رنگ و آہنگ اور عالی مرتبگی پائی جاتی ہے۔ پُر رفعت خیال، موضوع کا باہمی ربط ضبط اور حسن تعلیل کا عمدگی سے استعمال کیا گیا ہے۔

کلیاتِ سالکؔ کا آغاز ایک حمدیہ قصیدے سے کیا گیا ہے۔ یہ حمدیہ قصیدہ ۵۱ شعروں پر مشتمل ہے۔ خیال کی روانی، اجتہادی کاوش، قرآن و احادیث سے اِکتساب اور توصیف اِلٰہی کا بیان اثر آفریں ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

جب خامہ مرا حمد نگاری کو جُھکا ہو
تسلیم کو پھر کیوں نہ فلک اور دوتا ہو
محکوم ترا ہو تو حکومت ہے جہاں کی
آزاد وہی ہے کہ جو پابند رضا ہو (۴۲)

ارنی، یُوسفِ کنعاں، فرعون و حضرت موسیٰؑ، سرکشوں کا انجام، آوازِ درا، مشعلِ خورشید، فنا و بقا جیسے موضوعات سے حمدِ باری تعالیٰ کا چمن آراستہ کیا ہے۔ تاہم علوِ فکر اور نگارشاتِ عالیہ رقم کرنے میں بھرپور طور پر کامیاب نظر نہیں آتے۔ یہ حمدیہ قصیدہ خطابیہ اور مدح میں تخیّل سے مزیّن ہے۔ حرفِ شرط کے استعمال نے نئی جہات کو جنم دیا ہے۔ صفاتِ رحمت و شفقت کا بیان اور فلسفہ وحدت الوجود و وحدت الشہود سے قصیدے کی آرائش و زیبائش

کرتے نظر آتے ہیں۔اشعار دیکھیے:

کیا طور پہ دیکھیں کہ تو ہر جائے ہے موجود
اب کیوں ''ارنی'' کہہ کے کوئی ہرزہ سرا ہو(۴۳)
طوفاں ہو کسی کے لیے ، کشتی ہو کسی کو
فرعون کو ہو نیل تو موسیٰ کو عصا ہو (۴۴)

صفیرؔ بلگرامی (م:۱۸۹۰ء) انشائیہ پرداز، ادیب، شاعر بلگرام (اُتر پردیش) اصل نام سیّد فرزند احمد ہے۔ وہ کئی کتب کے مصنف تھے۔اُنھیں غالب کا شاگرد ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔اُنھوں نے ایک طویل حمدیہ قصیدہ لکھا جو اعلیٰ پائے کا ہے۔ان کے دادا اور پردادا بھی شاعر تھے۔سادات خاندان کے چشم و چراغ اور علمی و ادبی گھرانے سے تعلق تھا۔مطلع اوّل ملاحظہ ہو:

اے پردۂ وحدت ترے جلوے سے منور
وے عالمِ کثرت تری قدرت میں مکرّر (۴۵)

نیاز احمد ہوشؔ بریلوی (م:۱۸۹۲ء) نوابان بریلی کے چشم و چراغ تھے۔کلیاتِ ہوش کے آغاز میں ''جلوۂ حمد سراپا نور مسمّٰے بہ سرمہ ٔطور'' کے عنوان سے حمد موجود ہے۔ یہ قصیدہ صنفی شناخت کے اعتبار سے اور مروجہ ارکانِ قصیدہ کے اعتبار سے کمزور ہے۔ یہ قصیدہ ۳۱ شعروں پر مشتمل ہے۔اُن کا مشاہدہ گہرا ہے لیکن فکری اُپج کا احساس پایا جاتا ہے۔ان کے ہاں پُر شکوہ اور پُر زورِ بیان پایا جاتا ہے۔مبالغہ آرائی، علمی موشگافیوں اور فلسفیانہ تفکّرات کے باعث ان کا کلام پُر جوش ہو گیا ہے۔نیاز احمد ہوشؔ بریلوی کے ہاں حمدیہ قصیدے کے اشعار ملاحظہ ہوں:

مرکب ہے بہر طبع رواں دوش نقش پا
وسعت سخن کی ہے لب خاموش نقش پا
ذہن رسا کا اُٹھ نہیں سکتا ذرا قدم
شل ہو گیا ہے مثل تن و توش نقش پا (۴۶)

ہوشؔ بریلوی کی علمی و ادبی شعور اور شعر گوئی کے بارے میں ڈاکٹر سعادت سعید لکھتے ہیں:

''ہوشؔ بریلوی کی تصنیفات میں تاریخِ روہیل کھنڈ، مثنوی ترانۂ

ہوش،شہادت نامہ بے نظیر،فسانۂ غرائب،واسوخت ہوش،اور
کلیات ہوش شامل ہیں۔ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صاحبِ علم و
تحقیق میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ حکایت نویسی اور شعر گوئی
میں بھی طاق تھے۔انھوں نے نعت و منقبت کے قصائد میں مذہبی
اور دینی امور سے اپنی واقفیّت کا مکمل اظہار کیا ہے۔"(۴۷)

صفدر علی خان رام پوری (م:۱۹۱۰ء) نوابانِ رام پور کے چشم و چراغ تھے۔وہ صفدر رام پوری کے نام سے جانے جاتے ہیں۔اُنھیں اردو زبان وادب کے معروف نعت گو شاعر امیر مینائی کا شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہے۔کلیاتِ صفدر میں ۱۰۰ اشعار کا ایک بھرپور حمدیہ قصیدہ شامل ہے جس میں قوسِ قزح کے رنگوں کی مانند کشش اور جاذبیّت ہے۔اُنھوں نے الفاظ کے پتھروں کو اپنے کمالِ مہارتِ فن سے کاٹ کر پُر تاثیر لہجے کی کوملتا اور احساس کی شدت سے تراشا ہوُ انگینہ بنا دیا ہے۔یوں فنِ تحریر اور اندازِ تعمیر کو چار چاند لگا دیے ہیں۔اردو حمدیہ قصیدے کی روایت کا درخشندہ ستارہ جس کے شعور کی رو اور علوِ فکر نے صنفِ قصیدہ کے امکانات روشن کر دیئے ہیں۔نادر کاری اور صنائع و بدائع کا چناؤ کر کے نُدرتِ خیال کا جامہ پہنانا ان کا خاصا ہے۔باہم اتصال اور پُر کاری کے باعث حمدیہ قصیدے کا کشت زاران کا اثاثہ ہے۔اللہ تعالیٰ نے ان کے ذوقِ فراواں کو فزوں تر کر دیا ہے۔انھوں نے نہایت مدلّل اور تمام تر فکری جولانیوں سے مزیّن حمدیہ قصیدہ لکھا ہے۔وہ حمدیہ قصیدے جیسے دشوار گزار راستے پر چل کر بڑی عُمدگی سے شعر وادب اور حمدِ باری تعالیٰ دونوں کا حق ادا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔شروع سے آخر تک اس قصیدے میں صفائی،نکھار،سلاست،دل آویزی اور دل کشی اپنی ممکنہ رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے۔قصیدے کی سج دھج،زورِ تخیّل،اختراع وجدت،روانی اور تسلسل کے اہتمام کے باعث تفاوت کا شائبہ تک نہیں پایا گیا ہے۔شعر و شاعری میں راسخ تھے۔تلمیحات کا استعمال کر کے موضوع کی معنویّت کو فروزاں کر دیتے ہیں۔وہ مدحِ ربِ جلیل کے لیے قلبی وارفتگی سے سرشار نظر آتے ہیں۔فکر کی چاشنی کو فن کی تراشیدگی سے بے مثال بنا دیا ہے۔کلیاتِ صفدر میں حمدیہ قصیدے کا مطلع ملاحظہ ہو:

آبِ کوثر سے میں دھوؤں پہلے خامے کی زبان
پھر لکھوں حمد خداوندِ زمین و آسمان (۴۸)

اس حمدیہ قصیدے میں آپ کا اشہبِ قلم سرپٹ دوڑا ہے اور کامیابی کا میدان مارنے میں سرخرو ہوا ہے۔تشبیب میں حمد نگاری کی تیاری کا نقشہ کھینچنا ان کے جذبات کی صداقت کا عکاس ہے۔قصیدہ نگاری کو اقلیمِ سخن کہا جاتا ہے اور حمدیہ قصیدہ نگاری تو یقیناً اس سے بھی افضل درجہ پر فائز ہے۔شاعر قصیدہ گوئی کا اہتمام کرنے کے لیے قلم دوات، سیاہی اور کاغذ جیسے لوازمات کا تقاضا کرنا معنی خیز ہے۔شہپرِ جبریل، برگ اشجار جنان، سرخی رخسار حوراں جنان۔جواز کی مقراص اور وضو کے لیے آبِ زم زم کی طلب نے عیاں کر دیا ہے کہ حمدیہ قصیدہ نگاری کا اہتمام کس قدر تقاضوں کا متقاضی ہے۔منظر کشی کرتے ہوئے ان کا چشمۂ شوق اُبل پڑا ہے۔پنجہ خورشید، کہکشاں، حور وغلماں، خلد و دوزخ ارفن و افلاک انس جاں، عرش و کرسی، مہر ومہ، لوح وقلم، خاک و باد، آتش و آب رواں، دست و پا، چشم و گوش و جان و تن، خالق، رزاق، حیّی، قدیم، قادر، عادل، غیب دان، دیدۂ یعقوبؑ، تجلّی چشم موسیٰؑ، بلبل و فاختہ، بوستان، طاؤس چمن، فلسفہ وحدت الوجود، فلسفہ وحدت الشہود، فلسفہ وحدت الوجوب، رقصِ بسمل، چشمِ وحدت قاضی ومفتی و شیخ و واعظ و مے خوار و رند، بوتل، ساغر، مئے، ساقی، شاہد، بزم مے کہکشاں اور بخشش وعطا جیسے ذخیرہ الفاظ کو بروئے کار لا کر صفدر رام پوری نے اپنے کلام کو پیوندِ فلک کر دیا ہے۔ڈاکٹر سعادت سعید اُن کی قصیدہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''صفدر علی صفدر کی شاعرانہ مہارت پر ان کے علم اور مشاہدے نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔انھوں نے قصائد میں جس بھی موضوع پر اظہارِ خیال کیا اس کے اہم متعلقات کو بھی شاعری کا رُوپ عطا کیا۔''(۴۹)

انھوں نے حمدیہ قصیدے میں خالقِ کائنات کی قدرتوں کی صناعی اور موضوعاتی وسعتوں کو قادرالکلامی سے شہ پارہ فن بنا دیا ہے۔قصیدے کے تمام اجزاء اور ہیئت کا بھرپور استعمال کیا ہے۔اشعار ملاحظہ ہوں:

چشم عالم سے نہاں ہے پر ہے ہستی آشکار
جلوہ گر ہے ہر طرف ہر سو نشان بے نشان
روح کو اس جسمِ خاکی میں نہیں ہرگز قیام
چار دن کو مل گیا ہے یہ کرایہ کا مکان(۵۰)

جان اتنا قائل توحید رب کو ہے نجات
اور کوچوں میں نہیں ہے چلنے والوں کو امان(۵۱)

سخنؔ دہلوی (م:۱۹۰۰) کا اصل نام سیّد محمد فخر الدین حسین ہے۔سادات خاندان کے صاحبِ علم وعرفان چشم وچراغ تھے۔ دہلی کے باشندے ہونے کے باعث سخن دہلوی کے نام سے مشہور ہوئے۔ دہلی علم وفضل کا مرکز رہا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں دبستان دہلی کے اثرات پائے جاتے ہیں۔وہ غالب اور بلگرامی سے مشورۂ سخن کرتے رہے جس کے باعث ان کے کلام کا مقام ومرتبہ متعین کرنے میں راہنمائی ملتی ہے۔ان کا پیشہ وکالت تھا۔سید محمد فخر الدین حسین سخن دہلوی کے ''دیوانِ سخن'' میں ۱۲۷ اشعار کا ایک حمدیہ قصیدہ موجود ہے، جو ''عقیدت راست کردن با حضرت باری تعالیٰ عزّ اسمہ والتجا نمودن بدرگاہ اوتعالےٰ شانہ وعم نوالہٗ واعظم برہانہٗ'' کے عنوان سے معنون ہے۔

موضوعی ومعروضی فکر وخیالات ، جدید اسلوبِ بیان اور خوبصورت تشبیہات و تراکیب سے مزیّن حمدیہ قصیدہ تحریر کیا ہے۔ صنائع بدائع کا استعمال جگ مگ جگ مگ کر رہا ہے۔دیوانِ سخن میں موجود حمدیہ قصیدے کا مطلع ملاحظہ ہو:

لا کے کھلا دے زاہدا قلبِ برشتہ سمک
مجھ کو ہے شغل مے کشی لیل ونہار بے گزک (۵۲)

قصیدہ محض عروضی ترکیب کا نام ہی نہیں بلکہ مخصوص اجزائے ترکیبی کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کے شکوہ وطمطراق کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔الفاظ کی تراش خراش ،شُستہ اور رواں اسلوب ان کا خاصا ہے۔ان کی شاعری حالی کے اسلوب اور فکر کی طرح نیچرل

شاعری کے معیار کی ہے۔:

جلوہ دکھا کے خلد میں جانِ حزیں کو دے سرور
اپنے جمالِ پاک سے قلب کو میرے کر خنک (۵۳)

کشتی خضر، صدائے ساز، رونقِ حسنِ مہوشاں، واحد و لاشریک، لم یزل، اسمائے الحسنیٰ کا استعمال، لوح و قلم، اُلوہیت، شمس و قمر، نجوم، زہرہ و کہکشاں، رعد و برق، بحر و قلزم، لیل و نہار، سمع و بصر، نور و طمعہ، کلمہ طیبہ جیسے موضوعات سے گلدستہ حمدیہ قصیدہ سجایا گیا ہے۔ تشبیب میں من موہن، منظورِ نظر اور بالم سے چھیڑ چھاڑ اور عشق و مستی کے مضمون کو بڑی عمدگی سی بیان کیا ہے۔ ہاں البتہ تشبیب سے گریز کمزور ہے مگر مدح میں قصیدہ نے پھر سے اپنی مشق و مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے قادرالکامی کے جوہر دکھانے کی سعی کی ہے۔ ۲۷ اشعار پر یہ قصیدہ ندرتِ خیال، ڈکشن، اسلوب اور زبان و بیان کی حشمتوں کا اظہار ہے۔ قصیدہ نگار نے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اردو زبان و ادب کو معیاری قصیدہ فراہم کیا ہے۔ تخلیق کائنات کے اسرار و رموز، نظامِ فطرت، اللہ تعالیٰ کی حکمت و صناعی کی جزئیات نگاری انھوں نے بڑے دل آویز انداز میں کی ہے۔

منشی سورج نرائن مہؔر اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کی روایت کا تاباں آفتاب ہے۔ انھوں نے اپنے زورِ قلم کی بنیاد پر اردو حمدیہ قصیدے کو علم و عرفان کا قیمتی اثاثہ فراہم کیا ہے۔ ان کی وفات کا ذکر ڈاکٹر نوید عاجز نے یوں کیا ہے:

”سورج نرائن (م: ۱۹۳۲ء) فلسفہ ویدانت کے پرچارک تھے“ (۵۴)

انھوں نے قصیدہ نگاری میں کشتِ زار کا اضافہ کیا ہے۔ جذبات و قاموس تخیّلات سے فطرت نگاری، حقیقت پسندی اور مدحِ نورِ حق کے تذکرے کو گنجینۂ معنی بنا دیا ہے۔ وہ فلسفہ ویدانت کے نقیب ہونے کے علاوہ رسالہ ”سادھو“ بھی نکالتے رہے۔ شعبہ تعلیم سے منسلک رہے اور کلیدی عہدوں پر فائز رہ کر اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ دہلی تا راولپنڈی امورِ تعلیم اور معاملات محکمہ ان کی نگہداشت میں سرانجام پاتے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے اسی لیے سورج نرائن مہر دہلوی کہلائے۔ انھوں نے دیگر اصنافِ شاعری مثلاً غزل قصیدے، مثنوی اور

قطعے میں ریاضت کی۔ یہ اردو حمدیہ قصیدہ ''قصائدمہر'' سے لیا گیا ہے۔ وہ نظم گوئی کے میدان میں زیادہ فعال نظر آتے ہیں۔ ان کے قصائد علمی سطح پر اعلیٰ اور موضوعاتی سطح پر دھنک رنگوں کی مانند دل کش ہیں۔ انھوں نے داغ دہلوی کا زمانہ پایا۔

''قصائد مہؔر'' اور'' کلام مہؔر'' سے ان کی لسانی اور فنی پختگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ثقیل اور بھاری بھرکم اصطلاحات سے اپنا دامن محفوظ رکھا جس کے باعث کلام میں سادگی اور روانی در آئی ہے۔ حمدیہ قصیدے کا ہر شعر ایک بھرپور مضمون سے مزیّن ہے جس سے ابلاغ اور معنویّت بڑھ گئی ہے۔ معتدل مزاجی کے باعث کلام میں گھمبیرتا اور پیچیدگی کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کے ہاں واہب العطایا، نخل وفرد، زمان ومکاں، چوب وطناب، چرخِ اخضر، چاند تارے، نور، نظامِ شمسی، سمندر، بحر رواں، فلک، فرش، سنسان، جنگل، شجر، خالق البرا، مالک الرعایا انسان کی ساخت و پرداخت، اشرف الخلائق، اشرف الخلاق، رحم وکرم اور بخشش واحسان کے رنگا رنگ موضوع پائے گئے ہیں۔ ربِّ کائنات کی وحدانیت اور اس کی یکتائی کی خوشبو سے تصّورِ الٰہ اور فکرِ قرآن کو از سرِ نو موضوعِ سخن بنا کر اللہ تعالیٰ کی تقدیس کا ازلی وابدی پیغام دیا ہے۔ حواسِ خمسہ کی منطق سے انھوں نے اپنے قصیدے کو مدلل اور پُر مغز بنا دیا ہے۔ حمدیہ قصیدہ لکھنا یقیناً سعادت مندی اور مشیت ایزدی کے حصول کا ذریعہ ہے۔

اردو حمدیہ قصیدے کی روایت میں سب سے طویل حمدیہ قصیدہ لکھنے کا اعزاز بھی سورج نرائن مہؔر دہلوی کو حاصل ہے۔ ان کے ہاں قصیدہ اپنی ممکنہ تابانیوں کے ساتھ جلوہ فگن ہے۔ سورج نرائن مہؔر دہلوی کے ہاں مطالع ملاحظہ ہوں:

اے دو جہاں کے مالک ، اے واہب العطایا
میں حمد کس زباں سے تیری کروں خدایا (۵۵)
اے کہ تیرے نور سے پر نور ہے ارض و سما
پرتوہ تیرا ہے شاہنشاہِ خاور کی ضیا(۵۶)

شیخ غلام یحییٰ حضورؔ عظیم آبادی (م:۱۲۰۶ھ) صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کے دیوان کا نام دیوانِ حضورؔ ہے جسے مختار الدین احمد نے ۱۹۷۷ء میں مرتب کیا۔ حضورؔ تخلص استعمال

کرتے تھے اور عظیم آباد میں پیدا ہونے کی وجہ سے حضورؔ عظیم آبادی کہلائے۔ ''دیوان حضورؔ'' میں ۴۷ اشعار پر مشتمل ایک حمدیہ قصیدہ موجود ہے۔ اس صوفی منش انسان کے کلام میں حکمت اور جڑی بوٹیوں کا ذکر بھی ملتا ہے جس سے ان کے حکیم ہونے کا اشارہ بھی ملتا ہے۔ صوفی منش ہونے کے باعث انھیں بادشاہوں کی مدح سرائی اور سیاسی بکھیڑوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں پڑی اس سے اُن کی خودداری کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس ۴۷ شعروں کے حمدیہ قصیدے میں اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور کائنات کے مخفی رازوں کا بھرپور بیان ہے۔ قصیدہ قلبی و باطنی کیفیات سے معمور ہونے کے ساتھ ساتھ وجدانی شعور سے مملو ہے۔ محبت الٰہی اُن کا وظیفہ بھی ہے اور انتہائی گہری عقیدت کا مظہر بھی ہے۔ ''دیوانِ حضورؔ'' میں موجود حمدیہ قصیدے کا مطلع ملاحظہ ہو:

بوجھی جاتی ہی نہیں وضع جہاں کی مطلق
سخت حیراں ہوں میں دیکھ آئنہ قدرت حق (۵۷)

شیخ غلام یحییٰ حضورؔ عظیم آبادی نے تشبیب میں اپنی فکری پرواز کو بھرپور اُڑان بھرنے دی ہے۔ تشبیب میں علم طب کی اصطلاحات اور طریقہ علاج کو بڑی ٹھوس اور تحقیقی بنیادوں پر اُستوار کیا ہے۔ زورِ بیان، قدرتِ کلام، جوش وخروش اور علمی دانش کو سادگی مگر پُرکاری سے ذریعہ اظہار بنایا ہے۔ مجموعی طور پر قصیدے میں نیاپن اور نیا ڈکشن پایا گیا ہے۔ موالید ثلاثہ، حکیم الحماء، صندل وعنبرو کافور، طلا کندس، شیرۂ کاسنی، عقاقیر، عبدومعبود، اعمٰی، اشعہ نور، ہوسِ سیم وزرو جاہ وحشم، حرص وہوا جیسے الفاظ سے قصیدے کو رونق بخشی۔ چونکہ تمام علوم کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ کتاب قرآن ہے۔ اس لیے شاعران تمام پہلوؤں سے حمدِ باری تعالیٰ بجالاتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دیکھ لے دیدۂ تحقیق سے حیراں مت ہو
دل کے آئینے میں ہے جلوہ نما صورتِ حق
شجرِ معنی کی شاخیں صُورِ ظاہر ہیں
یہ فروعات اسی اصل سے سب ہیں مشتق (۵۸)

مولوی محمد حسین تمناؔ مرادآبادی کو حمد نگاری کے حوالے سے اوّلیت کا درجہ اس لیے

حاصل ہے کیوں کی ''نشیدِ ایمان'' پہلا مجموعہ کلام ہے جس میں صرف حمدیہ کلام ہی کو شامل کیا گیا ہے۔ ''نشیدِ ایمان'' کو اردو زبان وادب میں یہ امتیازی وصف حاصل ہے کہ اس کے علاوہ کسی شاعر نے دیوانِ حمد تحریر کرنے کی سعادت حاصل نہیں کی تھی۔ یہ ان کے جذبے کی شدت اور حمدیہ کلام سے قلبی میلان کی عکاسی ہے۔ یہ حمدیہ قصیدہ مدحیہ ہونے کے باعث تشبیب وگریز کے بغیر ہے۔ خطابیہ انداز میں مدحِ ربِ جلیل بڑے عمدہ انداز میں کی گئی ہے۔ یہ قصیدہ ۲۶ اشعار پر مشتمل ہے۔ اُنھوں نے اپنے فن کے پتھر کو تراش کر انمول ہیرا بنا دیا ہے۔ فکری پختگی کے علاوہ فنی پُرکاری بھی ان کا خاصا ہے۔ مولوی محمد حسین مرادآبادی کا قصیدہ بیانیہ شاعری کا دل آویز پرتو لیے ہوئے ہے۔ یہ جذبات نگاری، منظر نگاری، خیال کی پختگی اور مضمون آفرینی کے حوالے سے بھی اعلیٰ اور عمدہ نمونہ ہے۔ جہاں تک مدح کے جزو کا تعلق ہے۔ اُنھوں نے اپنے تخیّل کے گھوڑے کو خوب دوڑایا ہے۔ انھوں نے الفاظ کی نادرکاری سے بھرپور مدح کرنے کی سعی کی ہے۔ انھوں نے زیادہ تر روایتی لفظیات وتراکیب کو بروئے کار لا کر حمدیہ مضمون قلمبند کیا ہے۔ انھوں نے ایک جوہری کی طرح نگینے چن چن کر قصیدے کا دامن مالا مال کیا ہے۔ قصیدہ جوش اور ہوش کے باہمی ارتباط کا عمدہ نمونہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں، تخلیقی صناعی، جاہ وجلال اور کائنات کی جزئیات نگاری کو مشاہدے اور زورِ بیان کے ذریعے باریک بینی سے بیان کیا ہے۔ تصوف کا ان کی زندگی میں گہرا عمل دخل رہا ہے۔ صوفی ہونے کے باعث سلسلہ نقشبندیہ میں شاہ عبدالغنی دہلوی مہاجر مدنی کے مریدین میں سے تھے۔ آپ وسیع المشرب تھے۔ مطلع کا شعر ملاحظہ ہو:

دونوں جہاں میں کون ہے ایسے کمال کا
لکھے جو ایک حرفِ ثنا ذوالجلال کا(۵۹)

اس دیوان کے آخری صفحات پر لکھی گئی عبارت کو ڈاکٹر سعادت سعید نے یوں نقل کیا ہے:

''پوشیدہ نہ رہے کی آج تک کسی شاعر نے دیوان حمد نہیں لکھا تھا
اب عالم ربانی، صوفی خفانی، شاعر، شاعرِ لاثانی مولانا محمد حسین تمنا
صاحب نقشبندی نے یہ دیوان تصنیف فرمایا ہے اور یہ مصنف مرید
ہیں زہدالاولیا، قدوس الاصغیا، خاتم المحدثین حضرت شاہ عبدالغنی

دہلوی مہاجر مدنی قدس سرہ کے اور حضرت شاہ صاحب نے مدینہ منورہ میں ان کو لکھا تھا کہ یہ بشارت اللہم ایدہ بروح القدس میسر باشند یہ وہ دعا ہے جو جنابِ رسالت پناہ ﷺ نے اپنے مداح حضرت حسانؓ کو دی تھی ، یہ عبارت مطبع گلزار احمد کی جانب سے ہے اس دیوان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک محمد حسین تمنا مراد آبادی کا چھٹا دیوان ہے ان کا ایک نعتیہ دیوان نوائے ایمان کے نام سے ۱۸۹۷ئمیں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا تھا۔''(۶۰)

محمد ابراہیم آزادؔ اردو حمدیہ قصیدے کی روایت میں قیام پاکستان سے قبل کے آخری قصیدہ نگار ہیں۔ان کی وفات کا ذکر ڈاکٹر نوید عاجزؔ نے یوں کیا ہے:

''محمد ابراہیم آزادؔ (م:۸ جون ۱۹۴۷ء)وکیل پیشہ تھے۔''(۶۱)

قیام پاکستان سے قبل اردو حمدیہ قصیدہ کی روایت ایک طویل مسافت طے کر چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں وجدانی شعور بھی ہے اور رُوحانی تجربوں کا عرفان بھی ہے۔وکالت پیشہ ہونے کے باعث ان کا وکالت کی شہرت کا ڈنکا بجتا تھا۔صاحبِ علم و فضل اور پُختہ گو شاعر تھے۔ چمنستان سخن کی بہار حمد پرودگار کرنے کا اعزاز خوش بختی ہے۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی کتاب قرآنِ مجید اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور عظمتوں کا قصیدہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ تسبیح وتہلیل سے رضائے حاکمِ کون ومکان حاصل ہوتی ہے۔وہ بلبل کی طرح ہر اس چمن کے شیدا ہیں جہاں اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کے پھول کھلے نظر آتے ہوں۔شارحِ توحید ذات وصفات بن کر فلسفہ توحید کے پیامبر ٹھہرے ہیں۔منطقی واستدلالی اور واعظانہ انداز سے فکر کو سمو کر التجا کرتے نظر آتے ہیں۔

حافظ سیّد جماعت علی شاہ علی پوری سے ارادت وعقیدت کے باعث اُن کے کلام میں صوفیانہ تصورات بھی در آئے ہیں۔علی پور کی سالانہ مجالس میں شمع محفل بن کر توحید کے پرستاروں کو نور وحدت سے مستنیر کرتے تھے اور انھیں اپنی متصوفیانہ بوقلمونیوں کا حامل قصیدہ سنا کر سامعین سے خُوب داد وصول کرتے تھے۔بے خودؔ دہلوی کا تلمیذ ہونے کا شرف حاصل تھا۔''دیوانِ آزادؔ'' میں مطلع کا شعر ملاحظہ ہو:

تری یکتائی میں حیران ہیں کثرت والے
ایک کثرت میں تجھے پاتے ہیں وحدت والے(۶۲)

قصیدے کی روایت سے انحراف نہیں کیا۔ تاہم روایتی موضوعات گل وبُلبل اور رُخ ورخسار سے اُچاٹ نظر آتے ہیں۔ سخن فہمی اور تفہیم وترسیل میں ماہر تھے۔ بلاغت، علوِ فکر اور آب وتاب کے اعتبار سے ان کے اشعار پُرکشش ہیں۔ تاہم قصیدے کی ہیئت اور فنّی اعتبار سے استاد شعرا کے معیار کے نہیں۔

اردو حمدیہ قصیدے کی روایت میں شامل تمام اردو حمدیہ قصیدہ نگاروں نے عربی اور فارسی قصیدہ نگاروں کی طرح اردو زبان وادب کو عمدہ قصائد سے نوازا ہے۔ قصیدہ نگاروں نے علمیّت، فہم وفراست اور قادر الکلامی سے قرآنِ مجید فرقانِ حمید کی تعلیمات، ارشاداتِ عالیہ اور مشاہداتِ کائنات کو زینتِ قرطاس بنا کر توحید کے گوشے فروزاں کر دیئے ہیں۔ ذاتِ کریم کی صفاتِ عالیہ، اسماء الحسنٰی، مظاہر فطرت، لیل ونہار، ارض وسماوات، ہمہ قسم مخلوقات اور اس کے انعامات واکرامات جیسے موضوعات قصائد میں سموئے گئے ہیں۔ خالقِ کائنات کی صنّاعی، عالمِ بیکراں، نور، وحدت، محسنات، نکہت وچمن آرائی، یکتائی وزیبائی، کبریائی اور رونقِ رنگِ گلستاں حمدیہ قصیدہ نگاروں کا فکرِ سخن اور مرکز ومحور ہے۔ معبودِ برحق سے استعانت عین ایمان ہے۔ ادبیاتِ مشرق میں حمدیہ قصیدہ نگاری کا مقام ومرتبہ اور موضوعاتی کشائش لائقِ تحسین ہے۔ یہ بات بلا تردّد کہی جا سکتی ہے کہ برِّ عظیم میں حمدیہ قصیدہ نگاروں نے قرآنِ مجید سے موضوعات کشید کیے ہیں۔ اس لاریب کتاب کی تعلیمات کو شعری قالب میں ڈھال کر شعری تفسیر کا رُوپ عطا کر دیا ہے۔ یہی اس کا سب سے بڑا حوالہ ہے۔ فنّی محاسن اور علم بیان وبدیع کے اعتبار سے اردو حمدیہ قصیدے کی روایت کے تمام قصیدہ نگاروں نے فنی محاسن کو کمال مہارت سے برتا ہے۔ صنائع لفظی وصنائع معنوی کی تراشیدگی کی بدولت حمدیہ قصائد میں بلا کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ رفیع الدین ہاشمی: ''اصنافِ ادب'' سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸، ص ۲۳

۲۔ القرآن الحکیم: لقمان: آیت ۸

۳۔ ڈاکٹر ایم کمال الدین: ''قصیدہ کا فن اور اردو قصیدہ نگاری'' دربھنگہ بک ہاؤس، دربھنگہ، ۱۹۸۸ء، ص ۸۸، ۸۹

۴۔ ایضاً، ص ۹۹

۵۔ سید مبارز الدین رفعت (مرتب): ''کلیاتِ شاہی'' انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، ۱۹۶۲، ص ۱۰۱

۶۔ زینت ساجدہ (مرتب): ''کلیاتِ شاہی'' اعجاز پرنٹنگ پریس، حیدرآباد، ۱۹۲۶ء، ص ۶۰

۷۔ سید مبارز الدین رفعت (مرتب): ''کلیاتِ شاہی'' ص ۹۹

۸۔ محمد علی اثرؔ: ''غواصی: شخصیت اور فن'' اِکسل فائن آرٹ، حیدرآباد، ۱۹۷۷ء، ص ۵۵

۹۔ پروفیسر محمد بن عمر: ''کلیاتِ غواصی'' نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، دکن، ۱۹۶۹ء، ص ۳۳

۱۰۔ ایضاً ، ص ۴۷

۱۱۔ نصرتی: ''نصرتی، مرتب: مولوی عبدالحق'' انجمن ترقی اردو، نئی دہلی، ۱۹۸۸ء، ص ۲۷۲

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۵۰

۱۳۔ ڈاکٹر محمود الٰہی: ''اردو قصیدہ کا تنقیدی جائزہ'' مکتبہ جامع، نئی دہلی، ۱۹۷۳ء، ص ۱۵۳

۱۴۔ ولیؔ دکنی، ''کلیاتِ ولی'' مرتب: نورالحسن ہاشمی، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو ۱۹۸۹ء، ص ۳۴۷

۱۵۔ ڈاکٹر ایم کمال الدین: ''قصیدہ کا فن اور اردو قصیدہ نگاری'' ص ۱۵۶۔۱۵۷

۱۶۔ ڈاکٹر سعادت سعید: ''قصیدہ کا تہذیبی و فنی مطالعہ'' (مقالہ پی ایچ ڈی اردو) شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، س ن، ص ۲۸۸

۱۷۔ حسرتؔ، ''کلیاتِ حسرتؔ'' مرتب: ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، سرفراز پریس لکھنو، ۱۹۶۶ء، ص ۳

۱۸۔ ڈاکٹر سعادت سعید: ''قصیدہ کا تہذیبی و فنی مطالعہ'' (مقالہ پی ایچ ڈی اردو) ص ۲۹۵

۱۹۔ ایضاً ص ۳۰۶

۲۰۔ سیدہ نادرہ زیدی ''کلیات میر تجلی'' (مقالہ ایم اے اردو) شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۲۶۰

۲۱۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی (مرتب): ''دیوانِ ولاؔ'' ادارہ ادب و تنقید، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۹۲

۲۲۔ ایضاً، ص ۳۰

۲۳۔ ڈاکٹر سعادت سعید: ''قصیدہ کا تہذیبی و فنی مطالعہ'' (مقالہ پی ایچ ڈی اردو) ص ۳۵۵

۲۴۔ انشا اللہ خان: ''کلیات انشا اللہ خان'' مطبع نول کشور لکھنو، ۱۸۷۶ء، ص ۲۱۹

۲۵۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی: ''انشا اللہ خان انشاؔ: حیات، شخصیت اور فن'' القمر انٹر پرائزز، اردو بازار، لاہور، س ن، ص ۳۴

۲۶۔ مصحفیؔ غلام ہمدانی، ''کلیات مصحفیؔ'' مرتب: ڈاکٹر نورالحسن نقوی (جلد پنجم) مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۹ء ص ۳۳

۲۷۔ پروفیسر نذیر احمد (مرتب): ''شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ'' غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء، ص ۱۹۵

۲۸۔ مصحفیؔ غلام ہمدانی، ''کلیات مصحفیؔ'' مرتب: ڈاکٹر نورالحسن نقوی ۳۳ ص

۲۹۔ ایضاً، ص ۳۵

۳۰۔ ڈاکٹر راہی فدائیؔ (مرتب): ''گنجِ شائگان'' الانصار پبلی کیشنز، حیدر آباد (انڈیا)، ۲۰۱۶ء، ص ۶۳

۳۱۔ ایضاً، ص ۲۴

۳۲۔ ایضاً، ص ۶۵

۳۳۔ ڈاکٹر عبدالسلام شاہ: ''کلیاتِ شہزادہ سلیمان شکوہؔ'' نامی پریس لکھنو، ۱۹۸۲ء، ص ۲۳۷

۳۴۔ افتخار امام صدیقی: ''کرامتؔ علی کرامتؔ ایک مطالعہ'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،

دہلی، ۲۰۲۱ء، ص ۱۷

۳۵۔ کرامت علی شہیدؔی: ''دیوانِ شہیدؔی''، مطبع نول کشور، لکھنو ۱۹۰۴ء، ص ۲

۳۶۔ ڈاکٹر سعادت سعید: ''قصیدہ کا تہذیبی وفنی مطالعہ'' (مقالہ پی ایچ ڈی اردو) ص ۳۷۹

۳۷۔ ڈاکٹر صدیقہ ارمان: ''کلیات ممنونؔ'' الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶، ص ۱

۳۸۔ ضیاالدین بدایونی (مرتب): ''مجموعہ قصائد مومن'' الناظر پریس، لکھنو، ۱۹۲۵ء، ص ۱

۳۹۔ ایضاً، ص ۸

۴۰۔ ڈاکٹر سعادت سعید: ''قصیدہ کا تہذیبی وفنی مطالعہ'' (مقالہ پی ایچ ڈی اردو) ص ۴۰۰

۴۱۔ مہدی علی ذکی: ''کلیاتِ ذکیؔ''، مطبع نول کشور، لکھنو، س ن، ص ۲۹۳

۴۲۔ کلب علی خاں فائقؔ: ''کلیاتِ سالک''، مجلس ترقی اردو، لاہور، ۱۹۴۴، ۷۵

۴۳۔ ایضاً، ص ۷۷

۴۴۔ ایضاً، ص ۷۹

۴۵۔ صفیر بلگرامی: ''میلادِ معصومین''، صفیر بلگرامی اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۴ء، ص ۱۷

۴۶۔ ہوشؔ بریلوی: ''کلیاتِ ہوش''، مطبع گلشن فیض، لکھنو، ۱۳۱۳ھ، ص ۲

۴۷۔ ڈاکٹر سعادت سعید: ''قصیدہ کا تہذیبی وفنی مطالعہ'' (مقالہ پی ایچ ڈی اردو) ص ۴۴۳

۴۸۔ صفدر رام پوری: ''کلیاتِ صفدر''، مطبع نامی منشی نول کشور، لکھنو، س ن، ص ۹۹۴

۴۹۔ ڈاکٹر سعادت سعید: ''قصیدہ کا تہذیبی وفنی مطالعہ'' (مقالہ پی ایچ ڈی اردو) ص ۵۲۸

۵۰۔ صفدر رام پوری: ''کلیاتِ صفدر''، مطبع نامی منشی نول کشور، لکھنو، س ن، ص ۵۰۲

۵۱۔ ایضاً، ص ۵۰۴

۵۲۔ سخنؔ دہلوی: ''دیوانِ سخن''، مطبع نامی نول کشور، لکھنو، س ن، ص ۷

۵۳۔ ایضاً، ص ۹

۵۴۔ ڈاکٹر نوید عاجز: ''اردو حمدیہ قصیدے کی روایت'' مشمولہ ''نعت رنگ'' کراچی، مئی ۲۰۲۲ء، ص ۲۶۶

۵۵۔ منشی سورج نرائن مہؔر دہلوی: ''قصائد مہر'' مطبع سادھو پریس، دہلی، س ن، ص ۹

۵۶۔ ایضاً: ''کلامِ مہؔر''، مطبع مفید عام، لاہور، س ن، ص ۲۵

۵۷۔ حضوؔر، ''دیوانِ حضور'' مرتب: مختار الدین احمد، بہار اردو اکادمی، بہار، ۱۹۷۷ء، ص ۴۵

۵۸۔ ایضاً، ص ۴۷

۵۹۔ محمد حسین تمنؔا: ''نشید ایماں''، مطبع گلزار احمدی، مراد آباد، ۱۳۰۹ھ، ص ۲

۶۰۔ ڈاکٹر سعادت سعید: ''قصیدہ کا تہذیبی و فنی مطالعہ'' (مقالہ پی ایچ ڈی اردو) ص ۴۴۵

۶۱۔ ڈاکٹر نوید عاجؔز: ''اردو حمدیہ قصیدے کی روایت''، مشمولہ ''نعت رنگ'' کراچی، مئی ۲۰۲۲، ص ۲۶۷

۶۲۔ محمد ابراہیم آزاؔد: ''دیوانِ آزاد'' (حصہ دوم) مطبع مرتضائی، آگرہ، ۱۹۳۲ء، ص ۱۷۷

☆☆☆☆☆☆☆

باب سوم

اُردو حمدیہ قصیدہ نگاری

(قیامِ پاکستان تا ۱۹۷۵ء)

ازل کی صبح سے بے وقفہ چل رہی ہے یونہی
خدا کے ایک اشارہ پہ کائنات کی کل
(مولانا ظفر علی خاں)

اُردو حمدیہ قصیدہ نگاری
(قیامِ پاکستان تا ۱۹۷۵ء)

قیامِ پاکستان بیسویں صدی کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اسلام کے نام پر وجود میں آنے والی یہ ریاست اسلام کا قلعہ کہلاتی ہے۔ اس کا قومی نعرہ، نعرۂ تکبیر ''اللہ اکبر'' ہے۔ اس کے قیام کے وقت جو نعرہ زبان زدِ عام تھا، وہ تھا۔ پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ۔ اس کی بنیاد میں توحید اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیّتِ اعلیٰ کا تصوّر کوٹ کوٹ کر بھرا ہُوا ہے۔ اس ریاست کے عظیم لیڈر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اس ریاست کا دستور و آئین قرآن سے ماخوذ ہے۔ مولانا ظفر علی خان نے مؤثر ترین ذریعے، فکری گہرائی و گیرائی سے مدحِ ربِّ جلیل اور تعریف وتوصیف بطریق احسن سرانجام دی ہے۔ آپ کے کلام کی فکری بُنت کا مطمحِ نظر مدحِ ربِّ جلیل کے علاوہ انسانیّت کو توحید اور مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیّت وحاکمیّت کا احساس دلاتے ہوئے ایمانی وایقانی اصلاح واحوال ہے۔ آپ ایمان کو یقین اور گیان کی دولت سے مالا مال کرنا چاہتے ہیں۔ قرآنِ مجید سے موضوعات کشید کر کے قاری و سامعین کو توحید کی فلسفیانہ جہات سے آشنا کرنا آپ کی فکر کا مرکز ومحور ہے۔

کلاسیکی اردو شاعری میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کی روایت اپنی تمام تر فکری رعنائیوں اور توانائیوں سے موجود ہے۔ حمدِ باری تعالیٰ کو بالخصوص اور اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کو بالعموم استاد شعرا نے حرزِ جاں بنائے رکھا۔ اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کی روایت دکن کی سرزمین سے ہوتی ہوئی دہلی، لکھنؤ شہر، کراچی اور لاہور کے شعری دبستانوں کو فکری رفعتوں اور فنّی نقوش سے مستنیر کرتی آرہی ہے۔ علی عادل شاہ ثانی شاہی سے حمدیہ قصیدہ نگاری کا شروع ہونے والا سفر پاکستان کے قیام کے بعد مولانا ظفر علی خان تک پہنچتا ہے۔ اس سفر کے دوران میں حمدیہ قصیدہ اپنی شان وشوکت، جاہ وجلال گھن گرج، دبنگ لب ولہجہ، علوِفکر، نُدرتِ خیال اور توحید کے فلسفیانہ پہلوؤں سے مزیّن رہا ہے۔ حمدیہ قصیدے کی مروّجہ ہیئت اور صنفی شناخت

کے تمام نقوش مولانا ظفر علی خان کے اردو حمدیہ قصائد بڑی عمدگی کے ساتھ فکری عظمت اور فطری خوبیوں سے مزیّن ہیں ۔جس میں قرآنی تعلیمات،آں حضرت ﷺ کے فرمودات، مظاہر فطرت،آفاقی حقائق،توحید کی فلسفیانہ جہات،خالق کی خلاّقی کی صفات اوراعلیٰ افکار کا خزینہ سمو دیا گیا ہے۔پاکستانی اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کی روایت میں پہلا معتبر نام مولانا ظفر علی خان کا ہے۔جو قیامِ پاکستان سے قبل اور قیامِ پاکستان کے بعد مسلمانوں میں یکساں مقبول رہے۔

مولانا ظفر علی خان نے تین اردو حمدیہ قصائد لکھ کر پاکستانی اردو حمدیہ قصیدے کی روایت کو تاب ناک اور عمدہ ترین بنیاد فراہم کر دی ہے۔آپ نے ان حمدیہ قصائد کو ربّ العالمین،حمدِ ذوالجلال اور لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے عنوان سے معنون کیا۔''پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری (از قیامِ پاکستان تا ۱۹۷۵ء) کے دور میں ابھی تک کی تحقیق کے مطابق صرف مولانا ظفر علی خان کا نام سامنے آتا ہے۔مولانا ظفر علی خان نے توحید کے ہمہ جہت موضوعات کو نظم کیا۔آپ نے تمام اصنافِ سخن میں اپنا تشخص،منفرد اسلوب،انقلابی لہجہ،حریّت،حق گوئی،آزادی اور انسانیّت کی آواز اٹھائی۔جب لوگ انگریزوں کی شان میں قصائد لکھ رہے تھے۔اس وقت یہ مردِ حُرّ حمدِ باری تعالیٰ،آقائے دوجہاں نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی مدح وتوصیف اور مسلمانوں کے حقوق کا علم بلند کیے ہوئے تھے۔اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کا فکری وفنّی تجزیّہ سے قبل اُن کی ہمہ جہت شخصیّت کا تعارف ضروری ہے تا کہ اُن کے فکر وفن کو تمام تر خوبیوں سے پرکھا جاسکے۔

مولانا ظفر علی خاں

برِّ عظیم کی سیاست کا باب مولانا ظفر علی خان کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔مخالفین پر بجلی بن کر گرجتے چٹان کی طرح مضبوط ارادوں کے مالک،فرنگیوں کو للکار کر کلمہ حق بلند کرنے والے اور قلم کی دھار کو تلوار کی طرح کام میں لانے والے شیر دل سیاست دان تھے۔حریت کا جذبہ ان کی رگ رگ میں بسا تھا۔قومی اور بین الاقوامی سیاست کے منظر نامے پر مسلمانوں کی دگر گوں حالت اور برطانوی سامراج کی استعماریت نے انہیں بے چین کر رکھا تھا۔مختلف تحریکوں میں کلیدی کردار ادا کیا۔

''مولانا ظفر علی خاں کی پیدائش ۱۸۷۳ء میں قصبہ کوٹ مرتا ضلع
سیالکوٹ میں ہوئی۔ ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ کو لاہور میں ان کا انتقال ہوا'' (۱)

آپ پنجاب کی مردم خیز تحصیل وزیر آباد کے نواحی گاؤں ''کوٹ مہرتھ'' میں پیدا ہوئے۔ آپ ذہین تھے مگر کھیل کود میں شغف رکھتے تھے۔ آپ کے والد گرامی سراج الدین احمد فتو گوجرانوالہ میں رہائش پذیر تھے۔ لیکن اُن کا آبائی علاقہ جہلم تھا۔ مولانا ظفر علی خاں کے والد گرامی سرکاری ملازم تھے جس کے باعث مولانا ظفر علی خاں تعلیم و تربیت کا اہتمام بڑی عمدگی سلیقگی سے کیا گیا۔ اس کے اثرات ان کی بعد کی زندگی پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں کی خوش بختی تھی کہ وہ بیسویں صدی کے شہرت یافتہ شاعر اور صحافی کے گھر پیدا ہوئے۔ مولوی سراج الدین جس محکمہ میں ملازمت کرتے تھے اس پر ہندوؤں کا غلبہ تھا۔ جس کے باعث اُنھیں دُشمنانِ اسلام کے مکروہ چہرے اور منافقت کا بخوبی اندازہ ہوا تو وہ اپنی ہر تحریر و تقریر میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفّظ اور بقاء کا ذکر کرتے تھے۔ مسلمانوں کے عروج و زوال کے تناظر میں وہ ہمیشہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ مسلمانوں کو علمی حوالے سے ہندوؤں کے برابر لانا ہوگا تا کہ سرکاری ملازمتیں حاصل کر کے معاشی و معاشرتی استحکام نصیب ہو سکے۔ آسمانِ علم و ادب کا درخشندہ ستارہ، فکر و نظر، حرّیت اور نصب العین کا محافظ بننے تک کے سفر کے دوران میں مولانا ظفر علی خاں نے اپنے والدِ گرامی کی نصیحت کو ہمیشہ یاد رکھا۔ آپ کے والدِ گرامی نے آپ کو اخبار بند کرنے سے منع کیا۔ جسے آپ نے من و عن قبول کیا اور پھر اس میدان میں اتنی خدمات سرانجام دیں کہ ''بابائے صحافت'' کے لقب سے ملقب ہوئے۔ یوں ''خداداد'' نے خداداد صلاحیّتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے علم و عرفان اور ادب کا چراغ روشن کر کے اپنے نام کا لوہا مولانا ظفر علی خاں کے طور پر منوایا۔

مولانا ظفر علی خاں کے والد خود ملازمت پیشہ تھے اس لیے آپ کی تعلیم پر آپ کے دادا نے خصوصی توجہ دی اور قرآن مجید کی تعلیم دلوانے کے بعد ۱۱ سال کی عمر میں مدرسہ العلوم علی گڑھ بھیج دیا۔

آپ نے ۱۸۹۳ء میں محمڈن کالج علی گڑھ سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان دیا اور اپنے

والدِگرامی کے پاس کشمیر جا کر ملازمت شروع کر دی۔ آپ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''علی گڑھ کالج سے ایف اے پاس کر کے میں کشمیر چلا گیا جہاں
میرے والد سر رشتہ ڈاک کے اعلیٰ افسر تھے اور کچھ عرصہ کے لیے
انھی کے ماتحت اس سر رشتہ میں ملازم ہو گیا۔'' (۲)

آپ نے گریجوایشن کی تعلیم سرسید احمد خاں کے قائم کردہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اس ماحول سے علمی و ادبی، قومی و ملیّ، معاشرتی و سیاسی اور ذہنی نشوونما کو جلا ملی۔ آپ کا شعروشاعری کا فطری میلان اُجاگر ہونے لگا۔ سرسید احمد خاں نے مولانا ظفر علی خاں بارے میں نواب صاحب کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''ظفر علی خاں علی گڑھ کے ان ہونہار طلبہ میں سے ہیں جنھیں آئندہ
چل کر اپنی قابلیت کے بل بوتے پر ملک و قوم کی ذمہ داریاں
سنبھالنی ہیں۔ میں ان میں سے ایک روشن مستقبل کے آثار دیکھ رہا
ہوں۔''(۳)

مولانا ظفر علی خاں ۱۸۹۲ء میں ایف اے پاس کرنے کے بعد سری نگر میں محکمہ ڈاک وتار میں ملازم ہو گئے۔ وہاں انگریز کیپٹن اور بعد ازاں ڈاک خانے کے افسر سے جھگڑے کے بعد ملازمت چھوڑ دی۔ بی اے کے بعد نواب محسن الملک کے پرائیویٹ سیکرٹری بننے کے بعد علمی میدان میں اُترے۔ جس کا اعتراف مولانا ظفر علی خاں نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ:

''ان علمی مشاغل کے لیے جس کے ساتھ مجھے آج تک وابستگی ہے،
میں محسن الملک ہی کے فیضِ تربیت کا رہینِ احسان ہوں'' (۴)

۱۸۹۶ء میں حیدرآباد میں فوج میں لیفٹیننٹ ہوئے لیکن جلد ہی سال سوا سال کے بعد ملازمت سے دست کش ہو گئے۔ ۱۹۰۰ء میں معتمدی عدالت میں صدر مترجم کی حیثیّت سے فرائض منصبی ادا کیے۔ یہ وہ دور تھا جب مولانا ظفر علی خاں کے مشاہیر کی صف میں قدم جمانے کے امکانات روشن ہونا شروع ہوئے۔ آپ کے ''دکن ریویو'' کے علاوہ دیگر رسالوں میں مضامین شائع ہونا شروع ہو چکے تھے۔ جابر حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنا جہادِ اکبر ہے کیوں کہ یہ عمل انجام دینا سرفروشی کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قلم، قدم، اور قسم اٹھانے سے قبل

اس کے انجام سے بخوبی آگاہ ہونا بے حد ضروری ہے۔ انیسویں صدی کے آواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانانِ برصغیر کے سیاسی شعور کو بیدار و اُجاگر کرنے کے لیے علمی و قلمی اقدامات کیے جانے کا آغاز ہوا چاہتا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں کی تحریروں نے قلم کی طاقت اُجاگر کر کے ثابت کیا کہ یہ محض پیشہ نہیں بلکہ اپنے نظریات سے کیا گیا عہد ہے جس کی پاسداری کرتے ہوئے اعلیٰ مقاصد کا ابلاغ بھی ہے۔ مولوی سراج الدین احمد نے ہمہ جہت مفادات کے تناظر میں ''زمیندار'' اخبار جاری کیا تھا۔ اپنے والدِ گرامی کی وفات کے بعد مولانا ظفر علی خاں نے فن، معیار، وقار، حق گوئی اور نظریاتی محافظ کے طور پر اپنے اخبار کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ انھوں نے اردو صحافت کے میدان میں انقلاب برپا کیا۔ تزئین و آرائش، درجہ بندی، افتتاحی اداریہ، کتابت کی صحت کا اہتمام، فکاہیہ کالم، مضامین، تبصرہ جات، خطوط کی تدوین، شعر و ادب، سرخیاں اور شہ سرخیاں ہر ایک سلیقے اور قرینے سے جدید تقاضوں کے ہمہ پلہ تھی۔

مولانا ظفر علی خاں کی صحافتی کوششوں، کاوشوں اور خدمات کے انگریز بھی معترف تھے۔ پروفیسر ڈبلیو۔ سی۔ سمتھ انھیں یوں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:

period this of paper influential Another''
bornabyeditedLahore,ofZamindarwas
profoundlywasHeKhan. AliZafarrebel,
agitations vigorous his and British-anti
issuing was He influence. large had
an-dayatwicepaperhisofCopies20,000
vemacular the for circulation of unheard
northofMuslimsthetimefirsttheforpress;
news to awakening were India
mighty. awakeningand consciousness
seditious the in drank eagerly They
offered Zamindar the that propaganda

(۵’’them.

یوں مولانا ظفر علی خان نے نڈر صحافی کی حیثیت سے مسلمانوں کی فلاح و بہود اور تعمیر وترقی میں سب سے بڑھ کر خدمات انجام دیں۔آپ کی شخصیّت کے اتنے پہلو ہیں کہ آج کے دور میں شاید ہی کوئی بیک وقت سیاست دان اور ادیب ایسا ہو جو ملک وملت کی فلاح و تشخّص کے لیے کوشاں ہو۔لندن سے انڈین پریس ایکٹ کے خلاف ایک بھر پور کھلا خط وزیر ہند کے نام لکھا۔

انڈین سیاسات پر لگ بھگ تین سو صفحات پر مشتمل کتاب لکھ کر برطانوی پالیسیز پر کڑی تنقید کی تھی۔قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر کے اپنے سیاسی مؤقف سے دست بردار نہ ہوئے۔سرسید احمد خان اوران کے رفقاء کی سیاسی خدمات تاریخ کا روشن باب ہے۔

قید و بند کی صعوبتیں،جیل اور ہتھکڑی سیاست دان کا زیور ہوا کرتا ہے۔مولانا ظفر علی خان کا ایک پاؤں جیل ہوتا تو دوسرا باہر مگر مردِ حُرّ نے ملک وملت کی نمائندگی برابر جاری رکھی۔متانت،سنجیدگی،تمکنت اور بہادری ان کا خاصا تھا۔پنجاب کا کالا پانی منٹگمری جیل بھی کاٹی۔تحریک خلافت ہو یا تحریک آزادی ان کی خدمات نا قابلِ فراموش ہیں۔لاہور سنٹرل جیل میں صدر دروازے کی کھڑکی سے جھک کر گزرنے سے انکاری ہو گئے تھے یوں انھوں نے اپنی پیشانی غیر اللہ کے سامنے جھکنے سے محفوظ رکھی۔مجیب الرحمٰن شامی مولانا ظفر علی خان کی قید و بند کی صعوبتوں کے ضمن میں رقم طراز ہیں:

> ’’انہوں نے برسوں جیل میں گزارے،مالی نقصان اٹھایا (آج کے) کروڑوں روپے کی ضمانتیں ضبط کروائیں کانگرس میں رہے،اپنی تنظیم بنائی،مسلم لیگ کے تو وہ اوّلین اجلاس ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کلکتہ وڈھاکہ میں شرکت کا اعزاز رکھتے ہیں۔قائداعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال کے بعد ان کا نام ہماری قومی زندگی کے بلند ترین ناموں میں ہے۔‘‘(۶)

مولانا ظفر علی خان نبی آخرالزماں،نبیِ رحمت،خاتم المرسلین حضرت محمد مصطفٰےﷺ کی ذات اقدس سے بے انتہا اور شدید محبت کرتے تھے۔عشقِ رسولﷺ میں سرشار رہتے

تھے۔ تحفظ ناموسِ رسالت، حرمتِ رسول ﷺ اور شانِ نبوت کے زبرست داعی تھے۔ وہ آقائے نامدار کے ناموس کے لیے تن من دھن قربان کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ جس کا اثبات ان کے کلام اور اعمال دونوں میں مسلمہ ہے۔ انھوں نے اپنے دامن میں عشقِ مصطفیٰ کو سجا لیا تھا۔ وہ عشقِ مصطفیٰ میں انسانیت کی معراج کو پا چکے تھے۔ وہ سرورِ کون ومکاں ،شہنشاہِ عرب وعجم محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ حبیب کبریا ﷺ کی محبت کو متاعِ حیات کا درجہ دیتے تھے۔ ان کا کلام اس بات کا شاہد ہے۔

مولانا ظفرعلی خان کا قلم نثر اور شاعری میں خوب چلتا تھا۔ قادرالکلامی کا یہ عالم تھا کہ ان کے فی البدیہہ اشعار بھی نادرالکلامی کا عمدہ نمونے پیش کرتے۔ مولانا الطاف حسین حالی کے مکتبۂ فکر کے محافظ اور اکبرالہٰ آبادی کی طرح تہذیبِ مغرب اور سامراجیّت کے سخت خلاف تھے۔ اقبال کی فکر کے امین اور داغ دہلوی کے اُسلوب کے وارث تھے۔ کلام میں جذبے کی سچائی اور تخیّل میں کہکشاؤں کا گمان ہوتا ہے۔ قوسِ قزح کے رنگوں کی مانند درخشاں موضوعات اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موجود ہیں۔ زمانہ طالب علمی سے لڑکپن تک اور لڑکپن سے علی گڑھ کی علمی وادبی فضا کے میسر آنے تک ان کی شاعری میں قومی، ملی، مذہبی اور سیاسی موضوعات کی پختگی آتی گئی۔ سیاسی محکومی سے بغاوت، وطن کی آزادی اور قوم کی سربلندی کا خواب دیکھتے تھے۔ اجتماعی درد ان کی انفرادیت میں در آیا ہے۔ تنہا نشینی ہو یا مجلس آرائی، رزم ہو کہ بزم، جیل ہو کہ گھر آورد اور فی البدیہہ تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال تھے۔ عصری مسائل کو دل آویز انداز اور فنی پُرکاری سے پیش کرتے تھے۔ آپ صوفی باصفا اور پُختہ سیاست دان تھے۔ قوم پرستی آپ کے رگ وپے میں موجزن تھی۔

مولوی ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کی تقریر کی طرح مولانا ظفرعلی خان کی تحریر میں جادوئی اثر تھا۔ آپ سرسیّد احمد خاں کی فکر کے داعی، اقبال کے انقلاب کے مجاہد اور مشاہیرِ اسلام کے نظریات کی پُرزور آواز تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ سامراجی قوتوں کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے۔ اسی لیے آپ مسلمانانِ برِّعظیم کے ہیرو اور محسن تسلیم کیے جاتے ہیں۔ آپ نے تقریر اور تحریر دونوں صورتوں میں عظیم اور گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔

۵۹۶صفحات پر مشتمل شاعری کی کتاب ''بہارستان'' دسمبر ۲۰۱۰ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔اس میں موجود ۳۷۴نظمیں مولانا ظفر علی خان کی فکری بالیدگی اور مطمح نظر کی عکاس ہیں۔

۲۰۸صفحات پر مشتمل یہ کتاب ''نگارستان'' دسمبر ۲۰۱۰ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ یہ دوسوسات نظموں پر مشتمل کتاب ہے۔ یہ کتاب برِّعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کا نوحہ اور مرثیہ ہے۔ یہ تحریکِ آزادی اور آزادی کے حصول کے لیے کی جانے والی جدو جہد کے ثمر کی نوید بھی ہے۔استعماریت کے خلاف جہاد، اتّحادِ امّت اور فکر وعمل کی چنگاری جلائے رکھنے کا مشن اس کا موضوع ہے۔ یوں دلوں میں نُور، روحوں میں تازگی ،لہو میں گرمی اوراذہان میں حرّیت وحمیت کا جذبہ فراواں ہوگیا۔

ایک سو چورانوے نظموں پر مشتمل شاعری کی یہ کتاب ''چمنستان'' بھی دسمبر ۲۰۱۰ء میں لاہور سے چھاپی گئی۔ایک سو چھیانوے صفحات پر مشتمل ایک خوددار مزاج کے حامل ادیب کی سوچ کی گہری چھاپ مزیّن ہے۔ایک برہنہ شمشیر جو دشمن کے لیے قہر اوراپنوں کے لیے تحفظ کی علمبردار تھی۔آپ کی قوم پرستی ہی آپ کی شہرتوں کی امین ہے۔

کلمۂ حق بلند کرنے کی پاداش میں آپ نے برسوں جیل کاٹی۔تکلیفیں اٹھائیں۔ شاعری پر مبنی یہ کتاب ''حبسیّات'' دسمبر ۲۰۱۰ء میں لاہور سے اشاعت سے ہمکنار ہوئی۔ ''حبسیّات'' زمانہ اسیری میں لکھی گئی نظموں پر مشتمل کتاب ہے۔ یہ کتاب ۱۴۶صفحات پر مشتمل ہے۔''حبسیّات'' میں موجود ۱۴۴نظموں میں آزادی کے نعروں کی گونج سنائی دیتی ہے۔

تاجدارِ ختمِ نبوت کی ناموس کا پہرہ بڑے بڑے عاشقانِ رسول ﷺ کی طرح دیا۔وہ شمعِ رسالت کا وہ پروانہ تھا کہ جس نے ختم نبوت کے اہم ترین مسئلے کی طرف اُمت کی توجہ دلائی۔آنحضرت ﷺ کی محبت سے سرشار مولانا ظفر علی خان قادیانیوں کا مکروہ چہرہ بے نقاب کیا۔''ارمغانِ قادیان'' ۸۲صفحات پر مشتمل ہے جس میں فتنہ قادیانیت کا قلع قمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب ۷۵نظموں اور متفرق اشعار پر محیط ہے۔

۱۲ ابواب پر مشتمل یہ کتاب'' معرکہ مذہب و سائنس'' ۲۰۱۰ء میں لاہور سے اشاعت سے ہمکنار ہوئی۔اس میں آلاتِ حرب،نزاع مذہب وسائنس، دربارہ ماہیت عالم،

نزاع دربارہ عمر زمین ، نزاع دربارہ معیارِ حق ، نزاع دربارہ انتظام عالم ، لاطینی مسیحیّت ، تہذیبِ جدید، سائنس کا تعلق تمدن جدیدہ اور خطرہ کی آمد کو موضوع بحث بنایا ہے۔ یہ تجدید علم اور اردو ترجمہ کا عمدہ نمونہ اور کارنامہ ہے۔

۸۷ نظموں اور غزلوں پر مشتمل یہ کتاب ''خیالستان'' ۲۰۱۳ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔اس کتاب میں ایمان افروز موضوعات قلوب واذہان کو منور کرتے ہیں۔

نثر اور نظموں پر مشتمل یہ کتاب ''جنگل میں منگل'' ۲۰۱۳ء میں لاہور سے چھپی۔ یہ کتاب رڈیارڈ کپلنگ کی کتاب ''دی جنگل بُک'' کا ترجمہ شدہ ہے۔ یہ کتاب دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہے۔

مولانا ظفر علی خان اس کتاب ''غلبہ روم'' جو کہ ۲۰۱۴ء میں لاہور سے شائع ہوئی اہلِ روم کے احوال وآثار گزشتہ حال اور فردا کی نوید سنائی گئی۔جس کی بنیاد قرآن کی سورہ روم ہے۔ واقعاتِ گزشتہ اور حالاتِ حاضرہ کا نکتہ رس گوئیوں کی آئینہ دار ہے۔

''خمستانِ حجاز'' کو مولانا ظفر علی خان ٹرسٹ نے ۲۰۱۴ء میں شائع کیا۔اس میں نعتیہ کلام، مسلمانوں کی دگرگوں حالت، سیاسی ومذہبی مسائل، ماضی اور حال کا تذکرہ، بیدارءِ شعور اورعزم وہمت کا موضوع سمویا گیا ہے۔

اللہ وحدہ لاشریک کی ذاتِ اقدس کا اسمِ ذاتی اللہ ہے۔مگر اس ذاتِ پاک کو جس نام سے بھی پکاریں وہ شہد سے شیریں، محبوب، راحت افزا، اچّھا اور دولتِ استراحت سے مالا مال ہے۔اللہ تعالیٰ کے مبارک ناموں میں قلبِ مطمئنہ کا سامان موجود ہے۔اللہ تعالیٰ کے ذاتی نام کے علاوہ اس جلال و جمال، کمال وعرفان اور دوام والی ذات کو جس نام سے بھی پکاریں وہ اپنی شان کے مطابق پُکارنے والے کی پُکار کا جواب دیتا ہے۔اللہ تعالیٰ کا مبارک نام من الظلمٰت الی النور کے مسافر کا سرمایہ ہے۔ جب کوئی توحید کی نورانی چھڑی تھام کر رجوع الی اللہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے راضی ہو کر اپنے فضل سے خوب نوازتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اردو حمدیہ قصیدہ نگار عقیدت ومحبت اور عشقِ الٰہی سے سرشار ہو کر اللہ رب العزّت کی بارگاہ میں مدح وستائش کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ باغِ حمد میں بلبلیں نغمۂ توحید کا سرمدی ترانہ

گنگناتی پھرتی ہیں اور اس شاہکار کائنات، ارض و سما، لیل و نہار، روشن آفتاب، دمکتے مہتاب، گلہائے انارِ آتشیں تارے، آنکھوں کو خیرہ کرنے والا نظامِ ہستی، لہلہاتے کھیت و کھلیان، گرجتے سمندر، اٹکھیلیاں کرتی آبشاریں، خوشبو سے مہکتے پھول، پھلوں سے لدی ڈالیاں، مسحور کن نسیمِ برّی و بحری، بادِ صبا، صبح کی نورانی کرنیں، شام کی شفق، رات کے ٹمٹماتے تارے، قوسِ قزح کے رنگ، زمین کا فرش آسمان کی چھت، اذان کی صدا، اللہ اکبر کی تکبیریں، موسموں کی مستیاں خالقِ کائنات کی عظمتوں کی شہادت اور حمدیہ قصیدہ نگاروں کے لیے نشانیاں ہیں۔

قصیدہ نگاری ''ام الاصناف'' ہونے کی حیثیّت سے حمدیہ قصیدہ نگاری کی وہ دل آویز صنفِ سخن ہے جس کی خوشبو سے چمنستانِ حمدیہ قصائد معطّر ہے۔ محبت و عقیدت کا جذبہ جب اسلوب اور جدید طرزِ نگارش سے مزیّن ہوتا ہے تو چشمۂ حمد سے نئے پھوارے پھوٹتے ہیں۔

مولانا ظفر علی خان کے ہاں حمدیہ قصائد قوسِ قزح کے رنگوں کی مانند درخشاں و دل کش ہیں۔ موضوعات کی رنگا رنگی اور تنوّع نے معنویّت کا جامہ پہن رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان، اسماء الحسنیٰ، قرآنی اصطلاحات، فلسفہ وحدت الوجود، فلسفہ وحدت الشہود، جلالت و ہیبت اور تخلیقِ کائنات جیسے موضوعات مولانا ظفر علی خان نے حمدیہ قصائد کی زینت بنائے ہیں۔

قرآن وہ دریچہ ہے جس سے توحید کا نُور جھلکتا ہے۔ قرآن اللہ تعالیٰ کی عظمتوں کے تذکرے سے مستنیر ہے جس میں سامانِ ہدایت بھی ہے اور سامانِ زیست بھی فراواں ہے۔ قرآن حمدِ الٰہی ہے۔ ہر چیز حمد و ثنا، تسبیح و تہلیل میں مصروف ہے۔ ہر صاحبِ دانش و بینش اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاتا ہے کیوں کہ اس کی ذات لائقِ تعریف ہے۔ ایمان کی بنیاد بھی شکر پر اُستوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا قدر شناس ہے جو اس کی نعمتوں کا زبان و بیان سے اعتراف کرتے ہیں۔ قرآن گواہ ہے کہ ہدایت، نجات، خیر و برکت اور دنیوی و اُخروی کامیابی ایمان والوں کا مقدر ہے۔ کائنات کی نشانیوں سے اہلِ بصیرت اور صاحبِ ایمان ہی فائدہ اٹھا کر خدا کی نعمتوں کے حق دار ٹھہرتے ہیں۔ جذبۂ ایمانی کا سراپا مولانا ظفر علی خان کو پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کی روایت میں اوّلیّت کا درجہ حاصل ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد سے لے کر ۱۹۷۵ء تک کسی اور کی قسمت میں حمدیہ قصیدہ گوئی کا اعزاز نہیں

آیا۔مولانا ظفر علی خان کی قصیدہ نگاری کی بنیاد قرآن اور مظاہر فطرت پر اُستوار ہے۔قرآنِ مجید فرقانِ حمید میں اللہ تعالیٰ اس ضمن میں ارشاد فرماتا ہے:

"الَّذِی جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ"(۷)

ترجمہ:"اور جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا تو اس سے کچھ پھل نکالے تمہارے کھانے کو تو اللہ کے لیے جان بوجھ کر برابر والے نہ ٹھہراؤ۔"

آسمان قدرتِ الٰہی کا مظہر ہے۔اس نیلگوں آسمان تلے ان گنت کواکب گردش کر رہے ہیں۔یہ متعیّن سمتوں میں گردش کر رہے ہیں۔یہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و بلندی، عظیم قدرت وسلطنت وحکمت کے شاہکار ہیں۔قرآن میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ"(۸)

ترجمہ:"اور بے شک ہم نے نیچے کے آسمان کو چراغوں سے آراستہ کیا اور انہیں شیطانوں کے لیے مار کیا اور ان کیلیے بھڑکتی آگ کا عذاب تیار فرمایا۔"

مولانا ظفر علی خان کے ہاں اللہ تعالیٰ کی خلاّقی اور قدرتوں کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

بنائے اپنی حکمت سے زمین و آسماں تو نے
دکھائے اپنی قدرت کے ہمیں کیا کیا نشاں تو نے
نہیں موقوف خلاّقی تری اس ایک دنیا پر
کیے ہیں ایسے ایسے سینکڑوں پیدا جہاں تو نے(۹)

نجوم لامعہ کی بے حساب دنیائیں
شموس بازغہ کے زائد از شمار نظام(۱۰)

مولانا ظفر علی خان کی عقیدت جب فنا فی اللہ کا رُوپ دھارتی ہے تو وہ قرآن پاک کے اس موضوع کو زینتِ قرطاس بناتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کے علمِ کامل کو بیان کیا گیا

ہے۔علمِ غیب کو شعری قالب میں ڈھال کر علم الٰہی کا جامع تصوّر پیش کرتے ہیں۔وہ ذات ظاہر و باطن،زمین و آسمان،ماؤں کے پیٹ کی تہہ بہ تہہ تاریکیوں،اگلی پچھلی نسلوں کے احوال،سرگوشیوں،سینوں کے بھیدوں،نیّتوں،غیب کے خزانوں اور خشکی و تری سے واقف ہے۔علمِ غیب اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے۔ارشادِ ربّانی ہے:

"عٰلِمُ الغَیبِ فَلَا یُظْھِرُ عَلٰی غَیبِہٖ اَحَدًا" (۱۱)

ترجمہ: "غیب کا جاننے والا تو اپنے غیب پر کسی کو مسلط نہیں کرتا۔"

مولانا ظفر علی خان نہایت پُر حکمت اور جامع انداز میں بارگاہِ ربِّ جلیل کی صفتِ عالیہ علمِ غیب کو یوں ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔اشعار ملاحظہ ہوں:

ترے ادراک میں ہے عقل حیراں اور سرگرداں
ہمیں چکر میں ڈالا بخش کر وہم و گماں تو نے (۱۲)
نہ جاننا ترا رکھتا ہے حکم جاننے کا
یقیں سے مرتبہ رکھتا سوا ہے یہ ابہام (۱۳)

اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کا ایک نہایت اہم موضوع قرآنی اصطلاحات اور تلمیحات کا استعمال ہے۔یہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات کی صفات کی آئینہ دار ہیں۔اس طرح سے مختلف مقامات پر قرآن کے اللہ تعالیٰ کی اُلوہیّت اور ربوبیّت کے تذکرے کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔سورۃ القریش میں ارشادِ ربّانی ہے۔

"فَلیَعبُدُوا رَبَّ ھٰذَا البَیتِ" (۱۴)

ترجمہ: "تو انہیں چاہیے اس گھر کے رب کی بندگی کریں۔"

مولانا ظفر علی خان کے ہاں قرآن سے موضوعات کشید کرنے کے باعث فکری معیار بُلندیوں اور رفعتوں کو چُھو رہا ہے۔شعری مثالیں ملاحظہ ہوں:

سپیدہ دم کہ ہوا ہے شریکِ رازِ انام
سنا سروش سے **فلیعبدوا** کا میں نے پیام (۱۵)

یہ آستانہ ہے ایسا جہاں گڈریے کو
ملا ہے حضرتِ موسیٰؑ سے کچھ سوا انعام (۱۶)

اللہ تعالیٰ کی ذات بزرگی والی ہے۔مہربانی اس کا شیوہ ہے۔اس ذات سے مایوسی اور نا اُمیّدی گناہ ہے۔اُسے بندے کی ندامت اور اپنے رب سے فضل کی استدعا بڑی پسند ہے۔اس لیے غلطی اور گناہ کے سرزد ہونے کے بعد سرکشی کی بجائے بندہ اُس رحمٰن و رحیم کی طرف رجوع کرے ۔ وہ خاشعین کو بخش دیتا ہے۔مولانا ظفر علی خاں اپنے رب کی انھی عنایات پر حمد سرا ہے۔آپ بڑی حکمت سے امید و رجا دلا کر اللہ کے بندوں کو اپنے خالق کے در سے جوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اللہ تعالیٰ اس حوالے سے قرآنِ مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

"تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِی الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ" (۱۷)

ترجمہ: "بڑی برکت والا ہے تمہارے رب کا نام جو عظمت اور بزرگی والا۔"

سورۃ الزمر میں ارشادِ ربّانی ہے۔

"قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ" (۱۸)

ترجمہ: "تم فرماؤ اے میرے وہ بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اللہ کی رحمت سے نا اُمید نہ ہو بیشک اللہ سب گناہ بخش دیتا ہے بیشک وہی بخشنے والا مہربان ہے۔"

مئے لا تقنطو کے نشے میں سرشار رہتا ہوں
سیہ مستوں کو بخشی ہے حیاتِ جاوداں تو نے! (۱۹)

مئے الست کا محفل میں چل رہا تھا دور
جھلک رہی تھی صُراحی چھلک رہا تھا جام (۲۰)

اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام اللہ ہے۔مگر اللہ کو اس کے صفاتی ناموں سے بھی پکارا جا سکتا ہے کیوں کہ اللہ کے اچّھے اچّھے نام ہیں اس لیے اللہ کو اس کے اچھے ناموں سے پکارا جانا چاہیے۔اللہ تعالیٰ کے ننانوے صفاتی نام ہیں۔جو بڑے بابرکات اور اللہ کی رضا و خوشنودی کے

حصول کا ذریعہ ہیں۔اسمائے الٰہیّہ کا ورد قبولِ دعا کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی شایانِ شان خواہ کوئی بھی نام ہو جس میں الوہیّت، ربوبیّت اور عظمت و رفعت کا بیان ہو، استعمال کیا جا سکتا ہے۔مولانا ظفر علی خان بڑی گہری محبت و عقیدت سے حمدیہ قصائد میں اسمائے الحسنٰی استعمال کرتے ہیں۔نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

شہنشہوں کے شہنشہ خدایگانِ انام
خدائے جل و علا، ذوالجلال والاکرام(۲۱)
خدائے واحد و قہار لا شریک لہٗ
ہوالقدیر، ہوالآخر و ھوالاول(۲۲)

اللہ تعالیٰ کی ذاتِ کریم نے اس کائنات کی تخلیق میں حُسن و جمال کے قرینوں اور حسنِ ترتیب کا بخوبی اہتمام کیا ہے۔شاعر کے ہاں کائنات کا حُسن اس وقت اور بڑھ جاتا ہے جب شاعر حسین و جمیل کائنات، روشن دن، روشن چاند اور سورج کی روشنی سے منوّر دنیا دیکھتا ہے تو اس کا قلم مچل جاتا ہے۔انھوں نے نظامِ فلکی کے ہماری زمین پر اثرات اور اپنے اپنے دائرے میں حرکت کی عمدگی سے اللہ تعالیٰ کی مدح و توصیف کا پہلو نکالا ہے۔حسنِ کائنات کے دیگر پیکروں سے آفتاب و مہتاب اور کہکشاؤں کا نظام ممتاز و ممیّز ہے۔اللہ تعالیٰ نے بغیر ستونوں کے آسمان کھڑا کیا اور پھر اس سے روشن اجسام پیدا کیے۔قرآن سے ماخوذ موضوعات نے مولانا ظفر علی خان کی فکری جولانیوں کو تابانیاں بخشی ہیں۔اس ضمن میں قرآن میں ارشادِ ربّانی ہے:

”اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِی خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِی سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ
اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّہَارَ یَطْلُبُہٗ حَثِیْثًا وَّ الشَّمْسَ وَ
الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِہٖ اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ تَبٰرَکَ
اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ“(۲۳)

ترجمہ: ”بے شک تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمان اور زمین چھ دن میں بنائے پھر عرش پر اِستواء فرمایا جیسا اس کی شان کے لائق ہے رات دن کو ایک دوسرے سے ڈھانکتا ہے کہ جلد اس کے پیچھے لگا آتا ہے اور سورج اور چاند اور تاروں کو بنایا سب اُس کے حکم کے دبے ہوئے

سن لو اسی کے ہاتھ ہے پیدا کرنا اور حکم دینا بڑی برکت والا ہے اللہ رب سارے جہان کا۔‘‘

مولانا ظفر علی خان نے قرآن کے موضوع کو زینتِ کلام بنا کر معنویّت کے نئے گوشے پیدا کیے ہیں۔ مشاہدے سے موضوع کشید کر کے ثنائے ربِّ کریم کی ہے۔ قرآنِ میں ارشاداتِ ربّانی ہیں:

’’اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ
لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ‘‘(۲۴)

ترجمہ:’’بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کی باہم بدلیوں میں نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لیے۔‘‘

’’الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِی
خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَکَ
فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ‘‘ (۲۵)

ترجمہ:’’جو اللہ کی یاد کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں اے رب ہمارے تو نے یہ بیکار نہ بنایا۔ پاکی ہے تجھے، تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔‘‘

قیامِ پاکستان کے بعد کی اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کے اوّلین معمار مولانا ظفر علی خان نے بڑی عمدگی سے مدحِ ربِّ جلیل کے گلشن سے عطر بیز پھول چنے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

چمک چمک کے شہادت خدا کی دیتے ہیں
عطارد و قمر و شمس و مشتری و زحل
یہ چشمہ نُور کا کہتے ہیں آفتاب جسے
ہمیشہ سے اِسی انداز پر رہا ہے ابل (۲۶)

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو انتہائی خوب صورت پیدا فرمایا ہے۔ دنیا کی ہر شے سے اللہ تعالیٰ کی قدرت جھلکتی ہے۔ یہ خوب صورت نظارے، حسین و جمیل مناظر، روانی، اعتدال، موتیوں کی طرح چمکتے ستارے، سورج کی کرنیں اور ہر ذرہ چمکا ہوا جدھر دیکھیے نُور پھیلا ہوا ہے۔ یہ اس عظیم خالق کی نشانیاں ہیں۔ اس نے سورج کو روشنی عطا کی ہے۔ روشنی اس کی عظیم

نعمت ہے۔ یقیناً اس کی شان نرالی ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں ارشاد فرماتا ہے:

"وَّ الشَّمسَ وَ القَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمرِہٖ اَلَا لَہُ الخَلقُ وَ الاَمرُ تَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ العٰلَمِینَ" (۲۷)

ترجمہ: "اور سورج اور چاند اور تاروں کو بنایا سب اُس کے حکم کے دبے ہوئے سن لو اسی کے ہاتھ ہے پیدا کرنا اور حکم دینا بڑی برکت والا ہے اللہ رب سارے جہان کا۔"

"وَّ جَعَلَ القَمَرَ فِیہِنَّ نُورًا وَّ جَعَلَ الشَّمسَ سِرَاجًا" (۲۸)

ترجمہ: "اور اُن میں چاند کو روشنی کیا اور سورج کو چراغ۔"

مولانا ظفر علی خان کے ہاں موضوعات قرآن سے کشید کردہ ہیں۔ شعری مثال ملاحظہ ہو:

ہے سُورج اُس کی عنایت سے ذرّۂ ناچیز
ہے پربت اس کی توجہ سے دانۂ خردل (۲۹)

مولانا ظفر علی خان نے حمدیہ قصائد میں اپنے مخصوص انداز میں خالقِ کائنات کی بارگاہ میں گل ہائے عقیدت پیش کیے ہیں۔ حمدیہ قصائد کا کشتِ زار رنگ برنگے پھولوں سے دل آویز اور خوشبوؤں سے معطّر کیا ہے۔ آپ اپنے انفرادی اور اجتماعی معاملات کو منفرد اُسلوب سے بارگاہِ ایزدی میں پیش کیا ہے۔ وہ اپنے نظریات کو قرآنی تعلیمات پر اُستوار کرتے ہیں۔ قرآن خود اللہ تعالیٰ کی مدح و تعریف کا کامل و اکمل نمونہ ہے۔ قرآن کی تفسیر سے حمدیہ موضوعات کشید کرکے مولانا ظفر علی خان نے پاکستانی اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کو فکری اعتبار سے ادبِ عالیہ کے ہم پلہ کردیا ہے۔ زبان پر ذکرِ ربِّ کریم جاری ہونا بھی اللہ تعالیٰ کے خاص فضل کی نشانی ہے۔ قرآنِ کریم کی حکمتیں، رموز اور استفسار کا اِدراک ہونا بھی بڑا انعام ہے۔ چند شعری مثالیں دیکھیے:

ترے دربار سے مجھ کو یہی انعام کیا کم ہے
کیا اپنی ستائش میں مجھے رطب اللساں تُو نے (۳۰)

رواقِ دل میں ہوئی شمعِ معرفت روشن
چمک اُٹھے مرے قصرِ شعور کے در و بام (۳۱)

عطا ہوئی ہمیں دنیا بھی دین کے ہمراہ
لگے تھے فقر کی ڈالی میں سلطنت کے پھل (۳۲)

مولانا ظفر علی خان نے فلسفہ روح کی تاروں کو بھی چھیڑا ہے۔رُوح امرِ ربیّ ہے۔عمومی طور پر اس مسئلہ میں سکوت اختیار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن مولانا نے جسارت کی ہے۔روح پروردگار کے حکم سے ہے۔ روح کی بدولت انسانی جسم زندگی پاتا ہے۔ یہ کائنات عدم سے وجود میں آئی ہے۔خلق و امر دو الفاظ ہیں وجود میں آنا خلق جب کہ وجود میں آنے سے پہلے شے کا تعیّن امر ہے۔قرآنِ مجید اس فلسفہ کو یوں بیان فرماتا ہے:

"فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ" (۳۳)

ترجمہ: "تو جب میں اسے ٹھیک کرلوں اوراس میں اپنی طرف کی خاص معزز روح پھونک لوں۔"

ایک دوسرے مقام پر ارشادِ ربّانی ہوتا ہے:

"وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّىْ وَمَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا" (۳۴)

ترجمہ: "اورتم سے روح کو پوچھتے ہیں تم فرماؤ روح میرے رب کے حکم سے ایک چیز ہے اور تمہیں علم نہ ملا مگر تھوڑا۔"

مولانا ظفر علی خان نے اپنے موضوع روح کو شعری قالب میں یوں ڈھالا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

فروغ حسن سے اپنے جناب باری نے
جلائی محفلِ ہستی میں روح کی مشعل
وہ روح جو ہوئی مجبور بھی مخیّر بھی
کبھی فلک پہ ہے جس کا کبھی زمیں پہ عمل (۳۵)

اللہ تعالیٰ جلّ شانہٗ کی مدحت، توصیف، حمد، ذکر اور ستائش کا سلسلہ روزِ ازل سے جاری وساری ہے اور یہ سلسلہ لامتناہی ولامحدود ہے۔قرآن جا بجا اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان

کرتا ہے۔ اُسی کے جاہ وجلال کے گُن گانے اور اُسی کی عبادت کا حکم دیتا ہے۔ عالم چہار دانگ اور شش جہات میں اسی کی بڑائی و عظمت کا ڈنکا بج رہا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کو اپنی عبادت کے واسطے پیدا فرمایا ہے۔ ہمیں اُسی ذات کے مبارک نام کی مالا جپتے رہنا ہے۔ تا کہ ہمارا رب ہم سے راضی ہو جائے۔ فرشتے بھی ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور تسبیح و تہلیل میں مگن رہتے ہیں۔ ارشادِ ربّانی ہے:

"وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ"(۳۶)

ترجمہ: "اور میں نے جِنّ اور آدمی اتنے ہی (اسی لئے) بنائے کہ میری بندگی کریں۔"

فرشتوں کے اعداد و شمار اور گنتی کو فقط اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ مگر انسان کی تخلیق سے قبل بھی فرشتے اللہ تعالیٰ کی ثنا پر معمور تھے اور برابر بغیر تعطّل کے تسبیح و تقدیس میں مشغول ہیں۔ مولانا ظفر علی خان نے قرآن سے بڑی مہارت سے موضوع کا انتخاب کر کے حمدیہ قصیدے کی زینت بنایا ہے۔ ان کے ہاں اس فکر انگیز اور مسلمہ موضوع کی مثال ملاحظہ ہو:

لبِ ملائکہ پر تھا ترانۂ توحید
مٹایا روح کے نیّر سے جس نے زنگِ ظلام (۳۷)

اللہ تعالیٰ کی ذات کی عظمتوں اور رفعتوں کو احاطۂ تحریر میں لانا انسانی شعور و عقل کے بس میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کا نُور ہے۔ اس کے اقتدار کی کرسی زمین و آسمان سے وسیع ہے۔ انسانوں پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ اس کی بارگاہ میں سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے جس قدر ممکن ہو سکے اس کی تسبیح و تہلیل کرے۔ انسان کا علم محدود ہے اور وہ ناقص العقل ہے۔ اس لیے مخلوق ہونے کی حیثیّت سے وہ اپنے خالق کی صفات کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ لہٰذا دانش مندی اسی میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کر کے اپنی دنیا اور آخرت سنوار لی جائے۔ مولانا ظفر علی خان کے ہاں اس حوالے سے گہرا شعری شعور ملاحظہ ہوں:

ہر ایک چیز ہے ممکن مگر نہیں ممکن
کہ تیری حمد کا اک شمہ ہو سکے ارقام
جلیں قیاس کے پر قصد اگر کرے اس کا
تری صفات سے ہے اس قدر بعید افہام (۳۸)

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر شفقت و عنایت اور مہربانی کے اظہار کے لیے اپنے لیے الکریم کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ جو اس کی کرم نوازیوں اور مہربانیوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی طرف راغب کرنے کے لیے الکریم کی شان بیان فرمائی ہے تاکہ اس کا بندہ اس کے فضل و کرم اور شفقت و مہربانی سے مایوس نہ ہو۔ کریم کا لفظ کرم سے ہے۔ لہٰذا اس کے معنی عزت، بزرگی، عظمت، نرمی اور کرم نوازی کے ہیں۔ اللہ جلّ شانہ کی رحمت ریت کے ذرّوں، پانی کے قطروں، آفتاب کی کرنوں اور ہوا کے جھونکوں سے کہیں زیادہ لامحدود، لامتناہی اور بے حد و حساب ہے۔ سورۃ النمل میں ارشادِ ربّانی ہے:

"فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ کَرِیْمٌ "(۳۹)

ترجمہ: "تو میرا رب بے پرواہ ہے سب خوبیوں والا۔"

سورۃ المومنون میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے کریم ہونے یعنی عزت والا ہونے کا ذکر ہے۔ وہ ذات تمام خوبیوں اور کمالات سے سرفراز ہے۔ لہٰذا جبینِ نیاز اُس کی عظیم بارگاہ میں جھکا کر کرم سے فیض یاب ہوا جا سکتا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

"فَتَعٰلَی اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِیْمِ "(۴۰)

ترجمہ: "تو بہت بلندی والا ہے اللہ سچا بادشاہ کوئی معبود نہیں سوا اس کے عزت والے عرش کا مالک۔"

مولانا ظفر علی خان نے بڑے فکر انگیز اور حدود و قیود سے آزاد ہو کر اللہ تعالیٰ کے کرم کے موضوع کو حمدیہ قصیدے کی زینت بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق انسان خواہ کسی عقیدے کا مالک ہو وہ رجوع الی اللہ کرے۔ اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت کی بھلائیوں سے مالا مال فرما دے گا۔ اُن کے ہاں شعری مثالیں دیکھیے:

نہ کسرِ شان تری کفر و بُت پرستی سے
نہ وجہ کبر و تفاخر ترے لیے اسلام
تیری نظر میں ہیں شیخ اور برہمن یکساں
تری صلائے کرم ہے زمانہ کے لیے عام (۴۱)

اللہ تعالیٰ کی عظمت، کبریائی، بڑائی اور رفعت کے بارے میں قرآنِ مجید اور فرمانِ رسول ﷺ سے راہنمائی ملتی ہے۔ پیغمبرِ اسلام نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس وحدہٗ لاشریک ہے، وہ الہٰ ہے۔ تمام رموزِ ہستی اور خدا کی عظمتوں کا اِدراک صرف آقائے نامدار ﷺ کی ہستی ہی رکھتی ہے۔ اک عام شخص کے بس کی بات نہیں۔ سورۃ الفاتحہ، الحشر، الصّف، التغابن، الجمعہ، الرحمٰن، الاعلیٰ، الاعراف اور الاخلاص میں اللہ تعالیٰ کی مدح ،ستائش اور مناجات کی مخصوص اصطلاحیں بیان کی گئی ہیں۔ ارشادِ ذوالجلال والاکرام ہے:

''وَاِن مِّن شَیءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمدِہٖ وَلٰکِن لَّا تَفقَھُونَ تَسبِیحَھُم اِنَّہٗ کَانَ حَلِیمًا غَفُورًا'' (۴۲)

ترجمہ: ''اور کوئی چیز نہیں جو اسے سراہتی (تعریف کرتی) ہوئی اس کی پاکی نہ بولیاں تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے بیشک وہ حلم والا بخشنے والا ہے۔''

مولانا ظفر علی خان کے نزدیک فرد کا بنیادی کام اپنے علم و عمل پر نازاں ہونے کی بجائے ثنائے ربِّ جلیل میں سرمست و کوشاں ہونا ہے۔ کیوں کہ انسان کا علم اتنا ہی ہے جتنا اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمایا ہے۔ اپنے اشہبِ قلم دوڑانے والے احاطہ کرنے سے قاصر ہی رہے ہیں۔ پس مولانا نے حمدیہ قصائد لکھ کر اپنی بندگی کا ثبوت دیا ہے۔ یہی اُن کا مطمحِ نظر ہے۔ عشق و وارفتگی سے سرشار ہو کر اپنے سخن میں نعرۂ توحید لگاتے ہیں جس میں تصنّع و ملمع ہرگز نہیں۔ شعری مثال دیکھیے:

سخن وری سے نہیں ہے مجھے کوئی سروکار
نہ لِکھ سکوں میں قصیدہ نہ کہہ سکوں میں غزل (۴۳)

کائنات کا مشاہدہ کرنے سے اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کے بے شمار انکشافات ہوتے ہیں۔ یہ کائنات اپنی ساخت و ہیئت کے اعتبار سے وسعت پذیر ہونے کی صلاحیّت کی حامل ہے۔ قرآنِ مجید فرقانِ حمید خزانۂ علم و معرفت بھی ہے۔ یہ گردشِ لیل و نہار کے ضابطہ کو اللہ رب العزّت کی عظیم نشانیوں میں شمار کرتا ہے۔ اب یہ ہم پہ لازم آتا ہے کہ قرآنی تعلیمات و آیاتِ مقدسہ پر غور و فکر کر کے اس کائنات اور فطرت کو تسخیر کرنے کے لیے نئی جہات تلاش کریں۔ یہ

کائنات کس کے قبضۂ قدرت میں ہے جو دن کو رات میں اور رات کو دن میں بدل رہا ہے۔ ہاں وہ میرا خدا ہے۔ مولانا ظفر علی خان کے کلام میں دنوں کے بدلنے کے نظام کو موضوعِ سخن بنا کر ثنائے ربِّ جلیل کی دلیل پیش کی گئی ہے۔ مدحِ خدا کے لیے مولانا ظفر علی خان نے بڑی عمدگی سے فطری شعار اور نظامِ اجرامِ فلکی کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

نظر فلک پہ اگر ڈالیے ذرا تو ہمیں
دکھائے شعبدہ بازِ لیالی و ایام (۴۴)

مولانا ظفر علی خان نے آفاق سے توحید کے دلائل اختراع کیے ہیں۔ توحید ہی سب سے بڑی سچائی ہے۔ اسی نے روشن ستارے اور ابھرتے ہوئے سورج کی روشنی سے اس گھٹا ٹوپ دنیا کو مستنیر کیا۔ اللہ جلّ شانہ کی ذاتِ بابرکات علو مرتبت، ارفع و اعلیٰ، اختیارات و صفاتِ کاملہ میں بے مثل و بے مثال ہے۔ ذاتی و صفاتی اختیارات میں کوئی اس کا ہم پلہ اور ہم مثل نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات نُور ہے۔ اس نے کائنات کو روشن کرنے کے لیے اپنی حکمت سے سورج اور چاند کو نُور بخشا ہے۔ یوں ستارے رات کے اندھیرے میں راہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ قرآن میں حکمِ ربّی ہے:

”وَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَہٗ مَنَازِلَ
لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ ذٰلِکَ اِلَّا
بِالْحَقِّ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ“ (۴۵)

ترجمہ: ”وہی ہے جس نے سورج کو جگمگاتا بنایا اور چاند چمکتا اور اس کے لیے منزلیں ٹھہرائیں کہ تم برسوں کی گنتی اور حساب جانو اللہ نے اسے نہ بنایا مگر حق نشانیاں مُفصَّل بیان فرماتا ہے علم والوں کے لیے۔“

ایک دوسرے مقام پر بھی ارشادِ ربّانی ہے:

”وَّ جَعَلَ الْقَمَرَ فِیْہِنَّ نُوْرًا وَّ جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا“ (۴۶)

ترجمہ: ”اور اُن میں چاند کو روشنی کیا اور سورج کو چراغ۔“

مولانا ظفر علی خان نے قرآن کا مطالعہ بڑی ژرف نگاہی سے کیا ہے۔ وہ بڑی فکری

سعادت مندی سے قرآنی تعلیمات کوملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی مدح وستائش کرتے ہیں۔شعری مثال ملاحظہ ہو:

نجومِ لامعہ کی بے حساب دنیائیں
شموس بازغہ کے زائد از شمار نظام(۴۷)

آسمان کی تخلیق میں غالب حکمت والے کی حکمت پنہاں ہے۔آسمان سے بادل برسنا، بارشوں کا اترنا، زمین کی سیرابی اور رات کو ستارے چمکانا اہلِ دانش وبینش کے لیے غور و فکر اور اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کو سمجھنے کا سامان ہے۔بغیر ستونوں کے مستحکم اور قائم بلند و بالا آسمان اللہ تعالیٰ کی قدرتِ عظیم کے شاہکار ہیں۔زمین ٹھہرنے کی جگہ اور آسمان ہمارے لیے چھت بنائی گئی ہے۔کرّہ ارض اور آسمان بنا کر اللہ تعالیٰ نے احسان فرمایا ہے۔اب انسانوں کے لیے سزاوار نہیں کہ وہ زمین وآسمان کی عظیم بادشاہت کے مالک کے علاوہ کسی اور کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔آفاقِ عالم کی نشانیاں حقیقت کے اعتراف اور توحید کے اقرار کا سامان ہیں۔ارشادِ ربّانی ہے:

"یٰاَیُّهَا النَّاسُ اعبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِی خَلَقَكُم وَ الَّذِینَ مِن قَبلِكُم لَعَلَّكُم تَتَّقُونَ" (۴۸)

ترجمہ:"اے لوگو اپنے رب کو پوجو جس نے تمہیں اور تم سے اگلوں کو پیدا کیا یہ امید کرتے ہوئے کہ تمہیں پرہیزگاری ملے۔"

"الَّذِی جَعَلَ لَكُمُ الاَرضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزقًا لَّكُم فَلَا تَجعَلُوا لِلّٰهِ اَندَادًا وَّ اَنتُم تَعلَمُونَ"(۴۹)

ترجمہ:"اور جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا تو اس سے کچھ پھل نکالے تمہارے کھانے کو تو اللہ کے لیے جان بوجھ کر برابر والے نہ ٹھہراؤ۔"

مولانا ظفر علی خان نے قدرت کی عظیم نشانیوں کو غور و تدبر اور نصیحت کے لیے حمدیہ

قصیدے کے قالب میں ڈھال کر اپنی فکر کے معیار کو ہمدوش ثریّا کر دیا ہے۔قرآن میں بیان کردہ موضوعات کو حمدیہ قصیدے کی زینت بنانے کی وجہ سے ان کے کلام کو آفاقی درجہ دینے میں کوئی عار نہیں ہونی چاہیے۔بغیر ستونوں کے آسمان کا ثبات اللہ تعالیٰ کی قوّت کا بیّن ثبوت ہے۔ان کے ہاں قرآن سے کشید کردہ موضوعات کی فکری جہات ملاحظہ ہوں:

بنائے اپنی حکمت سے زمین و آسماں تو نے
دکھائے اپنی قدرت کے ہمیں کیا کیا نشاں تُو نے (۵۰)

ہے جلوہ گاہ تری صنعتوں کا پردۂ ارض
کرشمہ ہے تری قدرت کا چرخِ نیلی فام (۵۱)

اس کائنات کی تخلیق کو ہزاروں سال ہو چکے ہیں لیکن یہ حسین وجمیل کائنات آج بھی اپنی تمام تر رعنائیوں اور دل کشی کے ساتھ موجود ہے۔ ہر چیز اپنی اپنی مدار میں گردش کر رہی ہے۔نہ ہی تغیر وتبدلّ ہوا نہ ہی کوتاہی۔ ہر چیز اعتدال،عدل اور معیّنہ حدود وقیود میں اپنا سفر طے کر رہی ہے۔ جو اس خالق کی کمال حکمرانی کی روشن دلیل ہے۔یقیناً ایسا خالق ہی سجدے کے لائق ہے۔قرآن میں اس نظامِ کائنات کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

”وَهُوَ الَّذِی خَلَقَ الَّیلَ وَ النَّهَارَ وَ الشَّمسَ وَ القَمَرَ کُلٌّ فِی فَلَكٍ یَّسبَحُونَ“ (۵۲)

ترجمہ:”اور وہی ہے جس نے بنائے رات اور دن اور سورج اور چاند ہر ایک ایک گھیرے میں پیَر (تیر) رہا ہے۔“

ردوبدل اور تحریف اللہ تعالیٰ کے دستور میں شامل نہیں۔ارشادِ ربّانی ہے:

”لَا تَبدِیلَ لِکَلِمٰتِ اللہ“(۵۳)

ترجمہ:”اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں۔“

مولانا ظفر علی خان اس موضوع کو بڑے دل آویز انداز سے بیان کیا ہے۔ان کے ہاں قرآنی فکر پر مبنی اشعار کی نظائر دیکھیے:

ازل کی صبح سے بے وقفہ چل رہی ہے یونہی
خدا کے ایک اشارہ پہ کائنات کی کل

نظامِ دہر میں تحریف ہو نہیں سکتی
محال ہے کہ ہو اِس قاعدہ میں ردّ و بدل (۵۴)

آنحضرت کی ذاتِ اقدس وجۂ تخلیقِ کائنات ہے۔آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے انسانیّت کے لیے رحمت، ہادی اور خیر خواہ بنا کر بھیجا ہے۔انسانیّت جب آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھی اور تہذیب بھی ریزہ ریزہ ہو رہی تھی تو اللہ تعالیٰ نے انسانیّت پر رحم فرمایا۔اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو رحمت اللعامین بنا کر بھیجا جس سے زندگی کو نیا ڈھنگ نصیب ہوا۔اسلام سے قبل دنیا جہالت کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔تنزلی اور انسانیّت کے احساسات سے عاری معاشرہ تہذیب وتمدن کے نور سے کوسوں دُور تھا۔آنحضرت ﷺ نے اس بھٹکی ہوئی مخلوق کو انسانیّت کا عالمی انسانی حقوق کا منشور دے کر تاریخِ انسانی میں انقلاب برپا کردیا۔آپ ﷺ کی ذات انقلاب کا روشن مینارہ ہے۔اللہ تعالیٰ نے آقائے دو جہاں کو رحمت اللعالمین بنا کر دنیا میں بھیجا۔یہ اعزاز والا لقب اور شرف ایسا ہے جو اس کائنات میں کسی اور کے لیے استعمال نہیں کیا گیا۔یہ عزتوں والا تاج آنحضرت ﷺ کے سر مبارک پر سجایا گیا ہے۔ارشادِ ربّانی ہے:

”وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ“ (۵۵)

ترجمہ:”اور ہم نے تمھیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہان کے لیے۔“

مولانا ظفر علی خان حمدیہ قصیدے پیغمبرِ خدا کو خراجِ تحسین پیش کر کے اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کو ہم پر آشکار کیا ہے۔آنحضرت ﷺ کی ذات ہی ’بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر‘ ہے۔ان کے ہاں چند اشعار دیکھیے:

بہارِ باغِ رسالت کی آمد آمد ہے
خُدائے پاک کی رحمت کے چھائے ہیں بادل
عرب سے اٹھ کے زمانہ پہ یہ گھٹا برسی
درخت سبز ہُوئے پھُوٹنے لگی کونپل
جہاں و اہلِ جہاں کی پلٹ گئی کایا
کھلا دریچۂ رحمت کھلے دِلوں کے کنول (۵۶)

مولانا ظفر علی خان کے کلام میں صنائع بدائع کا کشتِ زار آباد ہے جس سے ان کے حمدیہ قصائد کا مقام و مرتبہ نمایاں ہے کیوں کہ شاعری گہرے جذبات تک رسائی کا نام ہے۔ شاعر سوچوں کے گہرے سمندر میں غوطہ زن ہو کر گوہر تاب دار چن کر کلام کی زینت بناتا ہے۔ صنائع بدائع کلام کی چاشنی، تاثیر اور رمز و ایمائیت کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ پروفیسر عابد علی عابد لکھتے ہیں:

''صنائع بدائع سے شعر کے الفاظ کی نشست و ترتیب میں حسن پیدا کیا جاتا ہے اور نقل و قول سے ایمانی اثر کو بڑھایا جاتا ہے۔ صنعتوں میں حسنِ تعلیل، مبالغہ، تضاد، مقابلہ، ایہام، مراعات النظیر اور تجاہل عارفانہ سب کی سب غزل کی رمزی کیفیّت اور تاثیر کو بڑھاتی ہیں۔ صنائع لفظی اور معنوی سے شاعر کو اپنے تخّیل کی پرواز میں مدد ملتی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ان کا استعمال برمحل ہو، اگر صنعت گری کے اظہار کی خاطر صنعت برتی گئی اور شعر کہا گیا تو رمزی تاثیر مجروح ہو جائے گی۔ صنائع بھی بلاغت سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ ضرور ہے کہ ان سے شعر کی طلسمی تاثیر میں اضافہ ہو کہ نہ کمی''۔(۵۷)

فکر اور فن لازم و ملزوم ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ فنّی مہارت کے بغیر تعمیر کیا گیا محل بھی کشش سے خالی اور بے کیف سی عمارت لگے گی۔ اسلوب، زبان، اندازِ تحریر، باہمی ربط وضبط، انضباط، ترتیب، پیش کش، طرز ادا اور ساخت و ہیئت فن کے زمرے میں آتے ہیں۔ شعراء اپنے اپنے انداز، اسلوب اور ہیئتی تجربات میں اپنے جذبات، احساسات اور خیالات قارئین کی نذر کرتے ہیں۔

عمومی طور پر شعرا کے اسلوب پر مقامی ماحول، معاشرتی اثرات، تہذیبی و تمدنی بود و باش، مذہبی نظریات، سیاسی ماحول، آشوبِ زمانہ اور ذاتی سوچ و بچار کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ جیسے تمام شعرائے کرام اپنے اپنے انفرادی رنگ اور سانچے میں ڈھال کر پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح سے قصیدہ نگار بھی قصیدے کی مروجہ خوبیاں زورِ بیان، ندرتِ خیال، شان

وشوکت،علوِفکر،شکوہِ لفاظ، جاہ وجلال اور فصاحت و بلاغت کی خوبیوں کو بڑی فنّی تراشیدگی سے نمایاں کرتے ہیں۔ یوں قصیدہ کشش، چاشنی ابلاغ اور تاثیر کا مرقع بن جاتا ہے۔حمد ذوالجلال میمیہ قصیدہ ہے۔جس میں ۱۲ شعروں پر مشتمل تشبیب علم وعرفان کا خزینہ اور معرفتِ توحید کا بیان ہے۔تشبیب سے گریز اور گریز سے مدح کا ملاپ بہت عمدہ ہے۔آخر میں حسنِ طلب اور دعا کا اہتمام نہیں ہے۔

مولانا ظفر علی خان نے فکر پر فن کی عمدہ گل کاری کر کے قصیدے کی روایتی عظمت اور جاہ وجلال کو برقرار رکھا ہے۔اُن کے ہاں ۴۳ شعروں کا لامیہ قصیدہ موجود ہے جو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے عنوان سے معنون ہے۔اس میں ۶ شعروں کی تشبیب ہے جو مولانا ظفر علی خان کے اِحساسات و جذبات پر مشتمل ہے۔مختصر گریز کے بعد مولانا بڑی استادانہ مہارت سے مدح کی طرف مڑے ہیں جو خوب صورت باہمی ربط پر دلالت کرتی ہے۔مدح میں مدحِ ربِّ جلیل کے ساتھ ساتھ آنحضرت کے حوالے سے توحید کے فلسفہ کو زینتِ کلام بنایا ہے۔آخر میں حسنِ طلب اور دعا کے اہتمام سے نبی کریم ﷺ کی شفاعت کی استدعا کی گئی ہے۔

بہارستان میں 'خمستانِ ازل کا ساقی' کے عنوان سے مختصر مگر علوِ فکر سے مملو ۲۱ شعروں کا مدحیہ قصیدہ بھی موجود ہے۔ جو تشبیب اور گریز کے بغیر ہے۔ جسے حمد ہی قرار دیا جانا مناسب رہے گا۔ ہاں البتہ اس میں قصیدے جیسا جاہ وجلال اور نُدرتِ خیال پایا گیا ہے۔شاید اس کی وجہ حمدیہ قصائد لکھنے کے باعث اندازِ تحریر کا نکھار در آیا ہے۔قصیدے کے تمام ارکان کا اہتمام نہ ہونے کے باعث قصیدہ خمستانِ ازل کا ساقی صنفی تشکیل کے اعتبار سے کمزور ہے۔'خمستانِ ازل کا ساقی' یہ محض قصائد کے ساتھ ہی شائع ہونے کے باعث قصیدہ کا گمان ہوتا ہے۔

زبان و بیان کی چاشنی مولانا ظفر علی خاں کے حمدیہ قصائد میں زبان و بیان کی چاشنی کے عمدہ نمونے ملتے ہیں جو زبان کی صفائی، خیال کی پاکیزگی، روانی اور فصاحت و بلاغت سے مالا مال ہیں۔ روزمرہ محاورات کے برمحل، مناسب، معقول استعمال سے چاشنی فزوں تر ہوگئی ہے۔ان کے حمدیہ قصائد میں زبان و بیان کی چاشنی ملاحظہ ہوں:

رواق دل میں ہُوئی شمع معرفت روشن
چمک اُٹھے مرے قصرِ شعور کے در و بام (۵۸)

سُراغ ڈھونڈنے اُس کا چلی ہے عقل ضعیف
یہ خوف ہے کہیں ایماں میں آ نہ جائے خلل (۵۹)

عربی وفارسی اثرات

عربی اور فارسی کا اردو زبان وادب سے اٹوٹ رشتہ ہے۔اردو زبان میں دوسری زبان کے الفاظ اپنے اندر سمونے کی قدرت وصلاحّیت موجود ہے۔اسی لچک کے باعث اردو میں دخیل الفاظ کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے۔مولانا ظفرعلی خان نے عربی اور فارسی الفاظ بڑی مہارت سے استعمال کیے ہیں جوان کی علمی شعور،فہم وفراست اور زبانوں کے علم کا ثبوت ہے۔ان کے کلام میں عربی اور فارسی کے الفاظ کی آمیزش کی عمدہ مثالیں ملاحظہ ہوں:

کیا خلوص سے میں نے جبینِ طاعت کو
رہین ِ بارگہ ذوالجلال والاکرام (۶۰)
خدائے واحد و یکتا و لا شریک لہ
ھوالقدیر ھو الآخر و ھو الاول (۶۱)

شکوہِ الفاظ

مولانا ظفرعلی خان نے قصیدے کی شان کے مطابق کلام میں سادہ الفاظ کی بجائے مشکل الفاظ وتراکیب کو برتا ہے جس سے ان کے کلام میں ایک خاص چاشنی اور طرزِ انداز پیدا ہوگیا ہے جسے شکوہِ الفاظ کہہ سکتے ہیں۔اس ضمن میں ابوالاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

> ''صوتی آہنگ اور معنوی فضا کے لحاظ سے بعض الفاظ میں ایک خاص قسم کا طمطراق اور طنطنہ جھلکتا ہے جسے اصطلاح میں شکوہِ الفاظ کہتے ہیں۔''(۶۲)

مولانا ظفرعلی خان نے قصیدے کی شان کے عین مطابق شکوہِ الفاظ کا بھرپور استعمال کر کے اپنے قصائد کو پاکستان کی اردو حمدیہ قصیدہ نگاری میں ممتاز درجے پر فائز کردیا ہے۔جس سے ان کا قصیدہ نگاری کا فن نکھر گیا ہے۔چند اشعار دیکھیے:

یہ نغمہ ہائے نشاط آفرین و شور انگیز
سنُے جو میں نے تو جاتا رہا مرا آرام (۶۳)

نہ نثر ہی کا سلیقہ نہ نظم ہی کا شعور
نہ میں سنائی ثانی نہ ہمسر اخطل (۶۴)

استفہامیہ لہجہ

مولانا ظفر علی خان کے حمدیہ قصائد میں استفہامیہ لہجہ بڑے دل آویز اور پُرکشش انداز میں موجود ہے۔استفہامیہ طرزِ تحریر قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے ساتھ ساتھ ادائے معنی کے نئے نئے پہلو اور جہات متعارف کرواتا ہے۔سوال اور دریافت سے قاری انہماک سے جواب تلاش کر کے حقائق تک رسائی حاصل کرتا ہے۔شعری مثال ملاحظہ ہو:

نہ ہوتی گر خودی ہم میں تو جو تُو تھا وہی ہم تھے
یہ پردہ کس لیے ڈالا ہے یارب! درمیاں تو نے (۶۵)

تراکیب کا استعمال

مولانا ظفر علی خان نے حمدیہ قصائد کو تراکیب کے استعمال سے پرکشش ،دل آویز اور فنی اسلوب کے حوالے سے مؤثر بنا دیا ہے۔ان کے کلام میں تراکیب جگ مگ جگ مگ کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں جس سے کلام کی دل کشی فزوں تر ہو گئی ہے۔ان کے ہاں اضافتی تراکیب ادائے معنی میں جدت پیدا کرتی ہیں۔چند روایتی اضافتی تراکیب کا گلدستہ ملاحظہ ہو: بہارِ عارض،قصرِ شعور،حضرتِ موسیٰؑ،اہلِ حرم،ملتِ بیضا،درسِ تمدن،وغیرہ

کلامِ ظفر میں سہ لفظی اضافتی تراکیب ملاحظہ ہوں:

حقیقتِ شکنِ زلفِ عنبریں،نگہِ چشمِ سرمہ وغیرہ۔

مولانا ظفر علی خان کے ہاں مرکبِ عطفی کا استعمال بھی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے۔مثالیں ملاحظہ ہوں:

زمین و آسماں،جسم و جاں، وہم و گماں، آرائی و رعنائی، دار و رسن،کون و مکاں،آب و ناں، در و بام،کفر و بت پرستی، کبر و تفاخر، جلال و طنطنہ،رد و بدل، جہاں و اہلِ جہاں،احسن و اکمل،اعلم و اعدل، دشت و جبل وغیرہ۔

مولانا ظفر علی خان نے سہ لفظی عطفی تراکیب بھی استعمال کی ہیں:

نیز و عجز و نیایش وغیرہ۔
چہار لفظی عطفی تراکیب کا استعمال ملاحظہ ہوں:
ظہیر و غالب و فیضی و سعدی و خیام، عطارد و قمر و شمس و مشتری و زحل وغیرہ۔ان تراکیب میں پر بڑی فنی چابکدستی سے صوتی و معنوی حسن کی جلوہ گری کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔

سہلِ ممتنع

کلام کو تصنع، بناوٹ اور ملمع سے ہٹ کر سادہ اور رواں الفاظ میں بیان کرنا سہلِ ممتنع کہلاتا ہے۔کلام میں سہلِ ممتنع کا استعمال مہارت سمجھا جاتا ہے۔قصیدے میں سہلِ ممتنع کا استعمال مزید خوبیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔مولانا ظفر علی خاں کے ہاں سہلِ ممتنع کی مثال دیکھیے:

مجال چون و چرا کی تری حضوری میں
نہیں کسی کو وہ جاہل ہو یا کہ ہو عّلام(۶۶)

تجنیسِ خطی

ایسے الفاظ جو شکل و شباہت اور ہیئت کے اعتبار سے ایک جیسے دکھائی دیں۔ان میں فرق محض نقطوں کے باعث ہی کیا جاسکتا ہے۔تجنیسِ خطی کہلاتا ہے۔ان کا استعمال صوری آہنگ پیدا کر کے کلام میں کشش پیدا کر دیتا ہے۔پروفیسر نذیر احمد لکھتے ہیں:

''دو متجانس الفاظ کا بغیر رعایتِ نقاط مشابہ شکل میں واقع ہونا یعنی اگر حروف منقوط پر نقطے نہ ڈالے جائیں تو دو الفاظ ایک جیسے نظر آئیں۔جیسے حظ اور خط۔''(۶۷)

تجنیس خطی کی شعری مثال ملاحظہ ہو:

مئے الست کا محفل میں چل رہا تھا دور
جھلک رہی تھی صُراحی چھلک رہا تھا جام (۶۸)

اس مثال میں ''جھلک اور چھلک'' کے الفاظ میں تجنیس خطی موجود ہے۔اس صنعت کا استعمال مولانا ظفر علی خان کی فنی مہارت کا منھ بولتا ثبوت ہے۔تجنیس خطی کا ستعمال کلام

میں معنوی وصوری حسن پیدا کرتا ہے۔

صنعتِ لزومِ مالا یلزم

اس میں پہلے مصرعے میں کوئی ایک جہت بیان کر کے دوسرے مصرعے میں پہلے بیان شدہ جہت کے پہلوؤں کی وضاحت کی جاتی ہے۔اس ضمن میں پروفیسر نذیر احمد یوں رقمطراز ہیں:

''اس صنعت کو صنعتِ التزام بھی کہتے ہیں۔یعنی ایک امر یا چند ایسے امور کا جو ضروری نہ ہوں غزل یا قصیدے کے ہر شعر میں التزام کرنا۔مثلاً شاعر ہر پہلے مصرع میں کوئی ایک امر بیان کرے اور ہر دوسرے مصرع میں تین تین یا چار چار مثالیں لائے۔جو پہلے امر سے متعلق ہوں۔یا اس کی وضاحت کرتی ہوں یا اسی طرح سے کسی اور غیر ضروری امر کو شعر میں حُسن پیدا کرنے کے لئے لازم ٹھہرالینا۔''(۶۹)

مولانا ظفر علی خان کے حمدیہ قصائد میں اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

اُس امتحان میں جس میں گئے ہوں توڑ قلم
ظہیرؔ و غالبؔ و فیضیؔ و سعدیؔ و خیامؔ (۷۰)

چمک چمک کے شہادت خدا کی دیتے ہیں
عطارد و قمر و شمس و مشتری و زحل (۷۱)

صنعت تکرار

شاعری میں ایک لفظ یا چند الفاظ کو دوہرانے کا عمل صنعتِ تکرار کہلاتا ہے۔صنعت تکرار کا استعمال کلام کو خوبصورت اور حُسن سے مالا مال کر دیتا ہے۔مولانا ظفر علی خان تکرار سے کلام میں تاثیر پیدا کرنے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔اس صنعت کے استعمال سے زورِ بیان ،شان وشوکت اور خوش سلیقگی کلام کی زینت بنتی ہے۔مثالیں ملاحظہ ہوں:

بنائے اپنی حکمت سے زمین و آسماں تو نے
دکھائے اپنی قدرت کے ہمیں کیا کیا نشاں تو نے (۷۲)

قویٰ سبھی مرے کام اپنا اپنا دینے لگے
کہ آ گیا تھا مرے بس میں نفس نافرجام (۷۳)

سیاق الاعداد

سیاق کے لفظی معنی ''حساب، شمار یا گنتی'' وغیرہ کے ہیں۔ شعر میں اعداد کا ذکر کرنا صنعتِ سیاق الاعداد کہلاتا ہے۔ مولانا ظفر علی خان کے ہاں صنعت سیاق الاعداد کے استعمال نے کلام میں زور پیدا کر دیا ہے۔ پروفیسر نذیر احمد لکھتے ہیں:

> ''یعنی کلام میں اعداد کا ذکر کرنا خواہ ترتیب سے ہو خواہ بے ترتیب۔'' (۷۴)

مولانا ظفر علی خاں کے ہاں سیاق الاعداد کی مثالیں دیکھیے:

نہیں موقوف خلاقی تری اس ایک عالم پر
کیے ہیں ایسے ایسے سینکڑوں پیدا جہاں تو نے (۷۵)

خدائے واحد و قہار لا شریک لہ
ھوالقدیر ھو الآخر و ھو الاول (۷۶)

تلمیح

تلمیح میں کسی قصّے، کہانی، واقعے، شخص یا چیز کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو کہ قرآنی یا تاریخی واقعہ ہو سکتا ہے۔ تلمیح کے استعمال سے کلام میں جامعیّت و وسعت کے ساتھ ساتھ کلام کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے۔ نہایت موزوں انداز سے اشارہ کر کے اختصار سے کام لیا جاتا ہے۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی تلمیح کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''زبان کے ابتدائی دور میں چھوٹے چھوٹے سادہ خیالات اور معمولی چیزوں کے بتانے کے لیے الفاظ بنائے گئے تھے۔ رفتہ رفتہ انسان نے ترقی کا قدم آگے بڑھایا۔ لمبے لمبے قصّوں اور واقعات و حالات کی طرف خاص خاص اشارے ہونے لگے۔ جہاں وہ الفاظ زبان پر آئے وہ قصّے، وہ واقعے آنکھوں کے سامنے پھر گئے، ایسا ہر اشارہ تلمیح کہلاتا ہے۔'' (۷۷)

مئے لاتقنطوا کے نشہ میں سرشار رہتا ہُوں
سیہ مستوں کو بخشی ہے حیاتِ جاوداں تو نے (۷۸)

مئے الست کا محفل میں چل رہا تھا دور
جھلک رہی تھی صُراحی چھلک رہا تھا جام (۷۹)

پسند آئی ہے لکنت یہاں بسا اوقات
گیا ہے پاؤں فصاحت کا بار بار پھسل (۸۰)

غیر مردف اشعار

مولانا ظفر علی خان نے عربی قصیدے کی روایت کی پیروی میں دو غیر مردف قصائد لکھے ہیں۔جن میں ایک میمیہ قصیدہ ہے تو دوسرا لامیہ قصیدہ ہے۔حالانکہ بعض قدیم و جدید اردو قصیدہ نگاروں نے ایرانیوں کی تقلید میں قافیے کے ساتھ ردیف کا اضافہ بھی کیا ہے۔خواہ ردیف کا اہتمام کلام کی آرائش وزیبائش میں اضافے کا سبب بنتا ہے مگر مولانا ظفر علی خان نے غیر مردف قصائد لکھ کر اپنی مشّاقی ،استادانہ صلاحیّتوں اور ریاضت کے گہرے نقوش مرتب کیے ہیں۔میمیہ اور لامیہ اردو حمدیہ قصائد کے مطالع ملاحظہ ہوں:

سپیدہ دم کہ ہوا میں شریک رازِ انام
سنا سروش سے فلیعبدوا کا میں نے پیام (۸۱)

زباں ہے وقف ثنائے خدائے عزوجل
خدا ہی ہے جو یہ عقدہ ہو زورِ نطق سے حل (۸۲)

مردف اشعار

ردیف کو اگر شعر کا زیور قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔عربی روایت میں غیر مردف قصائد ہی ملتے ہیں۔قصائد میں ردیف کا اضافہ ایرانیوں نے کیا۔مولانا ظفر علی خان نے ایرانیوں کی تقلید میں ایک مردف اردو حمدیہ قصیدہ بھی لکھا ہے۔مثال ملاحظہ ہو:

بنائے اپنی حکمت سے زمین و آسماں تو نے
دکھائے اپنی قدرت کے ہمیں کیا کیا نشاں تو نے (۸۳)

پہنچتا ہے ہر اک مے کش کے آگے دورِ جام اُس کا
کسی کو تشنہ لب رکھتا نہیں ہے لُطفِ عام اُس کا (۸۴)

توحید کی دعوت دینا، دعوتِ الی اللہ، قرآن کی تعلیمات، توحید اسماو صفات، توحیدِ ربوبیّت، توحیدِ اُلوہیّت، کلمۂ حق، غیر اللہ کا ارتداد، توحید کی رحمت اور شرک کی زحمت بیان کرنا عظیم ترین کارنامہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مشن کی تکمیل کے لیے انبیاء، رسول، پیغمبر مبعوث فرمائے۔ جنھوں نے توحید کی دعوت عزم، حوصلے اور پُرحکمت انداز سے دے کر انفرادی و اجتماعی طور پر توحید کا شعور دیا دانائی، حکمت، دانش مندی، اچھے انداز، خیر خواہی، فہم و فراست، مثبت سوچ اور گہرے جذبات و احساسات سے توحید کا درس دینا ہم پر لازم آتا ہے۔ مولانا ظفر علی خان نے اللہ تعالیٰ کی مدح و ستائش کو بڑے اشتیاق اور انہماک سے حمدیہ قصائد کی زینت بنایا ہے۔ آپ نے حمدیہ قصائد میں موضوعات کو تنوّع و خیال آفرینی اور زبان و بیان کی کامل فن کاری عطا کی ہے۔ اس داورِ محشر و داورِ ارض و سما کے اختیاراتِ کاملہ اور قدرتِ کمالیہ کو خراجِ تحسین پیش کر کے کائنات میں پھیلے اسرار کا بھید دیا ہے۔ جس سے بندہ اپنے ربّ کے قریب ہوتا ہے۔ یوں پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کے معنوی و باطنی گوشے فروزاں اور عیاں ہو گئے ہیں۔ ان کے موضوعاتِ حمد قیامِ پاکستان کے بعد تقریباً تین دہائیوں کا دور اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کے فروغ کا پیش خیمہ ثابت ہوا ہے۔ اصناف کے بدلتے ہوئے رجحانات کے باعث بعض شعری ہیئتیں زوال پذیر ہو رہی ہیں۔ قصیدہ بھی انھی میں سے ایک ہے لیکن اردو حمدیہ قصیدے کے امکانات ابھی روشن ہونے کی امیّد کی جا سکتی ہے۔

۱۹۷۵ء کے بعد حمدیہ قصائد لکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ گو یہ تعداد کم ہے تاہم خوش آئند ہے۔ مولانا ظفر علی خان کے بعد اثر زبیری، سیّد محمد حسین بے چین رجپوری، عبدالعزیز خالد، سیّد اصغر علی شاہ، سیّد قائم مہدی نقوی ساحر لکھنوی، قاضی حبیب الرحمٰن، غلام علی وفا، ڈاکٹر ریاض مجید، ڈاکٹر نوید عاجز، ابوالحسن واحد رضوی، رفیع الدین راز، شاعر علی شاعر، منظر عارفی اور عباس علی شاہ ثاقب (راقم مقالہ) کے نام آتے ہیں۔ اس

میدان میں لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے تا کہ توحید، توحید کے تقاضوں، توحید کی صفات اور توحید کی صفات کے تقاضوں میں وحدانیّت کی شرح وتوضیح کی جا سکے۔ عقلیّت پسندی اور ثنویّت وتثلیث جیسی فاسد العقیدگی کا قلع قمع ہو سکے۔ نسلِ نو کی فکری پا کی وطہارتِ فن کے لیے علوِ فکر کے حامل قصائد سرمایۂ علم ومتاع ہوں گے۔ جن سے آنے والی نسلیں اپنے قلوب واذہان کو توحید کے نُور سے مستنیر کر سکیں گی۔

☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ www.rekhta.org

۲۔ ظفر علی خان: ''آپ بیتی'' مشمولہ نقوش، آپ بیتی نمبر، لاہور، ۱۹۶۴، ص ۳۳۷

۳۔ سر سید احمد خان: ''خط سر سید احمد خان بنام محسن الملک، مشمولہ ظفر علی خان اوران کا عہد، از عنایت اللہ نسیم سوہدروی'' اسلامک پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۱۹۸۲، ص ۱۷۴

۴۔ مولانا ظفر علی خان: ''ازالۃ الخفا'' (سوانح عمری) ''مشمولہ ''روزنامہ زمیندار''، لاہور، اپریل ۱۹۲۸ء، ص ۲

۵۔ Lahore,India,inIslamModernSmith,Pro.W.C p521963,

۶۔ مجیب الرحمٰن شامی: ''اظہاریہ'' مشمولہ ''قید فرنگ'' شورش کاشمیری مولانا ظفر علی خان ٹرسٹ، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۸

۷۔ القرآن الحکیم: البقرۃ: آیت ۲۲

۸۔ القرآن الحکیم: الملک: آیت ۳۰

۹۔ مولانا ظفر علی خان: ''بہارستان'' اردو اکیڈمی، پنجاب، لاہور، ۱۹۳۷، ص ۳

۱۰۔ مولانا ظفر علی خان: ''بہارستان'' ص ۹

۱۱۔ القرآن الحکیم: الجن: آیت ۲۶

۱۲۔ مولانا ظفر علی خان: ''بہارستان'' ص ۳

۱۳۔ ایضاً، ص ۹

۱۴۔ القرآن الحکیم: قریش: آیت ۳

۱۵۔ مولانا ظفر علی خان: ''بہارستان'' ص ۷

۱۶۔ ایضاً، ص ۸

۱۷۔ القرآن الحکیم: الرحمٰن: آیت ۷۸

۱۸۔ القرآن الحکیم: الزمر: آیت ۵۳
۱۹۔ مولانا ظفر علی خان: ''بہارستان'' ص ۴
۲۰۔ ایضاً، ص ۸
۲۱۔ ایضاً، ص ۸
۲۲۔ ایضاً، ص ۱۱
۲۳۔ القرآن الحکیم: الاعراف: آیت ۵۴
۲۴۔ القرآن الحکیم: آل عمران: آیت ۱۹۰
۲۵۔ القرآن الحکیم: آل عمران: آیت ۱۹۱
۲۶۔ مولانا ظفر علی خان: ''بہارستان'' ص ۱۲
۲۷۔ القرآن الحکیم: الاعراف: ۵۴
۲۸۔ القرآن الحکیم: نوح: ۱۶
۲۹۔ مولانا ظفر علی خان: ''بہارستان'' ص ۱۱
۳۰۔ ایضاً، ص ۴
۳۱۔ ایضاً، ص ۷
۳۲۔ ایضاً، ص ۱۳
۳۳۔ القرآن الحکیم: الحجر: آیت ۲۹
۳۴۔ القرآن الحکیم: بنی اسرائیل: آیت ۸۵
۳۵۔ مولانا ظفر علی خان: ''بہارستان'' ص ۱۲
۳۶۔ القرآن الحکیم: الذریت: آیت ۵۶
۳۷۔ مولانا ظفر علی خان: ''بہارستان'' ص ۸
۳۸۔ ایضاً، ص ۸
۳۹۔ القرآن الحکیم: النمل: آیت ۴۰
۴۰۔ القرآن الحکیم: المومنون: آیت ۴۴

۴۱۔ مولانا ظفر علی خان: ''بہارستان'' ص ۹
۴۲۔ القرآن الحکیم: بنی اسرائیل: آیت ۴۴
۴۳۔ مولانا ظفر علی خان: ''بہارستان'' ص ۱۱
۴۴۔ ایضاً، ص ۹
۴۵۔ القرآن الحکیم: یونس: آیت ۵
۴۶۔ القرآن الحکیم: نوح: آیت ۱۶
۴۷۔ مولانا ظفر علی خان: ''بہارستان'' ص ۹
۴۸۔ القرآن الحکیم: البقرۃ: ۲۲۔ آیت ۲۱
۴۹۔ القرآن الحکیم: سورۃ: البقرۃ: آیت
۵۰۔ مولانا ظفر علی خان: ''بہارستان'' ص ۳
۵۱۔ ایضاً، ص ۹
۵۲۔ القرآن الحکیم: الانبیاء: آیت ۳۳
۵۳۔ القرآن الحکیم: یونس: آیت ۶۴
۵۴۔ مولانا ظفر علی خان: ''بہارستان'' ص ۱۲
۵۵۔ القرآن الحکیم: الانبیاء: آیت ۱۰۷
۵۶۔ مولانا ظفر علی خان: ''بہارستان'' ص ۱۳
۵۷۔ پروفیسر سیّد عابد علی عابد: ''اصول انتقاد ادبیات'' ص ۲۳۳
۵۸۔ مولانا ظفر علی خان: ''بہارستان'' ص ۷
۵۹۔ ایضاً، ص ۱۲
۶۰۔ ایضاً، ص ۷
۶۱۔ ایضاً، ص ۱۱
۶۲۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی: ''تفہیم و تحسینِ شعر'' سنگت پبلشر، لاہور، ۲۰۰۶، ص ۸۸
۶۳۔ مولانا ظفر علی خان: ''بہارستان'' ص ۸

۶۴۔ ایضاً،ص۱۱

۶۵۔ ایضاً،ص۳

۶۶۔ ایضاً،ص۱۰

۶۷۔ پروفیسر نذیر احمد: ''اقبال کے صنائع بدائع'' آئینہ ادب، لاہور،۱۹۶۶ء،ص۵۷

۶۸۔ مولانا ظفر علی خان: ''بہارستان''ص۸

۶۹۔ پروفیسر نذیر احمد: ''اقبال کے صنائع بدائع''ص۱۸۲

۷۰۔ مولانا ظفر علی خان: ''بہارستان''ص۸

۷۱۔ ایضاً،ص۱۲

۷۲۔ ایضاً،ص۳

۷۳۔ ایضاً،ص۷

۷۴۔ پروفیسر نذیر احمد: ''اقبال کے صنائع بدائع''ص ۷۶

۷۵۔ مولانا ظفر علی خان: ''بہارستان''ص۳

۷۶۔ ایضاً،ص۱۱

۷۷۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی: ''کشاف تنقیدی اصطلاحات''مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،۱۹۸۵ء،ص۴۷

۷۸۔ مولانا ظفر علی خان: ''بہارستان''ص۴

۷۹۔ ایضاً،ص۸

۸۰۔ ایضاً،ص۱۱

۸۱۔ ایضاً،ص۷

۸۲۔ ایضاً،ص۱۱

۸۳۔ ایضاً،ص۳

۸۴۔ ایضاً،ص۵

☆☆☆☆☆☆☆

باب چہارم

اُردو حمدیہ قصیدہ نگاری

(۱۹۷۵ء تا ۲۰۰۰ء)

اُسی کی ذات ہے شیرازہ بندِ کون و مکاں
اُسی کا ہاتھ ہے دریوزہ بخشِ نشو و نمود
(اثر زبیری)

اُردو حمدیہ قصیدہ نگاری
(۱۹۷۵تا۲۰۰۰)

اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کی روایت از ۱۹۷۵ءتا ۲۰۰۰ء کے دوران میں قصیدہ نگاری کا عمل سست روی سے جاری رہا۔اس دور کے حمدیہ قصائد میں روایتی شان وشوکت، مضمون آفرینی اور تخّیلاتی ارفعّیت پائی جاتی ہے۔قدیم وجدید طرزِ اسلوب اور روایات ومعیارات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے حمدیہ قصائد لکھے گئے۔اس دور کے قصیدہ نگاروں کے ہاں شدّتِ جذبات،تاثیراورزبان وبیان میں خلوص پایا جاتا ہے۔اس دورتک آتے آتے زبان مزید نکھر گئی۔اندازِ بیان پاکستانی ادب کا نمائندہ معلوم ہوتا ہے۔اس میں ہندوؤں کے مذہبی، ہندوستانی تہذیب وتمدّن اور ہندوانہ رسومات کا ذکر نہیں ہے بلکہ پاکستانی تہذیب وتمدّن مذہبی نظریات، دینی فکروشعار اور توحید کے فلسفہ کو بیان کیا گیا ہے۔سندر، سگند، سلونے اور دل آویز موضوعات نے فنِ قصیدہ کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

اردو ادب میں حمد لکھنے والوں کی تعداد حمدیہ قصیدہ نگاروں سے بہت زیادہ ہے۔اُم الاصناف صنفِ سخن ہونے کی وجہ سے بھی شاید استاد اور مشّاق شعراء کے علاوہ کوئی قصیدہ گوئی کے میدان میں نہیں اترتا۔شایداس کی دوسری وجہ زبان وبیان کی شان وشوکت،علوِفکر،پُرشکوہ مضمون،قادرالکلامی،باہمی ارتباط وانسلاک،فنی بالیدگی،فکری پختگی،فصاحت وبلاغت، تراشیدگی،نئی نئی اختر عات اور جاہ وجلال کا اہتمام لازم ہونے کے باعث اس طرف کم رجحان دیکھنے میں آیا ہے۔چُوماچاٹی اور سطحی کلام لکھنے والے شعراحضرات اس میدان میں اُترنے سے گھبراتے ہیں۔اثر زبیری اور بے چین رجپوری کو اس دور کے پاکستانی حمدیہ قصیدہ نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔

پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری (۱۹۷۵ءتا ۲۰۰۰ء) دور کے حمدیہ قصائد علم و معرفت اور توحید کے فلسفیانہ پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔اثر زبیری اور بے چین رجپوری نے

بڑے منطقی انداز، فلسفیانہ بنیادوں، تہ بہ تہ موضوعات، کائنات کی وسعتوں، تخلیقِ کائنات کے رنگوں، حکمتِ ربِّ جلیل، تخلیقی وماورائی توانائیوں، فلسفہ وحدت الوجود، فلسفہ وحدت الشہود، فلسفہ وحدت الوجوب اور توحید کی حکمتوں کی تاروں کو چھیڑ کر علم وفضل کے گوہر چُن چُن کر کلام کی مالا سجائی ہے۔ جنھیں پڑھ کر قاری پر سرشاریّت طاری ہو جاتی ہے۔ فکر و خیال کو حمدیہ قصیدے کی زینت بناتے ہوئے بڑی نیاز مندی اور سلیقے کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ عربی قصیدے کی روایت کے مطابق اثر زبیری اور سید محمد حسین بے چین رجپوری نے بھی غیر مردف حمدیہ قصائد لکھ کر قدیم روایت اور جدید لہجے کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ بعض کمزور پہلوؤں کے باوجود ۱۹۷۵ تا ۲۰۰۰ء کی پاکستانی اردو حمدیہ قصیدہ نگاری علوِ فکر، جاہ وجلال، نُدرت خیال، خیال آفرینی، شکوہ الفاظ، لطافت اور کمال فکر وفن کا مجموعہ ہے۔ جو توحید کے علاوہ زمان ومکان اور اس میں رُونما ہونے والی تبدیلیوں کا آئینہ دار ہے۔ مشینی اور صارفینی دور میں بنی نوع انسان کو رجوع الی اللہ کی رغبت دلا کر دنیا اور آخرت کی بھلائی اور فلاح وکامیابی کا درس دیتے نظر آتے ہیں۔

بیسویں صدی کا اختتام رویّوں کے سرد ہونے کا نوحہ ہے۔ نفسا نفسی نے انسانوں کو ضرورت کا بندہ بنا دیا ہے۔

اؔثر زبیری اور بے چیؔن رجپوری نے عالم گیر اور آفاقی پیغام موضوعِ سخن بنا کر بکھرتے ہوئے شیرازوں کو توحید کے بندھن میں باندھنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ دونوں حمدیہ قصیدہ نگاروں نے اللہ تعالیٰ کی محبّت میں تدبرّ وتفکّر کے بحرِ بیکراں میں غوطہ زن ہو کر معرفت کے موتی چُنے ہیں۔ خدائے عظیم کی عظمت ورفعت بیان کر کے غور وفکر کی دعوت دی ہے تا کہ اس ذات سے آشنائی ہو سکے۔

اؔثر زبیری

اؔثر زبیری تقسیم ہند کے وقت بھارت کے شہر لکھنو سے پاکستان آئے۔ آپ نے پاکستان میں روشنیوں کے شہر کراچی میں سکونت اختیار کی۔ کیوں کہ یہ شہر علم وادب کا مرکز تھا اس لیے آپ کا انتخاب ٹھہرا۔ آپ نے اپنی زندگی کا طویل حصّہ اسی شہر میں گزار کر ادب کی خدمت کی۔ آپ نے کراچی میں ہی وفات پا گئے۔

''آثر زبیری لکھنوی قلمی نام، جب کہ اصل نام مجید الدین احمد تھا۔ آبائی تعلق لکھنو سے تھا۔ کچھ عرصہ کانپور میں بھی مقیم رہے۔ تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان آ گئے اور ملیر (کراچی) میں رہائش پذیر ہوئے۔ یہیں انہوں نے سرکاری ملازمت اختیار کی۔ اسی دوران میں قرآن حکیم کا منظوم ترجمہ مکمل کیا۔ ان کی وفات ۱۹۹۴ء میں کراچی میں ہوئی۔''(۱)

آپ کا ایک قابلِ قدر کارنامہ قرآنِ مجید فرقانِ حمید کا منظوم ترجمہ کرنا ہے۔ جسے ''سحر البیان'' کے عنوان سے معنون کیا گیا ہے۔ جس سے آپ کے علم و فضل کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ قرآن سے خاص رغبت کے باعث اللہ تعالیٰ کی قدرتوں، عنایات، عظمتوں، توحید، فلسفۂ توحید، فلسفہ وحدت الوجود، فلسفہ وحدت الشہود، فلسفہ وحدت الوجوب اور احدیّت و وحدانیّت کا ادراک رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں ایک حمدیہ قصیدہ بھی پایا گیا ہے جو موضوعات کی رنگارنگی سے مملو ہے۔ اثر زبیری کے ہاں سلسبیل میں ۲۸، اشعار پر مبنی حمدیہ قصیدہ موجود ہے۔

آثر زبیری نے اسماء الحسنیٰ کو بڑی ہی خوب صورتی سے حمدیہ قصیدے کی زینت بنایا ہے۔ قرآن مجید میں مذکور اسمائے الٰہیہ کے اُفقِ حمد پر کہکشاں و شفق کی طرح چمکتا اور رنگ بکھیرتا دکھائی دیتا ہے۔ آپ نے صفاتِ ربِّ جلیل جو قرآن میں مذکور ہیں ان کو اپنے کلام کی زینت بنا کر اشعار کو گنجینۂ معنی کا گلدستہ بنا دیا ہے۔ قصیدے کی فصاحت و بلاغت اور پُر شکوہ زبان اس کے موضوع کی بنت میں پنہاں ہے۔ آپ نے قرآن سے اسمائے الحسنیٰ کا انتخاب کر کے بڑی عمدگی سے قصیدے میں سمویا ہے۔

آثر زبیری کے ہاں مؤثر، پُر مغز اور جذبۂ ایمانی سے سرشار اسمائے الحسنیٰ کا استعمال ملاحظہ ہو:

بنامِ داورِ ارض و سما، غفور و ودود
ہے جس کے حکم سے تشکیلِ بزمِ غیب و شہود (۲)

اس وسیع و عریض کائنات کا اِدراک آج بھی انسان کے لیے معمہّ ہے۔ لیکن خالقِ ارض و سما کے تصرف میں سب کچھ ہے۔ اس کے اختیار، اقتدار، شہنشاہیّت اور دائرۂ اختیار میں سب کچھ ہے۔ صحرا ہو کہ جنگل، خشکی ہو کہ تری، پورب ہو کہ پچھّم، قطب ہو کہ دکھن، شش جہات

میں اللہ تعالیٰ کی قدرت ومملکت کے نظام کو بڑی موضوعاتی تراشیدگی سے اثر زبیری نے حمدیہ قصیدے کی زینت بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں کائنات کی شیرازہ بندی کو یوں بیان فرماتا ہے:

ترجمہ: ’’جس نے سات آسمان بنائے ایک کے اوپر دوسرا تو رحمٰن کے بنانے میں کیا فرق دیکھتا ہے تو نگاہ اٹھا کر دیکھ تجھے کوئی رخنہ (خرابی وعیب) نظر آتا ہے۔ پھر دوبارہ نگاہ اٹھا نظر تیری طرف ناکام پلٹ آئے گی تھکی ماندی۔ اور بے شک ہم نے نیچے کے آسمان کو چراغوں سے آراستہ کیا اور انہیں شیطانوں کے لیے مار کیا اور ان کے لیے بھڑکتی آگ کا عذاب تیار فرمایا۔‘‘ (۳)

آثر زبیری کے ہاں اللہ تعالیٰ کی کاری گری، صنعت اور احسن الخالقین ہونے کا شعری شعور ملاحظہ ہوں:

اسی کی ذات ہے شیرازہ بندِ کون و مکاں
اُسی کا ہاتھ ہے دریوزہ بخشِ نشو و نُمود (۴)

وہ صاحب ہمہ قدرت وہ داورِ ہمہ گیر
کہ مملکت میں نہیں جس کی دست گاہِ حدود (۵)

آثر زبیری نے فکری شعور کی پرواز اور تخلیقی قوّت سے موضوعات کو تنوّع وتازگی سے مزیّن کر دیا ہے۔ جذبۂ محبت اور عرفانِ ذات الٰہی ان کی حمدیہ قصیدہ نگاری کا اساس ہے۔ مذہبی اصنافِ شاعری میں حمدیہ قصیدہ نگاری کو اوّلیّت وفوقیت حاصل ہے اور ممدوح کلی اختیارات کا مالک ہے۔ قصیدہ نگار بڑے والہانہ انداز میں شانِ کریمی بیان کرتا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ: ’’اور جتنے بھی ہیں سب کے سب ہمارے حضور حاضر لائے جائیں گے۔ اور ان کے لیے ایک نشانی مردہ زمین ہے ہم نے اسے زندہ کیا اور پھر اس سے اناج نکالا تو اس میں سے کھاتے ہیں۔ اور ہم نے اس میں باغ بنائے کھجوروں اور انگوروں کے اور ہم نے اس میں کچھ چشمے بہائے۔ کہ اس کے پھلوں میں سے

کھائیں اور یہ ان کے ہاتھ کے بنائے نہیں تو کیا حق نہ مانیں
گے۔''(۶)

اللہ تعالیٰ کے حکم کی قوّت اور تصرفِ الٰہ کو اثر زبیری نے بڑی عمدگی سے سپردِ قرطاس کرتے ہیں۔شعر دیکھیے:

ہیں خَلق و اَمر اسی کے تصرّفِ ذاتی
اُسی کے حکم سے ہنگامۂ فنا و وُجود(۷)

اسی کو بنیاد بنا کر اللہ تعالیٰ کی مدح وتوصیف بیان کی ہے۔جس سے شعر کی چاشنی اور معنویّت مزید بڑھ گئی ہے۔لفظ''کُن'' فرما کر اس کائنات کو وجود بخشنا اللہ تعالیٰ کی شانِ الوہیّت کا بیّن ثبوت ہے۔ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ:''نیا پیدا کرنے والا آسمانوں اور زمین کا اور جب کسی بات کا
حکم فرمائے تو اس سے یہی فرماتا ہے کہ ہو جا وہ فوراً ہوجاتی
ہے۔''(۸)

آثر زبیری نے اپنے زورِ قلم سے اس موضوع کو کامل یکسانیّت،ہم آہنگی اور نظم و ضبط سے قلمی مرقّع کا شاہکار بنا دیا ہے۔ان کے ہاں شعری مثال ملاحظہ ہو:

وہی معلمِ یکتا ہے درسِ ہستی کا
کہ لفظِ کن سے کیے جس نے دو جہاں موجود(۹)

یہ کائنات رنگا رنگ اور دل آویز مناظر کا حسین مجسمہ ہے۔اگر کوئی شاعر قوّتِ مشاہدہ،خیالات اور افکار کے ذریعے کمال حاصل نہیں کرسکتا تو یہ اس کی کم مائیگی ہے۔اثر زبیری نے قوّتِ متخیّلہ کو بروئے کار لاتے ہوئے ثنائے ربِّ جلیل کو ایک عظیم ترین فکر وعمل کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔اللہ تعالیٰ کی کریمی کے ازلی وابدی جوہر کو حمد کا موضوع بنایا ہے۔وہ پاک ذات محتاجوں پر رحیم اور ان کے لیے ندیم،ولی اور دوست ہے۔ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ:''اللہ والی ہے مسلمانوں کا انہیں اندھیریوں سے نور کی
طرف نکالتا ہے اور کافروں کے حمایتی شیطان ہیں وہ انہیں نور سے
اندھیریوں کی طرف نکالتے ہیں یہی لوگ دوزخ والے ہیں انہیں

ہمیشہ اس میں رہنا۔‘‘(۱۰)

آثر زبیری کے ہاں قرآنی تعلیمات پر اُستوار شعری مثال ملاحظہ ہو:

کریم ایسا کہ محتاج کو کرے سلطاں
ندیم ایسا کہ نزد رواقِ جاں موجود(۱۱)

بندۂ مومن پہ لازم آتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ذاتی نام اور صفاتی ناموں سے پُکارے۔اللہ تعالیٰ اپنی شان کے لائق اپنے صفاتی نام پُکارنے والوں کی پکار کا جواب دیتا ہے۔اثر زبیری حکمت والی ذات کی حکمتوں کو بڑے دل کش انداز میں بیان کرتے ہیں۔ حکمتوں والے کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔قرآن کی سورۃ الروم میں بیان آب وہوا(پانی اور ہوا)کے مضمون کو موضوعِ سخن بنا کر شعر کو معنوی وقعت کا جامہ پہنا دیا ہے۔قرآن ہواؤں پر اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور ان کے کی مداروں پر حاکم ہونے کا ذکر فرماتا ہے:

ترجمہ:’’اللہ ہے کہ بھیجتا ہے ہوائیں کہ ابھارتی ہیں بادل پھر اُسے پھیلا دیتا ہے آسمان میں جیسا چاہے اور اسے پارہ پارہ کرتا ہے تو تو دیکھے کہ اس کے بیچ میں سے مینہ نکل رہا ہے پھر جب اُسے پہنچاتا ہے اپنے بندوں میں جس کی طرف چاہے جبھی وہ خوشیاں مناتے ہیں۔‘‘(۱۲)

آثر زبیری نے حمدیہ قصیدے کے موضوعات کو قرآنی تعلیمات پر اُستوار کیا ہے۔ شعری مثال ملاحظہ ہو:

حکیم ایسا کہ جس کے مدارِ حکمت پر
مثالِ آسیہ گردش میں ہے یہ چرخِ کبود(۱۳)

اللہ تعالیٰ کی ذات اگر غفور، رحیم، کریم اور حلیم ہے تو وہ جبّار، قہار اور جلال بھی ہے۔اللہ تعالیٰ اپنے ماننے والوں اور پیشانی جھکانے والوں پر رحمٰن ورحیم ہے۔مگر رُوگردانی کرنے والوں اور منکرین کے لیے سخت حساب گیر ہے۔اس کی عدالت میں رائی کے برابر خیر کا صلہ اور رائی کے دانے کے برابر شر کا حساب دینا ہوگا۔اس عدالت سے توحید پرستوں کے لیے انعام واکرام، عزت وشرف اور جنّت کا پروانہ ملے گا جب کہ اس کے برعکس منکرین ومشرکین

کے لیے عذابِ الیم اور جہنّم کا پروانہ جاری ہوگا۔آثر زبیری نے جزا وسزا کے مضمون کو مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔جزا کے موضوع سے خیر وفضل کی امیّد دلا کر اور سزا کے موضوع سے عذاب ِ الٰہی کی وعید سنا کر رجوع الی اللہ کی طرف رغبت دلائی گئی ہے۔ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ:''اس لیے کہ اللہ ہر جان کو اس کی کمائی کا بدلہ دے بیشک اللہ
کو حساب کرتے کچھ دیر نہیں لگتی۔''(۱۴)

اس قرآنی فلسفے کو اثر زبیری نے بڑی ژرف نگاہی سے منتخب کر کے حمدیہ قصیدے کی زینت بنایا ہے۔شعر ملاحظہ ہو:

جلال اس کا جہنم جمال خلدِ بریں
عدالت اس کی ہے بے شبہ عرصہ گاہِ شہود (۱۵)

آثر زبیری نے حمدیہ قصیدے میں فلسفۂ وحدت الوجود کو بنیاد بنا کر مدحِ ربِّ جلیل بیان کرنے کی سعی وکوشش کی ہے۔یہ فلسفہ اہلِ تصوّف کے ہاں پایا جاتا ہے۔اس کائنات میں حقیقی وجود تو فقط اللہ تعالیٰ کا ہے۔مگر چار سُو اس کی قدرتوں کے جلوے دکھائی دیتے ہیں۔جو کچھ مظاہر کائنات میں نظر آتا ہے وہ خالقِ حقیقی کے وجود کا عکس اور مختلف شکلیں ہیں۔

اس کائنات کے رنگا رنگ حسن،خوبصورتی،دل آویزی اور ہر چیز میں اللہ کی شان نظر آتی ہے۔کائنات میں بکھرے آثار اس کائنات کے خالق کی نشانیاں ہیں۔ساری کائنات اسی کی جلوہ گاہ اور مظہرِ ذاتِ الٰہی ہے۔ارشادِ ربانی ہے۔

ترجمہ:''بھلائی والوں کے لیے بھلائی ہے اور اس سے بھی زائد اور
ان کے منہ پر نہ چڑھے گی سیاہی اور نہ خواری وہی جنت والے ہیں
وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''(۱۶)

بھلائی والے اللہ کے مومنین بندے ہیں اور ان کے لئے بھلائی جنّت و دیدارِ الٰہی ہے۔مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ جنّتیوں کو جنّت میں دیدارِ الٰہی اور جمال الٰہی کا نظارہ نصیب ہوگا۔اسی ذات کے نظارے اس عالمِ موجودات میں بھی پائے جاتے ہیں۔یہی نظارے اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اس جہاں میں بھی نظر آتے ہیں۔اثر زبیری کے ہاں یہ موضوع خوب صورت شعری روپ میں ملاحظہ ہوں:

ترے جمال سے اے کارسازِ بزمِ وجود
فروغ گیر ہوئی کہکشانِ زر اندود
ترے قدم کے دلائل حوادثِ کونین
ترے ثبات کی شاہد شکستِ نظمِ نمود(۱۷)

آثر زبیری اس مضمون بندی میں حق بجانب ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی تعداد کو یہ ذرہ ہائے سوادِ فضائے لامحدود نہیں پہنچ سکتے۔جس قدر اللہ تعالیٰ کے اقتدار کی کُرسی وسیع ہے اسی طرح اس کی صفات کا دائرہ وسیع ہے۔قرآن خود صفاتِ الٰہیّہ کا مظہر ہے۔قرآن کلامِ الٰہی اور صفاتِ الٰہی کا علم بردار ہے۔اللہ تعالیٰ کی صفات نہ تو عینِ ذات ہیں اور نہ ہی غیرِ ذات ہیں۔شبِ معراج ذاتِ باری تعالیٰ کا مشاہدہ ہیاور کائنات میں پھیلی قدرتیں صرف صفات کا مشاہدہ ہیں۔اس کی صفات کی کوئی ابتداء اور انتہا نہیں ہے۔کوئی صفات احاطہ شمار میں نہیں لاسکتا۔ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ:''آنکھیں اُسے احاطہ نہیں کرتیں اور سب آنکھیں اس کے احاطہ میں ہیں اور وہی ہے نہایت باطن پورا خبردار۔''(۱۸)

سورۃ طہٰ میں اور سوۃ الشوریٰ میں بھی صفاتِ الٰہیّہ کی کوئی حدو انتہا نہ ہونے کا ذکر بیان ہوا ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی عظمتوں اور صفات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔اس حوالے سے اثر زبیری کے ہاں درج بالا قرآنی تعلیمات سے ماخوذ حمدیہ قصیدے کا شعر ان کی قرآن فہمی و قرآن بینی کا ثبوت ہے۔شعری مثال دیکھیے:

تری صفات کی تعداد کو پہنچ نہ سکے
یہ ذرہ ہائے سوادِ فضائے لا محدُود(۱۹)

آثر زبیری نے مدحِ ربِّ جلیل کے لیے انبیاء کرام کو عطا کیے گئے اعزازات، معجزات اور کمالات کو موضوع بنا کر تخلیقی فعالیّت و منطقی دلیل کا مظاہرہ کیا ہے۔انھوں نے حبیبِ کبریا ﷺ، حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ، حضرت اسمٰعیلؑ ذبیح اللہ، حضرت عیسیٰؑ روح اللہ اور حضرت آدمؑ صفی اللہ کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی عطاؤں کے تذکرے نے فکری معنویت میں

اضافہ کر دیا ہے۔انبیاء کرام اللہ کے برگزیدہ اور چنیدہ بندے ہوتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ان پر وحی نازل کر کے اپنے پیغامات انسانوں تک پہنچاتا ہے۔یوں اللہ اور بندوں کے درمیان میں انبیاء کرام علم و عرفان ،راز و نیاز، بھید و اسرار اور اصولِ شریعہ بیان کرتے ہیں جس سے انسانیت کو راست راہنمائی ملتی ہے۔جو یقیناً اللہ تعالیٰ کا انسانوں پر خاص فضل و کرم ہے۔اس نہج کے حامل چند اشعار دیکھیے:

ترے حبیب کے فرشِ قدم یہ ہفت افلاک
ترے خلیلؑ پہ گلزار آتشِ نمرود
ترے ذبیحؑ کا تحفہ یہ چشمہ زم زم
ترے مسیحؑ کا صدقہ شفائے برصِ جلود
ترے صفیؑ سے ہویدا کمالِ خَلق ترا
وہ سب کا قبلۂ اوّل وہ ظاہراً مسجود(۲۰)

آثر زبیری کے حمدیہ قصیدے میں ایسے اشعار بھی دیکھنے میں آئے ہیں کہ کامیاب کون ہوا؟ کامیاب ہونے والوں کی کامیابی کی وجہ کیا تھی؟ کامیاب ہونے والوں نے کس کی پیروی کی؟اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب کا شکار ہونے والے کون تھے؟ سرکشانِ توحید کون کون سی اقوام تھیں؟ قرآن میں بیان کردہ اقوام کا حال کیا ہوا؟ تقابلی طرزِ گفتگو سے ابلاغ میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔یوں اثر زبیری نے بڑے فکر انگیز انداز میں اعمال و افکار کا محاسبہ کرنے پر قاری کو مجبور کر دیا ہے۔یوں احساس کو بیدار کیا گیا ہے۔توحید بیان کرنے کا عمدہ انداز اپنا کر انجام سے باخبر بھی کر دیا ہے۔قرآن مجید متعدد سورتوں میں متعدد مقامات پر قوم عاد و ثمود کا انجام بیان کرتا ہے۔چند آیات ملاحظہ ہوں:

ترجمہ:''اور عاد اور ثمود کو ہلاک فرمایا اور تمہیں ان کی بستیاں معلوم ہو چکی ہیں اور شیطان نے اُن کے کوتک (کرتوت) ان کی نگاہ میں بھلے کر دکھائے اور انہیں راہ سے روکا اور اُنہیں سوجھتا تھا۔(۲۱)

حٰم السجدۃ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

ترجمہ:''اور رہے ثمود انہیں ہم نے راہ دکھائی تو انہوں نے سوجھنے

پراندھے ہونے کو پسند کیا تو انہیں ذلت کے عذاب کی کڑک نے
آلیا سزا اُن کے کیئے کی۔''(۲۲)

سورۃ ھود، العنکبوت، الحقاف، الاعراف اور سورۃ الفرقان میں قومِ عاد و ثمود کی سرکشی جرائم، ہٹ دھرمی، انجام اور تباہی کا منظر جو قرآن نے بیان کیا ہے اسے اثر زبیری نے بڑی فکری پختگی اور مشاقی سے شعری صورت میں پیش کر کے علوِ فکر کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ مقامِ فکر ہے۔ ہمیں بھولا ہوا سبق یاد دلانے کے لیے قرآنی موضوعات بیان کیے ہیں۔ شعر دیکھیے:

نثارِ راہ ترے عارفانِ روم و حبش
شکارِ قہر ترے سرکشانِ عاد و ثمود(۲۳)

اثر زبیری نے انعام یافتہ جماعت کا تذکرہ کر کے یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ مرسلین اور صدیقین جیسی اتباع و پیروی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ وہ ذات جس کے مطیع و فرماں بردار فرشتے ہیں اور ہمہ وقت اس کی کبریائی و ثنا بیان کرتے ہیں۔ مگر پھر بھی کیا مجال کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و رفعت کا احاطہ اور حقِ عبادت ادا کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے اس کی تمام مخلوقات کے لیے بہت بڑی نعمت ہیں۔ ان ہستیوں کا وجود خیر و برکت اور اللہ کے انعامات و اکرامات کا موجب ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ: ''اور جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے تو اُسے ان کا ساتھ
ملے گا جن پر اللہ نے فضل کیا یعنی انبیاء اور صدیق اور شہید اور نیک
لوگ یہ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں''(۲۴)

شاعر کا مطمحِ نظر مدحِ ربِّ جلیل سے ہے۔ اثر زبیری نے انعام یافتہ جماعت کا تذکرہ کر کے ہمیں ان کی روش پر چلنے کی ترغیب دلائی ہے۔ گہری سوچ کے عکاس چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رہینِ لطف ترے مرسلینؑ و صدیقینؒ
مطیعِ حکم ترے سب ملائکہؑ کے جنود
مجال کیا تری حمد و ثنا کی مجھ کو، کہ ہوں
میں ایک بندۂ ناچیز و کم سوادِ وجود(۲۵)

آثر زبیری نے حمدیہ قصیدے کے آخر میں اللہ تعالیٰ سے صلے کے طور پر رحم وکرم کی التجا کی ہے۔روزِ جزا آنحضرتﷺ کی شفاعت کا طلب گار ہے۔وہ دشمنِ مردود کے تلبیس کے اثر نہ کرنے کا خواہش مندبھی ہے۔حسنِ طلب کے طور پر خاتمۂ بالایمان کا آرزومند ہے۔آخری گھڑی کلمۂ توحید یعنی اللہ تعالیٰ کے نام جاری ہونے کی دعا کرتا ہے تاکہ وقتِ نزع لاشریک لہ لا الہ کے کلمات جاری ہوں اور صلے اور انعام کے طور پر حالتِ ایمان میں روح پرواز کر جائے۔آپ کے ہاں جذبے کی شدّت نے حمدیہ قصیدے کو زوردار بنا دیا ہے۔جو نعرہ پاکستان کی بنیاد بنا وہ لا الہ الا اللہ تھا۔یوں پاکستان کی بنیادیں حمدِ باری تعالیٰ پر اُستوار کی گئیں ہیں جس کی طرف لوٹ کر جانا ہے اسی کی فرماں روائی میں نجات ہے۔ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ:''اور وہی ہے اللہ کہ کوئی خدا نہیں اُس کے سوا اسی کی تعریف
ہے دنیا اور آخرت میں اور اسی کا حکم ہے اور اُسی کی طرف پھر جاؤ
گے۔''(۲۶)

حسنِ طلب میں اثر زبیری نے بڑی عمدگی سے بارگاہِ ایزدی سے خیرات طلب کی ہے۔دعا میں قصیدہ نگار اس انداز سے اپنے مدعا کو شعری رُوپ عطا کرتا ہے کہ ممدوح نوازشات فرمانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ان کے ہاں شعری مثالیں دیکھیے:

بہ حرمتِ شہِ والا شفیعِ روزِ جزا
بہ وقتِ مرگ کہ جب آسرے ہوں سب مفقود
زبان و قلب پہ جاری ہو نامِ پاک ترا
اثر نہ کر سکے تلبیسِ دشمنِ مردود
لبِ آثر پہ رہے وقتِ نزع وِرد یہی
کہ لا شریک لہٗ لاالہ غیَر وَدُود(۲۷)

فکر اور فن کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔دونوں لازم وملزوم ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔فکر اگر فن سے خالی ہو تو وہ بے ڈھنگم اور بے سروپا عمارت کی مانند ہوگی۔اسی طرح فن اگر فکر سے خالی ہوگا تو وہ بغیر خوشبو کے پھول کی مانند بے کیف اور بوجھل

ہوگا۔اسلوب، زبان،طرزِتحریر،وحدت،ارتباط و انسلاک،طرزِپیش کش اورطرزِادافن کے زمرے میں آتے ہیں۔شاعری طرزِ کلام کی عکاسی کرتی ہے جس میں شعراء اپنے اپنے اسلوب اور انداز میں اپنے جذبات قارئین تک پہنچاتے ہیں۔شعراء کیاسلوب پر معاشرتی اثرات، مذہبی نظریات، سیاسی ماحول اور ذاتی سوچ و بچار کا گہرا اثر ہوتا ہے۔یوں ہر شاعر اپنے اپنے انفرادی رنگ کو پیش کرتا ہے۔اثر زبیری کے ہاں دیگر رنگوں کے علاوہ ایک حمدیہ قصیدہ ان کے مذہبی رنگ پر دلالت کرتا ہے جس میں قصیدے کی مروجہ خوبیاں زورِ بیان، شان وشوکت،علوِفکر،شکوہِ الفاظ اور جاہ وجلال کی خوبیاں نمایاں ہیں جس سے قصیدے میں چاشنی اور تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔بیان و بدیع اور صنائع بدائع سے مزیّن قصیدہ دیکھیے :

بنامِ داورِ ارض و سما، غفور و ودود
ہے جس کے حکم سے تشکیلِ بزمِ غیب وشہود(۲۸)

تراکیب کا تنوّع

اَثر زبیری کا حمدیہ قصیدہ ایسی تراکیب سے مزیّن ہے جن میں اللہ تعالیٰ کی محبّت اورعقیدت نمایاں ہے۔ان کے ہاں روایتی پیراہن سے مزیّن اضافتی تراکیب ملاحظہ کیجیے: درسِ ہستی،لفظِ کن،تصرفِ ذاتی،داورِہمہ گیر،رواقِ جاں،مدارِحکمت،مثالِ آسیہ،چرخِ کبود،خلدِ بریں،مطلعِ نو،سوزِنغمہ داؤد،کہکشانِ زر اندود،حوادثِ کونین،آتشِ نمرود،برصِ جلود،کمالِ خلق،وقتِ نزع وغیرہ۔

اَثر زبیری کے ہاں سہ لفظی اضافتی تراکیب ان کی فنّی پرکاری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔مثالیں ملاحظہ ہوں:بَنامِ داورِارض،تشکیلِ بزمِ غیب،سوالِ دسترسِ کنہ ذات،حریقِ آتشِ غم،حرمتِ شہِ والا،شفیعِ روزِ جزاوغیرہ۔

اَثر زبیری نے عطفی تراکیب کو بھی بڑی فنی چابک دستی سے برتا ہے۔مثلاً:غفور و ودود،خلق وامر،کون ومکاں،نشو ونمود،نیاز وادب،مرسلین وصدیقیں،ذکر ورود،حمد وثنا،رحم و کرم،زبان وقلب وغیرہ۔

اَثر زبیری کے ہاں اضافت کے ساتھ مرکب عطفی کا استعمال کر کے معنویّت میں

اضافہ اور لطف کلام نکھر کر سامنے آیا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں: عارفانِ روم وحبش، سرکشانِ عاد و ثمود وغیرہ۔

مجموعی طور پر آثر زبیری کا اُسلوب پر کشش اور عمدہ ہے۔ احساسات ومحسوسات کی منزل سے گزر کر وجدان، ایقان اور گیان کی منزل تک پہنچ گیا ہے۔

چُستی بندش

مشکل الفاظ کو ایسی مہارت اور عمدگی سے برتنا کہ کلام کی روانی اور بلاغت متاثر نہ ہو چستی بندش کہلاتا ہے۔ اثر زبیری کے کلام میں مشکل الفاظ وتراکیب بھی پائی گئی ہیں لیکن شعری لطافت برابر برقرار رہے۔ شعری مثال دیکھیے:

اُسی کی ذات ہے شیرازہ بندِ کون و مکاں
اُسی کا ہاتھ ہے دریوزہ بخشِ نشو و نمود(۲۹)

شکوہِ الفاظ

شکوہِ الفاظ کا استعمال قصیدے کی خاص اُسلوب اور شناخت ہے۔ شاعر سادہ الفاظ استعمال میں لانے کی بجائے دقیق، مشکل اور ثقیل الفاظ کا چناؤ کر کے اپنا ما فی الضمیر بیان کرنے کی سعی کرتا ہے۔ یوں کلام وضع داری کا حامل ہو جاتا ہے۔ جسے شکوہِ الفاظ کا نام دیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ابوالاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

> ''صوتی آہنگ اور معنوی فضا کے لحاظ سے بعض الفاظ میں ایک خاص قسم کا طمطراق اور طنطنہ جھلکتا ہے جسے اصطلاح میں شکوہِ الفاظ کہتے ہیں۔''(۳۰)

اثر زبیری کے حمدیہ قصیدے میں شکوہِ الفاظ کی مثال ملاحظہ ہو:

اسی کے چشمِ مشیت کے سب کرشمے ہیں
فراز و پست میں یہ جلوہ ہائے بست و کشود(۳۱)

تخلص کا استعمال

بعض اردو شعراء جن میں مومن اور درد کے نام مشہور ہیں ان کے ہاں تخلص کا عمدہ

اور ذو معنی استعمال بڑا معنی خیز ہے۔تخلص کا عمدہ انداز میں استعمال کلام کی دل کشی، تاثیر اور جاذبیّت کو فزوں تر کر دیتا ہے۔جس سے شعر معنویّت کا جامہ پہن کر پر کشش اور پر مغز ہو جاتا ہے۔اثر زبیری کے ہاں بھی تخلص بڑی خوب صورتی سے برتا گیا ہے، یوں وہ تخلص بھی استعمال کر جاتے ہیں اور نئے معانی بھی اختراع کر جاتے ہیں۔مثالیں ملاحظہ ہوں:

زبان و قلب پہ جاری ہو نامِ پاک ترا
اثر نہ کر سکے تلبیسِ دشمنِ مردود
لبِ آثر پہ رہے وقتِ نزع وِرد یہی
کہ لا شریک لہٗ لا الہ غیر ودود(۳۲)

تلمیح

تلمیح کسی قصّے یا واقعے کی طرف اشارہ کرنا جس میں قرآنی یا تاریخی واقعہ ہو۔مختصر الفاظ کا استعمال کر کے کسی بڑے واقعے کی طرف اشارہ کرنا تلمیح ہے۔ابوالاعجاز حفیظ صدیقی تلمیح کے بارے میں لکھتے ہیں:

''زبان کے ابتدائی دور میں چھوٹے چھوٹے سادہ خیالات اور معمولی چیزوں کے بتانے کے لیے الفاظ بنائے گئے تھے۔رفتہ رفتہ انسان نے ترقی کا قدم آگے بڑھایا۔لمبے لمبے قصّوں اور واقعات و حالات کی طرف خاص خاص اشارے ہونے لگے۔جہاں وہ الفاظ زبان پر آئے وہ قصّے، وہ واقعے آنکھوں کے سامنے پھر گئے، ایسا ہر اشارہ تلمیح کہلاتا ہے۔''(۳۳)

اثر زبیری کے ہاں تلمیح کے استعمال کی شعری مثالیں دیکھیے:

ترے حبیب کے فرشِ قدم پہ ہفت افلاک
ترے خلیلؑ پہ گلزار آتشِ نمرود
ترے ذبیحؑ کا تحفہ یہ چشمۂ زم زم
ترے مسیحؑ کا صدقہ شفائے برصِ جلود(۳۴)

سیاق الاعداد

سیاق کے لفظی معنی ''حساب، شمار یا گنتی'' وغیرہ کے ہیں۔شعر میں اعداد و شمار کا ذکر نا صنعتِ سیاق الاعداد کہلاتا ہے۔اثر زبیری نے سیاق الاعداد کو بڑی فنّی چابک دستی سے برتا ہے۔ان کے ہاں سیاق الاعداد کی شعری مثالیں ملاحظہ ہوں:

ہزار کوئی فریبِ مجاز میں آئے
حقیقتاً وہی معبود ہے وہی مسجود
تری صفات کی تعداد کو پہنچ نہ سکے
یہ ذرّہ ہائے سوادِ فضائے لا محدود(۳۵)

تنسیق الصفات

اردو حمدیہ قصائد میں صنعتِ تنسیق الصفات کا استعمال عام دیکھنے میں آیا ہے۔مدحیہ قصائد میں اس صنعت کو بروئے کار لاتے ہوئے شعراء کلام کو زوردار بنا کر پیش کرتے ہیں۔کیوں کہ اس صنعت میں ممدوح کی صفات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔اس حوالے سے نجم الغنی رام پوری لکھتے ہیں:

''کسی چیز یا کسی شخص کا ذکر صفاتِ متواترہ کے ساتھ کریں،خواہ وہ صفات مدح کی ہوں یا مذمت کی۔''(۳۶)

اثر زبیری کے ہاں اس کی شعری مثال ملاحظہ ہو:

وہ صاحبِ ہمہ قدرت، وہ داورِ ہمہ گیر
کہ مملکت میں نہیں جس کی دست گاہِ حدود (۳۷)

صنعتِ تضاد

وہ الفاظ جو ایک دوسرے کی ضد ہوں صنعتِ تضاد یا طباق کہلاتے ہیں۔اس کی دو اقسام ہیں۔ایجابی اور سلبی۔طباقِ ایجابی کی مثالیں اثر زبیری کے حمدیہ قصیدے میں موجود ہیں۔طباقِ ایجابی میں الفاظ متضاد کے ساتھ حرف نفی کا استعمال نہیں کیا جاتا۔جیسے: ارض و سما، جہنم، خلدِ بریں، فنا و جود وغیرہ۔مثالیں ملاحظہ ہوں:

بنامِ داورِ ارض و سما غفور و ودود
ہے جس کے حکم سے تشکیلِ بزمِ غیب و شہود
اُسی کی چشمِ مشیت کے سب کرشمے ہیں
فراز و پست میں یہ جلوہ ہائے بست وکشود
جلال اس کا جہنم جمال خلدِ بریں
عدالت اس کی ہے بے شبہ عرصہ گاہِ شہود (۳۸)

غیر مردف اشعار

عربی قصائد غیر مردف ہوتے تھے لیکن ایرانیوں نے ردیف کا اہتمام بھی التزام کے ساتھ کیا۔ایرانیوں کی پیروی میں اردو شعراء نے بھی حمدیہ قصائد میں ردیف کا اہتمام کیا ہے۔لیکن اثر زبیری نے غیر مردف حمدیہ قصیدہ لکھا۔اگرچہ ردیف کیا ہتمام سے کلام رواں، موسیقیت کا حامل اور آرائش وزیبائش کا باعث بنتا ہے۔خواہ ردیف شعر کا زیور قرار پائی ہے تاہم غیر مردف بھی حسنِ ادائیگی، ندرتِ خیال اور غنائیت سے مملو ہوسکتی ہے۔نمونے کے طور پر مطلع دیکھیے:

بنامِ داورِ ارض و سما غفور و ودود
ہے جس کے حکم سے تشکیلِ بزمِ غیب وشہود (۳۹)

بے چین رجپوری

بے چین رجپوری کا اصل نام سیّد محمد حسین تھا۔بے چین تخلص استعمال کرتے تھے۔ رجپورہ ضلع بدایوں (ہندوستان) سے علاقائی نسبت ہونے کے باعث رجپوری کہلائے۔ انھوں نے عربی، فارسی، ہندی اور اردو زبان میں شعر کہے۔انھیں غزل، نظم، رباعی، قطعوں اور گیتوں سے فطری میلان تھا اور اس پر کامل دسترس رکھتے تھے۔نعت آپ کا میدان ہے۔آپ کا شمار پاکستان کے معروف نعت گو شعراء میں کیا جاتا ہے۔پاکستان سے شدید محبت رکھتے تھے۔قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۵۴ء میں لاہور آ گئے۔کلیاتِ بے چین اردو ادب کی روایت میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔یہ چار جلدوں پر مشتمل ہے جس کا زیادہ تر حصّہ نعتیہ کلام پر

مشتمل ہے۔ان کا نعتیہ کلام ان کی شعری ریاضت پر دلالت کرتا ہے۔نعت کے متعلق ان کا ایمان ہے کہ جب قرآن میں خود اللہ تعالیٰ آنحضرت ﷺ کا مدح خواں ہے تو پھر کسی اور سے مدحتِ رسول ﷺ کہاں ہو سکے گی۔وہ تو صرف اپنے لیے توشۂ آخرت کے طور پر رطب اللساں ہیں۔نعتیہ کلام کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں ایک اردو حمدیہ قصیدہ بھی پایا جاتا ہے۔جو تصوّرِ توحید، فلسفہ واجب الوجود، فلسفہ وحدت الوجود، فلسفہ وحدت الشہود، علت العلل، عرفانِ ذات اور کائنات کے آئینہ خانہ کی حقیقت و توجیہہ سے مملو ہے۔پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدے کی روایت میں سیّد محمد حسین بے چینؔ رجپوری کا نام ایک خوش گوار اضافہ ہے۔اُن کے ہاں رائیہ حمدیہ قصیدے کا مطلع ملاحظہ ہو:

خلاقِ جہاں، مالک و منان و کرم گار
ہے تیری تجلائی ہر اک شے سے نمودار (۴۰)

بے چینؔ رجپوری نے حمدیہ قصیدے کی فکر کو قرآن کے موضوعات پر اُستوار کیا ہے۔یوں ذاتِ باری تعالیٰ کا تصوّر مبدءِ حمد وستائش بن کر صفاتِ الٰہیّہ کا اقرار لسان وقلب اور علم وقلم سے کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ان کے حمدیہ قصیدے کے زیادہ تر اشعار قرآنی احکامات کے نُور سے مستنیر ہیں۔اُن کے کلام میں علمِ توحید کی شمعیں قرآن کے نور سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔اللہ تعالیٰ کی ذات عالم الغیب ہے۔وہ ذات ہر ذی روح میں نہاں اور پنہاں ہو کر ظاہر و باطن کو کلی طور پر جانتا ہے۔دیکھیے بے چین رجپوری نے کیسے قرآن سے روشنی کشید کر کے چراغِ حمد روشن کیا ہے۔ارشادِ ربانی ہے:

> ترجمہ: ''اور کافر بولے ہم پر قیامت نہ آئے گی تم فرماؤ کیوں نہیں میرے رب کی قسم بیشک ضرور تم پر آئے گی غیب جاننے والا اس سے غائب نہیں ذرّہ بھر کوئی چیز آسمانوں میں اور نہ زمین میں اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی مگر ایک صاف بتانے والی کتاب میں ہے۔'' (۴۱)

سیّد محمد حسین بے چین رجپوری نے علاّم الغیوب اور علمِ الٰہی کی حقیقت کو بڑی

تراشیدگی سے حمد کے قالب میں ڈھال کر اندازِ بیان کو کیف و سرور سے ہمکنار کر دیا ہے۔شعری مثال ملاحظہ ہو:

ہر ظاہر و باطن کی ہے علام تری ذات
سینوں کے ہر اک راز سے آگاہ و خبردار (۴۲)

بے چین رجپوری نے اللہ تعالیٰ کی روشن اور کھلی براہین کو بھی موضوعِ سخن بنایا ہے۔ یہ حسین وجمیل کائنات اوراس کی دل آویزی اللہ تعالیٰ کی کاری گری ہے۔خوش منظر فلک،سرسبز وشاداب زمین، دل کش نباتات و جمادات، روشن آفتاب، چمکتا دمکتا مہتاب اور انواع واقسام کی قدرتوں کے نظارے اللہ تعالیٰ کی صنّاعی ہی کے نہیں بلکہ احسن الخالقین ہونے کی بیّن دلیلیں ہیں۔قرآن میں ارشادِ ربّانی ہے۔

ترجمہ: ''تو کیا انہوں نے اپنے اوپر آسمان کو نہ دیکھا ہم نے اُسے کیسا بنایا اور سنوارا اوراس میں کہیں رخنہ نہیں۔اور زمین کو ہم نے پھیلایا اوراس میں لنگر ڈالے (پہاڑ رکھے) اوراس میں ہر بارونق جوڑا اُگایا۔'' (۴۳)

بے چین رجپوری اللہ تعالیٰ کی قدرت وصنعت کے کمالات کے متعلق یوں نغمہ زن دکھائی دیتے ہیں کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ خدا کے ظہور کا مظہر ہے۔ ہر منظر اُسی کے وجود کا حصّہ ہے۔ ہر شے میں اللہ تعالیٰ کا نظر آنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ شکلی طور پر نظر آ رہا ہے بلکہ اُس کی قدرتوں کی نشانیاں ظہور پذیر ہیں۔صوفیا کرام کی ایک جماعت اس نظریے کی حامی ہے۔ان کے کلام میں فلسفہ وحدت الوجود کا حامل شعر دیکھیے:

کیا خوب تری قدرت و صنعت کے مناظر
ہر منظر پُر کیف سے ہے دعوتِ دیدار (۴۴)

بے چین رجپوری نے حمدیہ قصیدے میں خدائے وحدہٗ لاشریک کی توصیف کے لیے عالمِ رنگ وبُو میں لیل ونہار کی تخلیق وتغیّر کو اللہ تعالیٰ کی شان سے موسوم کیا ہے۔اوقات اور لیل ونہار کا تغیّر وتبدّل قدرت کی عظیم نشانیاں ہیں جو ذاتِ باری تعالیٰ کے تصرف، طاقت اور

غلبے کی دلیلیں ہیں۔رات کو نیندوسکون کے لیے اوردن کو معمولاتِ زندگی و دوڑ دھوپ کے لیے میدانِ عمل میں اُترنے کے لیے بنایا گیا ہے۔اسی موضوع پر ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ:''اور وہی ہے جس نے رات اور دن کی بدلی رکھی اس کے لیے جو دھیان کرنا چاہے یا شکر کا ارادہ کرے۔''(۴۵)

بے چین رجپوری نے قرآن میں مذکور قدرت وحکمت کو زینتِ کلام بنا کر اپنی فکر کی جولانی اور جاہ وجلال کو کمال عطا کر دیا ہے۔اُن کے ہاں تخلیقی رعنائی اور بارگاہِ ایزدی میں سپاس گزاری کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

قدرت کا یدِ طولیٰ ترا از پئے ایجاد
رہتا ہے شب و روز سدا مائل اِخمار
جاری ہیں بہ تنظیم جہاں تیرے فرامین
ہوتا ہے ترے حکم سے ہر صبح کا اِسفار (۴۶)

اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات ظاہر بھی ہے اور باطن بھی،اوّل بھی ہے اور آخر بھی یہ چار اصطلاحیں قابلِ غور ہیں۔یقیناً تمام تشریحات قرآن سے ماخوذ ہیں۔اُس کی وحدانیت عالمِ وجود کے لیے بھی ہے اور عالمِ شہود کے لیے بھی ہے۔کائنات میں سب کچھ سمجھنا بھی قرینِ انصاف نہیں اور آسمانوں تک محدود کرنا بھی مناسب نہیں۔صرف ایک پہلو سے دیکھنا غلطی کا سبب بنے گا۔اللہ تعالیٰ کی ذات وحدت الوجود ہے وحدت الموجود نہیں۔موجود متعدد ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کا ہونا احدیّت ہے۔سورۃ الحدید میں اللہ تعالیٰ کی پانچ صفات کا ذکر آیا ہے۔اس جامع موضوع کو قرآن یوں بیان کرتا ہے:

ترجمہ:''وہی اوّل وہی آخر وہی ظاہر وہی باطن اور وہی سب کچھ جانتا ہے۔''(۴۷)

بے چین رجپوری نے اس نہایت سنجیدہ اور حسّاس موضوع کو اپنے حمدیہ قصیدہ کی زینت بنا کر اپنی فکری رفعتوں کا لوہا منوایا ہے۔شعری مثالیں ملاحظہ ہوں:

اے باری! تیری ذات ہے در پردہ تکوین
لیکن ترے جلوے ہیں بہر سمت نمودار

ہر چیز کی تکوین کا مقصد ہے لزوما!
عالم میں کوئی نوش نہیں باطل و بے کار
در اک زمانے کے سدا چھانا کریں خاک
ظاہر نہیں ہو سکتے ترے مخفیہ اسرار(۴۸)

بے چین رجپوری دلائلِ توحیداور مدحِ ربِّ جلیل میں اجرامِ فلکی، شمس وقمر، آغوشِ فلک، رخشندہ کواکب، کہکشاؤں، ثابت و سیار اور بروج پر اللہ تعالیٰ کی گرفت و اختیار کو بیان کرتے ہیں کہ یہ ابتدائے آفرینش سے حکمِ ربّی سے ضیا بار ہیں ۔ یہ قدرت وعظمت اور قوّت وعزّتِ خداوندی ہے اُس نے تاریک رات کو بھی حسبِ منشاء روشنی کے لیے تاروں اور ستاروں سے سجا دیا ہے۔ گردش و مدار کے متعیّن دائرے اہلِ عقل وبصیرت کے لیے خالق کی بے مثال نشانیاں ہیں۔ ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ: ''بڑی برکت والا ہے وہ جس نے آسمان میں بُرج بنائے اوران میں چراغ رکھا اور چمکتا چاند۔''(۴۹)

بے چین رجپوری نے قرآنی فکر کو الفاظ کے خُوش نُما رنگوں سے مزیّن کر کے قوسِ قزح بنا دیا ہے۔ انھوں نے حمدیہ قصیدے کو علوِ فکر اور حقیقت کا آئینہ دار پیش کر کے گہری فکر کا عملی نمونہ پیش کیا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

سر چشمہ فیضان ہیں ارواح و جسد کو
پیدا ہیں کیے شمس و قمر کیسے ضیا بار
کرتے ہیں بصد خوبی ادا اپنے فرائض
پابند ترے حکم کے ہیں ثابت و سیار (۵۰)

قرآن مجید کی بیسیوں آیات میں اللہ تعالیٰ نے پانی کے مختلف پہلوؤں کو مختلف اسلوب اور پیرائے میں بیان فرمایا ہے۔ پانی زندگی ہے۔ اس کی بہت سی اشکال اور ذرائع ہیں مثلاً بارش، اوس، ژالہ باری اور رس وغیرہ۔ اسے اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص انعامات میں شمار کیا ہے۔ ارشادِ ذوالجلال ہے:

ترجمہ: ''کیا تو نے نہ دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا پھر اس
سے زمین میں چشمے بنائے پھر اس سے کھیتی نکالتا ہے کئی رنگت کی
پھر سوکھ جاتی ہے تو تُو دیکھے کہ وہ پیلی پڑ گئی پھر اسے ریزہ ریزہ کر دیتا
ہے بیشک اس میں دھیان کی بات ہے عقل مندوں کو۔'' (۵۱)

بے چین رجپوری نے قرآن میں بیان کردہ پانی کے موضوع کو حمدیہ قصیدے میں اس طرح سمویا ہے کہ اس نعمتِ عظمیٰ کی معنویّت ڈھل کر نکھر گئی ہے۔ اس سے ان کی قرآن فہمی اور مضمون بندی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

اے ملطف و منان زہے! فیض کریمی
غدران و بحیرات و ہمہ ابحر و انہار
ہے ان کے بہاؤ کی عجب ہیبت دل کش
چشمے جو ابل کر ہیں بہے دامنِ کہسار (۵۲)

بے چین رجپوری نے سورۃ الرحمٰن سے استفادہ کرتے ہوئے ثنائے ربِّ کریم کا موضوع اختراع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ میں اپنی نعمتوں کا خوب چرچا کیا ہے۔ اِنھی نعمتوں میں سے پھلوں کی لذت، انواع واقسام کے درختوں اور پُر کیف باغات کو بے چینؔ رجپوری نے حمدیہ قصیدے کی زینت بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں فرماتا ہے:

''وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَ الرَّيْحَانُ'' (۵۳)

ترجمہ: ''اور بُھس کے ساتھ اناج اور خوشبو کے پھول۔''

اسی طرح سورۃ عبس میں بھی اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

ترجمہ: ''تو آدمی کو چاہیے اپنے کھانوں کو دیکھے کہ ہم نے اچھی طرح پانی
ڈالا۔ پھر زمین کو خوب چیرا۔ تو اس میں اگایا ناج۔ اور انگور اور چارہ۔ اور
زیتون اور کھجور۔ اور گھنے باغیچے۔ اور میوے اور دُوب (گھاس)۔
تمہارے فائدے کو اور تمہارے چوپاؤں کے۔'' (۵۴)

بے چین رجپوری کے کلام میں قرآن کی گہری چھاپ ان کے کلام کو فصیح و بلیغ اور پُر شکوہ بنا دیتی ہے۔ جاہ وجلال، نُدرتِ خیال اور باہمی ربط نے اس قصیدے کو پاکستانی حمدیہ

قصیدے کی روایت میں نمایاں مقام پر فائز کر دیا ہے۔ اشعار دیکھیں:

سبحانک یا ربّنا کیا خوب یہ منظر
آویختہ شاخوں میں ثمر ہیں جو بہ اشجار
ہے تیری عنایت سے بہ اشجار بساتین
اثمار کی لذات کا مخلوق کو ابشار (۵۵)

سیّد محمد حسین بےچینؔ رجپوری خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کو متاعِ حیات گردانتے ہیں۔ اللہ ہمارا خالق اور ہم اس کی مخلوق ہیں۔ ہم ساجد ہیں وہ مسجود۔ اس کریم ذات کا شکر ہم پر لازم آتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ انفرادی واجتماعی عبادت، جلّی وخفی ذکر اور دبستانِ حمد میں اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کو اوّلیّت دیں۔ ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ: ''اور ہر امت کے لیے ہم نے ایک قربانی مقرر فرمائی کہ اللہ کا نام لیں اس کے دیئے ہوئے بے زبان چوپایوں پر تو تمہارا معبود ایک معبود ہے تو اسی کے حضور گردن رکھو اور اے محبوب خوشی سنادو ان تواضع والوں کو۔'' (۵۶)

بےچینؔ رجپوری نے قرآن کے حکم کو بڑی صنّاعی سے شعری رنگ عطا کیا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

''وَ اَذِنَتۡ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتۡ'' (۵۷)

ترجمہ: ''اور اپنے رب کا حکم سنے اور اسے سزاوار ہی یہ ہے۔''

بےچینؔ رجپوری حمدیہ قصیدہ بیان کرتے کرتے قاری کو قرآن کے پیغام کی طرف راغب کرتے ہوئے ذاتِ اِلٰہ کی فرماں برداری کا درس دیتے ہیں۔ قرآنی حکم کی شعری صُورت ملاحظہ ہو:

اے مالک و معبود! ہے لازم کہ بہ تعمیل
ہر حکم پہ ہم تیرے ہمیشہ ہوں نگوں سار (۵۸)

بےچینؔ رجپوری نے قرآن مجید کے ایک بہت بڑے موضوع کو زینتِ کلام بنایا ہے۔ اسفل سافلین کو مایوسیوں سے نکال کر اللہ تعالیٰ کے رحمٰن ورحیم ہونے کی نوید سناتے ہیں۔ یوں

آپ در بہ درٹھوکریں کھانے والوں کو رجوع الیٰ اللہ کرنے کے داعی ہیں۔تاکہ جولوگ اپنی جانوں پرظلم کر بیٹھے ہیں وہ بخشش طلب کر کے سرخرو ہوسکیں۔اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیس سے زائد مرتبہ اپنے بخشنے والا ہونے اور مہربان ہونیکا اعلان فرما کر انسانیت پر احسان کیا ہے۔ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ:''تاکہ شیطان کے ڈالے ہوئے کو فتنہ کردے اُن کے لیے
جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جن کے دل سخت ہیں اور بیشک ستم
گار دُھر کے (انتہائی سخت) جھگڑالو ہیں۔''(۵۹)

بے چینؔ رجپوری نے بڑی ژرف نگاہی سے قرآنی موضوعات کا انتخاب کر کے حمدیہ قصیدے میں امیّد و رجاء کی قندیلیں روشن کی ہیں۔رحمٰن کی رحمتوں کی لاٹھی تھامنے والا اسے غفار اور کرم کار پائے گا۔شعری مثالیں ملاحظہ ہوں:

مشفق نہیں خلاق جہاں تجھ سا کوئی اور
بندوں پہ تُو اپنے ہے نہایت ہی کرم گار
کرتا ہے منبین کی مقبول انا بات
ہے جرم و تقاصیر کے تائب کو تُو غفار(۶۰)

بے چینؔ رجپوری نے بندوں کو خدا کے قہر وغضب اور عظمت وجلال سے بھی آ گاہ کیا ہے۔اس کے اوامر ونواہی سے رُوگردانی کے انجام سے خبر دار کیا ہے۔کیوں کہ اس کی بندگی اور اطاعت میں ہی نجات ہے۔اس لیے اطاعت کے بعد فضل کی امید اور نافرمانی کی صورت میں قہر کے خوف کے درمیان میں محاسبہ کرتے ہوئے حقیقی بندگی کی رغبت دلائی ہے۔ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ:''کیا اللہ کی خفی تدبیر سے نڈر ہیں تو اللہ کی خفی تدبیر سے نڈر
نہیں ہوتے مگر تباہی والے۔''(۶۱)

بے چینؔ رجپوری نے اللہ تعالیٰ کے غفار وقہار ہونے کو شعری قالب میں ڈھال کر امیّد وخوف کی متوازن سوچ دی ہے۔ان کے ہاں توحید کے تقاضوں کے ہمہ جہت پہلوؤں کا فکری گلدستہ ملاحظہ ہوں:

مقبول ترے بابِ کرم زاری و الحاح
ہے سرکش و سرتاب کو ملعونی و افرار

سرتابی ہے گر چون و چرا ہو ترے آگے
ہے سرکش و سرتاب کو لاریب تُو قہار (۶۲)

حمدیہ قصیدے کا مقطع دعائیہ کلمات پر مشتمل ہے۔ بے چینؔ رجپوری شرمندگی سے گناہوں پر نادم ہو کر بخشش کا طلب گار ہے۔ دعا یا حُسنِ طلب کا شعر دیکھیے:

نادانی سے یا رب! ہوئے سر زد جو معاصی
بے چینؔ ہے صد عجز معافی کا طلب گار! (۶۳)

بے چینؔ رجپوری کا یہ حمدیہ قصیدہ غزلیہ ہیئت میں ہے جس کا مطلع پُرکشش، جان دار اور غیر مردف ہے۔ حمدیہ قصیدے کا اُسلوب جاہ وجلال اور مضمون آفرینی کا عمدہ نمونہ ہے۔ وحدتِ تاثر نے کڑی سے کڑی ملا کر قصیدے کو خُوب صُورت اور فصیح و بلیغ بنا دیا ہے۔ یہ مدحیہ قصیدہ ہے جو ۵۱ شعروں پر مشتمل ہے۔ یہ مقتضب قصیدہ ہے۔ اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے مدح اور دعا پر مشتمل ہے۔ بے چینؔ رجپوری دورِ جدید کے نعتیہ قصیدہ نگاروں امیر مینائی، منیرؔ شکوہ آبادی، محسنؔ کاکوروی اور ڈاکٹر ریاض مجید جب کہ حمدیہ قصیدہ نگاروں مولانا ظفر علی خان، اثرؔ زبیری، ساحرؔ لکھنوی، غلام علی وفاؔ، سیّد اصغر علی شاہ، قاضی حبیب الرحمٰن، ڈاکٹر نوید عاجزؔ اور رفیع الدین رازؔ کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ مدح میں اللہ تعالیٰ کی اوصاف، جاہ و جلال، فلسفہ توحید، فلسفہ وحدت الوجود و وحدت الشہود اور قرآنی احکامات کو موضوع بنا کر مدح سرائی کی ہے۔ جو باہمی ارتباط وانسلاک کا عمدہ نمونہ ہے۔ قصیدے کے اختتام پر مقطع میں اللہ تعالیٰ سے بخشش کا دستِ سوال دراز کیا ہے۔ مجموعی طور پر تخیّل پسندی، علوم وفنون، پُرکاری اور فن کاری کا شاہکار ہے۔ طرزِ بیان جدّت اور شاعرانہ اِظہار سے مملو ہے۔ کلام میں کشش پیدا کرنے کے لیے صنائی بدائع بڑی تراشیدگی سے لائے گئے ہیں۔

شکوہِ الفاظ

بے چینؔ رجپوری نے قصیدے کے جاہ وجلال، مضمون آفرینی اور اپنے مؤقف کی پیش کش کے لیے شکوہِ الفاظ کو بڑی وضع داری سے پیش کیا ہے۔ مشکل اور ثقیل الفاظ و اصطلاحات ہنر مندی سے استعمال کر کے قصیدے کو شان وشوکت اور شکوہِ الفاظ کا مرقّع بنا دیا

ہے۔ابوالاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

''صوتی آہنگ اور معنوی فضا کے لحاظ سے بعض الفاظ میں ایک خاص قسم کا طمطراق اور طنطنہ جھلکتا ہے جسے اصطلاح میں شکوہِ الفاظ کہتے ہیں۔''(۶۴)

سیّد محمد حسین بے چینؔ رجپوری کے ہاں پُر شکوہ الفاظ کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

ہر ظاہر و باطن کی ہے علام تری ذات
سینوں کے ہر اک راز سے آگاہ و خبردار
صناعی تری واہ، زہے! شانِ نگارش
ہے خامۂ قدرت ترا نقاشِ چمن زار(۶۵)

حروف کا استعمال

کلام میں حروف کا استعمال اسے خوب صورت اور پُر مغز بنا دیتا ہے۔بے چینؔ رجپوری نے اپنے کلام میں حروف کی مختلف اقسام کو اپنے کلام کی زینت بنایا ہے مثلاً: حروفِ تحسین،حروفِ ندا اور حروفِ تاسف وغیرہ۔

ان کے ہاں زہے،اے باری،یارب،سبحانک،اے مالک ومنان اور نادانی جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ان حروف کے استعمال کی خوب صورت مثال ملاحظہ ہو:

یا رب! تیری قدرت سے کہیں ارض ہے نمناک
ہوتی ہے صحاریٰ میں کہیں رفعت اغصار (۶۶)

تراکیب کا استعمال

بے چینؔ رجپوری کے حمدیہ قصیدے میں تراکیب رنگ برنگے قمقموں کی طرح فروزاں ہیں جس سے کلام کی معنویّت کھل کر فروزاں ہوگئی ہے۔اُن کے ہاں اضافتی تراکیب ملاحظہ ہوں: خلاقِ جہاں،نقاشِ چمن،اذنِ بخش،دعوتِ دیدار،خوبانِ جہاں، غرقابِ تحیر،یدِطولیٰ،دامنِ کہسار،حالتِ ابدار،بابِ کرم اور ارعادِ صواعق وغیرہ۔

بے چینؔ رجپوری نے عطفی تراکیب کے استعمال سے بھی کلام کو مزیّن کیا ہے

مثلاً: مالک ومنان، ظاہر و باطن، شمس وقمر، ثابت و سیار، ملطف ومنان، گل وگلزار، جہانگیر و جہاندار، مالک ومعبود، ناطق وہشیار، ملعونی وافرار سرکش وسرتاب وغیرہ۔

چستی بندش

دُشوار، مشکل اور نازُک الفاظ کو اس دست گاہ اور ہُنرمندی سے برتنا کہ کلام کی فصاحت، روانی، سادگی اور شائستگی مجروح نہ ہو۔لطافت وتازگی، جاہ وجلال اور شوکت الفاظ چستی بندش کو چار چاند لگا دیتی ہے۔بے چینؔ رجپوری نے ترفّع خیال اور نُدرتِ خیال کو بھرپور استعمال میں لاکر قصیدے میں خوش اُسلوبی کا مظاہرہ کیا ہے۔چستی بندش کی شعری مثال دیکھیے:

رخسارۂ فطرت کا تجھی سے ہے تلماح
ہے تیری نضارت سے ہر اک رونقِ بازار
خوبانِ جہاں سے ہیں عیاں تیرے ہی جلوے
غرقابِ تحیر ہے نگاہوں کا ہر اک تار(۶۷)

استفہامیہ لہجہ

بے چینؔ رجپوری نے استفہامیہ لہجہ اپنا کر قاری کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔استفہامیہ لہجہ قاری و سامعین کی توجہ حاصل کرنے کا بہترین انداز ہے۔سوال ہمیشہ متجسّس بنا دیتا ہے جس کے نتیجے میں جواب تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔دریافت کرنے والا ہی بازیافت کے درجے پر فائز ہوتا ہے۔شعری مثال ملاحظہ ہو:

سر چشمۂ فیضان ہیں ارواح و جسد کو
پیدا ہیں کیے شمس و قمر کیسے ضیا بار؟(۶۸)

سیاق الاعداد

بے چینؔ رجپوری نے حمدیہ قصیدے میں صنعتِ سیاق الاعداد کا استعمال بھی کیا ہے۔جس سے شعر کی معنویّت بڑھ جاتی ہے۔ان کے ہاں اس کی مثال ملاحظہ ہو:

کرتے ہیں بہ صد خوشی ادا اپنے فرائض
پابند ترے حکم کے ہیں ثابت و سیار(۶۹)

صنعتِ تکرار

کلام میں ایک لفظ یا چند لفظوں کے دوہرانے کو صنعتِ تکرار کہا جاتا ہے۔ اس کا استعمال کر کے کلام میں شیریں نغمگی، زور اور تاثیر پیدا کی جاتی ہے۔ یوں کلام میں بے ساختگی اور سلاست کا عُنصر پیدا ہو جاتا ہے۔ پروفیسر نذیر احمد لکھتے ہیں:

''لفظوں کے تکرار سے کلام میں زور، تاثیر یا حسن پیدا کرنا۔''(۷۰)

بے چینؔ رجپوری کے حمدیہ قصیدے میں صنعتِ تکرار کی شعری مثال ملاحظہ ہو:

کیا خوب ہے پُر کیف و عجب نضرت باغات
ہل ہل کے ہواؤں سے عجب ہوتے ہیں وجدار(۷۱)

غیر مردف

بے چینؔ رجپوری نے عربی قصیدے کی روایت کی طرح غیر مردف قصیدہ لکھا ہے۔ حالانکہ بعض قدیم وجدید اردو قصیدہ نگاروں نے ایرانیوں کی تقلید میں قافیے کے ساتھ ردیف کا اضافہ بھی کیا ہے۔ خواہ ردیف کا اہتمام کلام کی آرائش و زیبائش میں اضافے کا سبب بنتا ہے مگر بے چینؔ رجپوری نے غیر مردف قصیدہ لکھ کر اپنی مشاقی اور ریاضت کا ثبوت دیا ہے۔ نمونے کے طور پر حمدیہ قصیدے کا مطلع دیکھیے:

خلاقِ جہاں مالک و منان و کرم گار
ہے تیری تجلائی ہر اک شے سے نمودار(۷۲)

استتباع

مولوی محمد رفیع لکھتے ہیں:

''ممدوح کی اس طرح سے مدح کرنا کہ اس سے دوسری مدح پیدا ہو۔''(۷۳)

بے چینؔ رجپوری نے بڑی فنّی چابک دستی سے صنعتِ استتباع کا استعمال کیا ہے۔ ان کے ہاں شعری مثال ملاحظہ ہو:

رہتی ہے سدا جس سے کہ زیبائش و تزئین
قدرت تری مشاطہ ہے با فطرتی سنگار (۷۴)

پاکستان میں اُردو حمدیہ قصیدہ نگاری کے میدان میں مولانا ظفر علی خان کے بعد آثر زبیری اور سید محمد حسین بے چینؔ رجپوری کا نام آتا ہے۔ مدحِ ربِّ جلیل کا صدیوں کا سفر مسلسل جاری وساری ہے۔ اسے قیامت کی صبح ہونے تک جاری رہنا ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ اہلِ قلم جنھوں نے ذکرِ خداوندی کو اپنا شعار بنایا اور صفتِ رحمانی وثنائے داورِ محشر میں اپنی زندگیاں بسر کر دیں۔ اس سے بھی بڑھ کر وہ ادباء جو اقلیمِ ادب ،قصیدے کی ہیئت میں سپاس گزار ہوئے۔ بات دین کی ہو خواہ دنیاوی معاملات کی بندۂ خاک سار کا حقیقی حاجت روا اور مشکل کشا فقط اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ اسی کی بارگاہِ عالیہ میں دستِ سوال دراز کر کے اپنی گلو خلاصی چاہتا ہے۔ بیسویں صدی نے ادبی دنیا کے منظرنامے پر ان مٹ نقوش مرتب کیے ہیں کیوں کہ اس صدی نے بڑے بڑے انقلاباتِ زمانہ دیکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس صدی کا ادبی سرمایہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ اس صدی نے اردو حمدیہ قصیدے کے امکانات مزید روشن کیے ہیں۔ اس صدی میں حمدیہ قصیدہ نگاروں کی تعدار انتہائی کم مگر معیار اور فکر کی فراوانی ہے۔ علم بیان وبدیع کے فنی محاسن کمال تراشیدگی اور جاں فشانی سے نبھائے گئے ہیں۔ موضوع کی ہمہ جہت استعداد کا رلائقِ صد تحسین ہے۔ لب ولہجہ کی متانت ،سنجیدگی ،شعری لہجہ، ژرف نگاہی ، آن بان ، جاہ وجلال اور دل نشیں اہتمام نے اسے شہ پارہ فن بنا دیا ہے۔ جسے اکیسویں صدی کے حمدیہ قصیدے کے روشن امکانات کے لیے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا قرار دیا جا سکتا ہے۔ قرآن سے موضوعات کشید کر کے اپنے مؤقف کو لا ثانی ولا فانی بنا دیا گیا ہے۔ حاصلِ کلام یہی ہے کہ بیسویں صدی کا حمدیہ قصیدہ تمام تر فکری وفنی رعنائیوں کا حسین گلدستہ ہے۔ یقیناً بیسویں صدی کا آخری دور اِن قصیدہ نگاروں کی خدمات اور حمدیہ قصیدہ نگاری کا معترف رہے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ www.religion.asianindexing.com
۲۔ آثر زبیری: ''سلسبیل'' الحجاز پبلشرز، کراچی، س ن، ص۳
۳۔ القرآن الحکیم: الملک: آیات ۳۔۴
۴۔ آثر زبیری: ''سلسبیل'' ص۳
۵۔ ایضاً، ص۳
۶۔ القرآن الحکیم: یٰسں: آیات ۳۳۔۳۴۔۵۳
۷۔ آثر زبیری: ''سلسبیل'' ص۳
۸۔ القرآن الحکیم: البقرۃ: آیت ۱۱۷
۹۔ آثر زبیری: ''سلسبیل'' ص۳
۱۰۔ القرآن الحکیم: البقرۃ: آیت ۲۵۷
۱۱۔ آثر زبیری: ''سلسبیل'' ص۳
۱۲۔ القرآن الحکیم: الروم: آیت ۴۸
۱۳۔ آثر زبیری: ''سلسبیل'' ص۳
۱۴۔ القرآن الحکیم: المومنون: آیت ۱۷
۱۵۔ آثر زبیری: ''سلسبیل'' ص۳
۱۶۔ القرآن الحکیم: یونس: آیت ۲۶
۱۷۔ آثر زبیری: ''سلسبیل'' ص۴
۱۸۔ القرآن الحکیم: الانعام: آیت ۱۰۳
۱۹۔ آثر زبیری: ''سلسبیل'' ص۳
۲۰۔ ایضاً، ص۴
۲۱۔ القرآن الحکیم: العنکبوت: آیت ۳۸

۲۲۔ القرآن الحکیم: حٰم السجدۃ: آیت ۱۷
۲۳۔ آثر زبیری: ''سلسبیل''ص۴
۲۴۔ القرآن الحکیم: النساء: آیت ۶۹
۲۵۔ آثر زبیری: ''سلسبیل''ص۴
۲۶۔ القرآن الحکیم: القصص: آیت ۷۰
۲۷۔ آثر زبیری: ''سلسبیل''ص۴
۲۸۔ ایضاً،ص۳
۲۹۔ ایضاً،ص۳
۳۰۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی: ''تفہیم و تحسینِ شعر'' سنگت پبلشر، لاہور، ۲۰۰۶ء،ص ۸۸
۳۱۔ آثر زبیری: ''سلسبیل'' الحجاز پبلشرز، کراچی، س ن،ص ۳
۳۲۔ ایضاً،ص۴
۳۳۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی: ''کشاف تنقیدی اصطلاحات'' مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔ ۱۹۸۵ءص: ۴۷
۳۴۔ آثر زبیری: ''سلسبیل''ص۴
۳۵۔ ایضاً،ص۳
۳۶۔ مولوی نجم الغنی رامپوری،: ''بحر الفصاحت'' (جلد: ششم ہفتم) مرتبہ: سیّد قدرت نقوی مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۷ءص: ۱۸۰
۳۷۔ آثر زبیری: ''سلسبیل''ص۳
۳۸۔ ایضاً،ص۳
۳۹۔ ایضاً،ص۳
۴۰۔ بے چینؔ رجپوری: ''کلیاتِ بے چین'' مکتبہ بے چین، وحدت روڈ، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۲۷
۴۱۔ القرآن الحکیم: سبا: آیت ۳

۴۲۔ بے چین رجپوری: ''کلیاتِ بے چین'' ص ۲۷
۴۳۔ القرآن الحکیم: ق: آیات ۶۔۷
۴۴۔ بے چین رجپوری: ''کلیاتِ بے چین'' ص ۲۷
۴۵۔ القرآن الحکیم: الفرقان: آیات ۶۲
۴۶۔ بے چین رجپوری: ''کلیاتِ بے چین'' ص ۲۸
۴۷۔ القرآن الحکیم: الحدید: آیات ۳
۴۸۔ بے چین رجپوری: ''کلیاتِ بے چین'' ص ۲۷
۴۹۔ القرآن الحکیم: الفرقان: آیات ۶۱
۵۰۔ بے چین رجپوری: ''کلیاتِ بے چین'' ص ۲۸
۵۱۔ القرآن الحکیم: الزمر: آیات ۲۱
۵۲۔ بے چین رجپوری: ''کلیاتِ بے چین'' ص ۲۸
۵۳۔ القرآن الحکیم: الرحمان: آیات ۱۲
۵۴۔ ایضاً: عبس: آیات ۲۴۔۳۲
۵۵۔ بے چین رجپوری: ''کلیاتِ بے چین'' ص ۲۹
۵۶۔ القرآن الحکیم: الحج: آیات ۳۴
۵۷۔ القرآن الحکیم: الانشقاق: آیات ۲
۵۸۔ بے چین رجپوری: ''کلیاتِ بے چین'' ص ۲۹
۵۹۔ القرآن الحکیم: الزمر: آیات ۵۳
۶۰۔ بے چین رجپوری: ''کلیاتِ بے چین'' ص ۲۹
۶۱۔ القرآن الحکیم: الاعراف: آیات ۹۹
۶۲۔ بے چین رجپوری: ''کلیاتِ بے چین'' ص ۲۹
۶۳۔ ایضاً ص، ۲۹
۶۴۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی: ''تفہیم و تحسینِ شعر'' ص ۸۸

۶۵۔ بے چینؔ رجپوری: ’’کلیاتِ بے چین‘‘ص ۲۷

۶۶۔ ایضاً،ص ۲۸

۶۷۔ ایضاً،ص ۲۷

۶۸۔ ایضاً،ص ۲۸

۶۹۔ ایضاً،ص ۲۸

۷۰۔ پروفیسر نذیر احمد: ’’اقبال کے صنائع بدائع‘‘ آئینہ ادب، چوک مینار انارکلی لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۱۰۵

۷۱۔ بے چینؔ رجپوری: ’’کلیاتِ بے چین‘‘ص ۲۹

۷۲۔ ایضاً،ص ۲۷

۷۳۔ مولانا محمد رفیع: ’’معانی و بیان‘‘ رائے صاحب لالہ رام دیال اگروالہ، الہ آباد، ۱۹۳۰ء، ص ۸۱

۷۴۔ بے چینؔ رجپوری: ’’کلیاتِ بے چین‘‘ص ۲۸

☆☆☆☆☆☆

باب پنجم

اُردو حمدیہ قصیدہ نگاری

(۲۰۰۰ء تا ۲۰۲۲ء)

احد ، صمد ہے بلا کفو و ابن و اَب ہے تو
تعوذین کا مرجع ہے تیری ذاتِ عظیم
(سید اصغر علی شاہ)

اُردو حمدیہ قصیدہ نگاری

(۲۰۰۰ءتا۲۰۲۲ء)

اکیسویں صدی ادب کی سحر کاریوں سے نکل کر جدید سائنس اور ٹیکنالوجی سے ہمکنار ہو چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طرزِ زندگی اور مذاقِ زندگی میں ایک نیا موڑ آچکا ہے۔ نئی نئی ایجادات اور انکشافات نے انسان کو پُرانے طرزِ زندگی سے رُوگردانی پر مجبور کر دیا ہے۔ قلم اور کاغذ کا استعمال متروک ہوا چاہتا ہے۔ الفاظ کی جگہ آواز لے رہی ہے۔ قاری اب سامعین اور سامعین اب ناظرین بنتے جا رہے ہیں۔ سوچ کے دھارے بدل رہے ہیں۔ طویل مسافتیں سمٹ کر رہ گئیں ہیں۔ دنیا گلوبل ویلج کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ انسانوں پر انحصار کم ہو رہا ہے اور ٹیکنالوجی پر انحصار بڑھتا جا رہا ہے۔ سماجی رویّوں، معاشرتی تقاضوں، پیشہ ورانہ ذمہ داریوں اور کاروباری معاملات میں تحریر کی جگہ تقریر اور تصویر کی جگہ ویڈیوز نے لے لی ہے۔ انٹرنیٹ استعمال کرنے والا آج کے دور میں ڈیجیٹل شہری کہلاتا ہے۔ قلم اور تحریر کی جگہ سوشل میڈیا انٹرنیٹ، یوٹیوب، واٹس اپ، ٹویٹر، بلاگز، انسٹاگرام، لنکڈ اِن، ایمو، سکائپ، سنیپ چیٹ، ٹِک ٹاک کا استعمال عام ہے۔ سوشل میڈیا نے زندگیاں ہی بدل دی ہیں۔ یوں قلم اور کاغذ کا رجحان کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہی حال اردو ادب کا ہے، بہت سارا ادبی سرمایہ کتابی شکل میں ہونے کی بجائے چینلز کی زینت بن چکا ہے۔ یقیناً ٹیکنالوجی بُری چیز نہیں ہے اس کا استعمال صارفین پر منحصر ہے۔ خواہ زندگی کا کوئی بھی شعبہ ہو وہ اپنے زمانے کے دستیاب وسائل کے شانہ بشانہ چل کر ارتقاء کی منازل طے کرتا ہے۔ عام واقعات اور حقائق کے مناظر پیش کیے جاتے ہیں۔ یوں مناظر کی عکس بندی سے ہی ابلاغ اور ترسیل کا کام بخوبی لیا جا رہا ہے۔ کاتبوں کی بجائے کمپوزنگ اور ڈیزائننگ والی ٹیکنالوجی کا استعمال انقلاب آفرین ثابت ہوا ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس اکیسویں صدی کا پہلا عشرہ مروجہ پیمانوں میں واضح تغیّر کا دور تھا۔ مگر اکیسویں صدی کا دوسرا عشرہ بڑی تیزی سے بدلتی ہوئی اقدار اور اطوار کا عشرہ

ثابت ہوا۔تعلیم وتدریس،تجارت، بینکنگ،ادبی پروگرامز اور مشاعرے آن لائن منعقد ہونے لگے ہیں۔زمیں سُکڑ گئی ہے اور انسان پھیل گیا ہے۔لکھاری،ادباء اور شعراء باہم ایک لڑی میں پروئے گئے ہیں۔نئے نئے موضوعات دَر آئے ہیں۔ماضی کی یادوں کی ہلکی آنچ اور ایٹم بم سے وحشت زدہ مستقبل انھیں اب بھی پریشان کیے ہوئے ہے۔تاہم پھر بھی آج کا انسان ماضی سے نسبتاً زیادہ بھرپُور زندگی گزارنے کی طرف گامزن ہے۔اس وسیع وعریض کائنات میں انسان کسی ایسے امکان کی تلاش میں ہے جہاں اس کے غموں کا مداوا اور پریشانیوں کا خاتمہ ہو سکے۔ایک مسلمان کو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ رحمٰن ورحیم کا کریم در نظر آتا ہے جس کی بارگاہ میں وہ التجا ودعا کر کے چین اور راحت محسوس کرتا ہے۔اسی لیے اکیسویں صدی میں بھی اردو حمدیہ قصائد برابر لکھے جا رہے ہیں۔

عبدالعزیز خالدؔ

پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کا درخشندہ ستارہ عبدالعزیز خالدؔ ہے۔اسلامیہ کالج لاہور سے فراغتِ تعلیم کے بعد ۱۹۵۰ء میں انکم ٹیکس آفیسر تعینات ہوئے۔صاحبِ علم اور زِیرک تھے۔تقریباً ۳۷ سال کی ملازمت کے بعد ۱۹۸۷ء میں انکم ٹیکس کمشنر کی حیثیت سے محکمانہ ذمہ داریوں سے سُبک دوش ہوئے۔نعت گوئی ان کا خاص میدان اور تشخص ہے۔زنجیرِ رمِ آہو،زردِاغِ دل،سرابِ ساحل، فارقلیط،سرودِ رفتہ،گلِ نغمہ،منحمنا،ورق ناخواندہ،کلک موج تحریریں،خالدؔ شخص وشاعر آپ کی مشہور کتابیں ہیں۔آپ کے ہاں ایک اردو حمدیہ قصیدہ بھی پایا جاتا ہے جو تقریباً ۱۰۰ شعروں پر مشتمل ہے۔جو ان کے شعری مجموعے ''منحمنا'' مطبوعہ ۱۹۶۶ء کے باب سوم میں شامل ہے۔

> ''۲۸ جنوری ۲۰۱۰ء کو اردو کے نامور شاعر اور سابق سول سرونٹ عبدالعزیز خالد لاہور میں وفات پا گئے۔''(۱)

عبدالعزیز خالد کے حمدیہ قصیدے میں دیگر پاکستانی حمدیہ قصیدہ نگاروں کے برعکس عربی لغت، فارسی اثرات اور ہندی الفاظ کی بہتات دیکھنے میں آئی ہے۔جس سے قصیدے کے جاہ وجلال،علوِفکر،شان وشوکت اور نُدرتِ خیال میں اضافہ ہوا ہے۔آپ کا امتیازی

وصف یہ تھا کہ آپ عربی، فارسی، مقامی زبانوں اور سنسکرت میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔علوم و فنون، تہذیبِ مشرق و اسلام، تمدن و معاشرت، تاریخ ،اسلامی طرزِ بود و باش اور ثقافت آپ کی شاعری میں بہتات سے پائی جاتی ہے۔آپ کا حمدیہ قصیدہ ،قصیدہ نگاری کے میدان میں گراں قدر اضافہ ہے جو کہ پُر مغز، رواں اور سلاسل کا عمدہ نمونہ ہے۔

عبدالعزیز خالدؔ نے ابتدائے قصیدہ میں اپنے احوال بارگاہِ ایزدی میں پیش کیے ہیں۔ بعدازاں حمدِ ذوالجلال اور آخر میں بخشش وعطا کی استدعا کی ہے۔حمدیہ قصیدے کے پہلے شعر میں ہی قرآنِ مجید کے موضوع کو شعری قالب میں پیش کیا ہے جس سے اُن کے قرآنی بنیادوں پر حمدیہ قصیدہ اُستوار کرنے کے احوال وآثار ملتے ہیں۔

عبدالعزیز خالدؔ کے فکری تانے بانے قرآنی تعلیمات اور قرآن میں بیان کردہ اوصافِ الٰہیّہ سے ملتے ہیں۔آپ کے حمدیہ قصیدے کا پہلا شعر ملاحظہ ہو:

ہے تیری ذات سزاوارِ ہر ثنا یا رب!
کیا ذلیل کو تُو نے جلیل کا مَحرم(۲)

عبدالعزیز خالدؔ نے تشبیب میں فکری بالیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے حالات کا ذکر کیا ہے۔جس میں وہ اپنے آپ کو ظُلمتِ شب، دلِ پُر درد، مجرمِ شوق، شاعر، تنہائی، جگر سوختہ، نفس سوختہ، مژہ پُرنم، بےنوائی، بے مائیگی، پائمالِ خلائق، خزاں رسیدہ، عزیزِ مصر، صیدِ سوز وسدم، غریب الدّیار، برہنہ بوریہ اور اورنگِ خسروی قرار دیتے ہیں جو اُن کے گہرے سکوت کے جذبوں میں بُھونچال کی عکاسی کرتا ہے۔ان کے ہاں ذاتی کرب، ذاتی احوال اور بےبسی و بےکسی کو بارگاہِ ایزدی میں بڑے والہانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔شاعر کا پیرایہ اظہار اُن کے معاملاتِ زندگی اور زمان ومکان کی تلخیوں سے کشید کردہ ہے جسے وہ بارگاہِ رِلٰہی میں پیش کر کے خُلاصی کے متمنی ہیں۔چند شعری نظائر ملاحظہ ہوں:

ہجومِ شوق ہے شاعر ہے اور تنہائی
جگر فِگار، نفس سوختہ، مژہ پُرنم(۳)

ہے بے نوائی و بے مایگی متاع مری
ہوں پائمالِ خلائق ، بسانِ نقشِ قدم(۴)

عبدالعزیز خالدؔ نے تشبیب میں زمانے کی بے مروّتی، بے اعتنائی، غرور و تعصّب اور سرد مہری کو بڑے دل دوز انداز میں پیش کیا ہے۔ فکر کی چھاپ ناوکِ دِل دوز ہے۔ احساس کا دشنہ اور کرب کی پیش کش بڑی دل گرفتہ ہے۔ قصیدے کی زبان دانی اور علوِ فکر سے مملو اظہار یہ پیرائے نے عبدالعزیز خالد کو پاکستانی حمدیہ قصیدے کی روایت میں باوقار مقام عطا کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہے دانیال، شہ بخت نصر کا قیدی
نہیں ہے کوئی غریبُ الدّیار کا ہم دم(۵)

برہنہ بوریہ اورنگِ خسروی ہے مجھے
نہ شوقِ طاق و طُرم ہے نہ ذوقِ جاہ وحَشم(۶)

عبدالعزیز خالدؔ گریز میں کسرِ نفسی سے کام لیتے ہوئے مدح کی طرف نکل گئے ہیں۔ گریز کا فکری ربط آپ کی مشّاقی اور استادانہ صلاحیّتوں کا عکاس ہے۔ یہ شاعر کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ اس میں کس قدر کام یاب ہوتا ہے۔ آپ نے بڑی عمدگی سے اسے زینتِ قرطاس بنایا ہے۔ گریز کی مثالیں دیکھیے:

غرور و فخر و تعصب نہ عجب و استکبار
ہمیشہ مدِ نظر منزلِ فنا و عدم
ہمالیہ سے کہیں بڑھ کے ہیں عزیز مجھے
صَفا و نُور و اُحد ، صالح و ثبیر و اِضَم(۷)

عبدالعزیز خالدؔ کے ہاں علم وادب، قرآن فہمی اور شعور و فہم کی آبشاریں رواں ہیں۔ حمدیہ قصیدے میں ان کی فکر پر قرآن کے موضوعات کا رنگ قوسِ قزح کی مانند دِل کش و دل آویز دکھائی دیتا ہے۔ وہ الہامی کتاب کے علم وعرفان سے آگہی رکھنے والے اور داعی الیٰ

اللہ ہیں۔آپ فلسفۂ توحید،شعائرِ اسلام اور فطرتِ اسلام کے علم بردار ہیں۔آپ خود آرا ہی نہیں جہاں آرا بھی تھے اور جہانِ حمدیہ قصیدہ تو خُوب آباد کیا ہے۔اللہ تعالیٰ کی مدح وستائش کے لیے قرآنی تعلیمات کو بنیاد بنا کر شعری صورت میں پیش کرنے کا ملکہ اُنھیں خُدا کی طرف سے ودیعت کردہ ہے۔اسمائے الحسنیٰ کو عبدالعزیز خالد نے حمدیہ قصیدے میں برت کر قصیدے کو ہم دوشِ ثریّا کر دیا ہے۔اسمائے الحسنیٰ کے انتخاب سے قصیدے کی فصاحت و بلاغت، جاہ و جلال،رفعت اور شان وشوکت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔حیّ ''دائم و باقی''قیّوم''قائم بالذّات''اور قدرتوں والی ذوالجلال ذات کے متعلق قرآن فرماتا ہے:

''اللہ لَا اِلٰہ اِلَّا ھوالحیُّ القیّومُ''(۸)

ترجمہ:'' اللہ ہے جس کے سوا کسی کی پوجا نہیں آپ زندہ اوروں کا قائم رکھنے والا۔''

عبدالعزیز خالد کے ہاں اسمائے الحسنیٰ کے استعمال کی شعری مثالیں ملاحظہ ہوں:

حَفی و حافظ و حنّان و مانح و منّان
تری ہی قدرت و تقدیر سے نُشورِ رِمم
ہے تُو ہی قائم و قیّوم و دائم و دیّوم
ہر اسم ہے ترا اسمِ جلالت و اعظم(۹)

قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ کے نُور ہونے کا مضمون بیان ہوا ہے۔ عبدالعزیز خالد نے اپنے حمدیہ قصیدے میں اللہ تعالیٰ کے نُور ہونے کو توحید کی فلسفیانہ بنیادوں پر اُستوار کیا ہے۔اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات اندھیروں کو اپنے نُور سے اجالے عطا فرماتی ہے۔کوئی چیز اُس پاک ذات کی مانند و مماثل نہیں ہے اس لیے عبدالعزیز خالد نے اپنی اختراعات کی بجائے قرآن میں بیان کردہ فلسفۂ نُور کو بیان کیا ہے۔سورۃ النور میں ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ:'' اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا اس کے نور کی مثال ایسی
جیسے ایک طاق کہ اس میں چراغ ہے وہ چراغ ایک فانوس میں ہے
وہ فانوس گویا ایک ستارہ ہے موتی سا چمکتا روشن ہوتا ہے برکت
والے پیڑ زیتون سے جو نہ پورب (مشرق) کا نہ پچھّم (مغرب)
کا قریب ہے کہ اس کا تیل بھڑک اُٹھے اگرچہ اُسے آگ نہ چھوئے

نور پر نور ہے اللہ اپنے نور کی راہ بتاتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ
مثالیں بیان فرماتا ہے لوگوں کے لیے اور اللہ سب کچھ جانتا
ہے۔''(۱۰)

عبدالعزیز خالدؔ کی فکر پر قرآن کی گہری چھاپ ہونے کے حوالے سے نُور کے موضوع پر اشعار ملاحظہ ہوں:

تو کارساز و کریم و مسبب الاسباب
کرے جو ایک نگاہِ کرم تو عین کرم
نہیں ہے عقل سے بہتر کوئی سروساماں
غلامِ دل ہُوں اعوذ بک من الماثم (۱۱)

تخلیق وتدبیر، اللہ تعالیٰ کی خالقیت، کارسازی، تکوین وتشریعِ کائنات، ارتقائی نظام ،ظاہری وباطنی معاملات، معاشی ومعاشرتی اور مشیّتِ الٰہی کے تناظر میں خُدا مسبب الاسباب ہے۔ جب کوئی اس کا بندہ اسے پُکارتا ہے تو وہ اپنے بندے کی پُکار سُن کر اس کی حاجت کو پُورا کرنے کے لیے اسباب بھی خود پیدا کرتا ہے۔ اس کائنات کی تمام تر مخلوقات امرِ ربّی اور مشیّتِ الٰہی کی پابند ہیں۔ قرآن کی سورۃ النمل میں ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ:'' یا وہ جو لاچار کی سُنتا ہے جب اُسے پکارے اور دُور کر دیتا
ہے بُرائی اور تمہیں زمین کے وارث کرتا ہے کیا اللہ کے ساتھ اور
خدا ہے بہت ہی کم دھیان کرتے ہو۔''(۱۲)

عبدالعزیز خالدؔ نے مسبب الاسباب ذات کو شعری صورت میں بڑی فکر انگیز انداز میں بیان کر کے قصیدہ نگاری کو آسمان خیز کر دیا ہے۔ آسمان پیما اور آسمان رفعت فکر نے آسمانی کتاب کے موضوع کو قصیدے میں ڈھال کر اسے شہ پارۂ فن بنا دیا ہے۔ گلدستۂ معانی کے شعری نمونے ملاحظہ ہوں:

تو کارساز و کریم و مسبب الاسباب
کرے جو ایک نگاہِ کرم تو عین کرم
نہیں ہے عقل سے بہتر کوئی سروساماں
غلامِ دل ہُوں اعوذ بک من الماثم (۱۳)

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مختلف مقامات پر انبیاءِ کرام کی دعاؤں اور دیگر دعاؤں کا تذکرہ فرمایا ہے۔ان دعاؤں سے رضائے الٰہی کا حصول اور خاتمہ بالخیر کا حصول ممکن ہوتا ہے۔قرآنی دعاؤں میں سے لاتزغ قلبی والی آیت ملاحظہ ہو۔

ترجمہ:''اے رب ہمارے دل ٹیڑھے نہ کر بعد اس کے کہ تو نے
ہمیں ہدایت دی اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا کر بے شک تو
ہے بڑا دینے والا۔''(۱۴)

قرآنی دُعا سے عبدالعزیز خالدؔ حق سے رُوگردانی کی پناہ مانگ کر اور ہدایت و رحمت کی طلب کے رجحان کو پروان چڑھا کر اصلاحِ اعمال کے متمنی نظر آتے ہیں۔ان کے ہاں قرآنی دعا کا شعری رُوپ ملاحظہ ہو:

لبوں پہ ہے یہی تسبیح لا تزغ قلبی
ہے دشتِ شوق میں ہر گام جان کا جوکھم(۱۵)

عبدالعزیز خالدؔ کے فکر کے طیّور قرآنی تعلیمات کے پروں سے اُڑتے ہیں۔قرآنی تعلیمات کا عمیق نگاہی سے مطالعہ کر کے انھیں حمدیہ قصیدے کی زینت بنا کر مضبوط بنیادیں فراہم کر دی ہیں۔مخلوقِ خدا کی معراج یہ ہے کہ وہ آں حضرت ﷺ سے محبت کرے کیوں کہ خُدا کی محبت اتباعِ رسول ﷺ میں پنہاں ہے۔بغیر تحدید کے اتباعِ رسول ﷺ ہی اصل متاعِ زیست ہے۔جسے یہ دولت نصیب ہو جائے وہی صاحبِ منزل و صاحبِ مراد ہے۔قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

ترجمہ:''اے محبوب تم فرما دو کہ لوگو اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو
میرے فرمان بردار ہو جاؤ اللہ تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے
گناہ بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''(۱۶)

عبدالعزیز خالدؔ نے خدا کی وحدانیّت ،فلسفہ توحید اور رضائے الٰہیّہ کے حصول کا راز قرآنی تعلیمات کے دائرے میں رہ کر بڑے متفکّرانہ انداز سے نبھایا ہے۔ان کے ہاں غلامیِ رسول کی متاع سرمایۂ حیات ہے۔شعری مثال ملاحظہ ہو:

تُو میرے نامۂ اعمال کو نہ دیکھ ، یہ دیکھ
غُلامِ حلقہ بگوشِ حبیبِ پاکِ توام(۱۷)

عبدالعزیز خالدؔ کبھی عدیلِ عنا، کبھی جلیسِ طرب، کبھی ندیمِ ندم، کبھی اسیرِ اسف، کبھی رفیقِ سرور اور کبھی ان کے چہرے کا رنگ زعفران وبقم ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو زُہیرو ہمام بن غالب، ندیمِ غالب واقبال وشمس وتبریز اور مقلدِ جیلانی گردانتے ہیں۔ آپ ان کے ہم پلہ نہ سہی مگر اسی کاروان کے سفر میں شامل ضرور ہیں۔ ان کی فکر پر ان مشاہیر کی فکر کی گہری چھاپ کے آثار پائے جاتے ہیں۔ چند شعری مثالیں دیکھیے:

شریکِ بزمِ زُہیر و ہمام بن غالب
ندیمِ غالب و اقبال و شمس تبریزم
ہوں خوش عقیدہ ، بہ تقلیدِ غوثِ جیلانی
بہ گردنِ شعرائے زماں نُہم پایم(۱۸)

عبدالعزیز خالدؔ کا فکری کینوس وسیع ترین ہے۔ انھوں نے قرآن میں غوطہ زن ہو کر علم وعرفان کے گوہر چُن کر قصیدے میں سجائے ہیں۔ عام قاری اس حمدیہ قصیدے کی شرح و تفسیر سے توحید اور فلسفۂ توحید کے اُن پہلوؤں سے آگاہ ہو جاتا ہے جسے وہ عمومی طور پر سمجھنے سے قاصر ہو۔ ابجد کی تفسیر جاننا علم کے خزانوں کے حصول کے مترادف ہے۔ قلم نُور سے ہے اور نُور لوحِ محفوظ پر لکھا گیا ہے۔ اس علم سے دین کے احکامات سیکھ کر مقربین کی صف میں شامل ہوا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں ارشادِ ربّانی ہے۔

"ن وَ الْقَلَمِ وَ مَا يَسْطُرُوْنَ"(۱۹) ترجمہ: "قلم اور ان کے لکھے کی قسم۔"

ن حروفِ مقطعات جب کہ دینی تحریریں، کراماً کاتبین کا لکھا ہوا، لوحِ محفوظ پر لکھا ہوا علم، دین کا تحریری وجود اور آسمانی مصحف کو محفوظ کرنے کا وسیلہ بھی قلم ہے۔ عبدالعزیز خالدؔ شدّتِ جذبات سے اللہ تعالیٰ سے مقاماتِ علمِ نون وقلم کی عطائیگی کی استدعا کرتے ہیں، ان کے ہاں انتہائے عشق کا شعری نمونہ ملاحظہ ہو:

ہے بے نیاز نعیم و جحیم سے عاشق
عطا کر اس کو مقاماتِ علمِ نون و قلم(۲۰)

انتظامِ الٰہی، احوال و آثار، حق و صداقت اور نظامِ کائنات سمجھنے کے لیے

مکاشفات ومنامات سے سچائی کا تعیّن کیا ہے۔شک ضلالت وگمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔ یقینِ محکم اور عین الیقین ہی راسخ العقیدہ شخص کی متاعِ دوجہاں ہے۔وحی الٰہی مصدقہ حقائق اور مستند علوم کا مینارۂ نُور ہے۔قرآن کے دریچے سے رموزِ کائنات منکشف ہوتے ہیں۔قرآن سورۃ یونس میں مکاشفات کی روِش کے موضوع کو یوں بیان کرتا ہے:

ترجمہ: ’’اور بیشک ہم نے بنی اسرائیل کو عزت کی جگہ دی اور انہیں ستھری روزی عطا کی تو اختلاف میں نہ پڑے مگر علم آنے کے بعد بیشک تمہارا رب قیامت کے دن ان میں فیصلہ کردے گا جس بات میں جھگڑتے تھے۔‘‘(۲۱)

عبدالعزیز خالدؔ نے مکاشفات ومنامات کے موضوع کو حمدیہ قصیدے کی زینت بنا کر مدحِ ربِّ جلیل کو نئی فکری جہات سے رُوشناس کروایا ہے۔اُن کے ہاں قصیدہ اپنی تمام تر ممکنہ فکری رعنائیوں سے مزیّن ہے۔شعر ملاحظہ ہو:

مکاشفات و مَنامات کا ہو کیوں نہ یقیں
میں سُن رہا ہوں وہ نغمے جو ہیں ابھی اَجَنم (۲۲)

عبدالعزیز خالدؔ نے استغفار کی رغبت دلانے کے لیے حمدیہ قصیدے میں ذاتِ الٰہ کی طرف رجوع کرنے کا احساس بیدار کیا ہے۔فکری تحرک وفکری توسّل سے ربّ سے کیے گئے وعدے کی یاد دلائی ہے۔کیوں کہ یقینِ قلبی سے مانگی گئی استمداد واستعانت شرفِ قبولیّت سے ہم کنار ہوتی ہے۔قرآن بھی اعلان فرماتا ہے:

’’وَقُل رَّبِّ اغفِروَ ارحَم وَاَنتَ خَیرُ الرّٰحِمِینَ‘‘(۲۳)

ترجمہ: ’’ اور تم عرض کرواے میرے رب بخش دے اور رحم فرما اور تو سب سے برتر رحم کرنے والا۔‘‘

عبدالعزیز خالدؔ نے قرآنی موضوعات چُن چُن کر قصیدے کی مالا میں اس عمدگی سے سجائے ہیں کہ اُن کی فکر قرآن کی خوشبو سے معطّر ہوگئی ہے۔انھوں نے اللہ تعالیٰ اور بندے میں رشتہ برقرار رکھنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ان کے کلام میں قرآن سے استفادہ کی شعری

مثال ملاحظہ ہو:

کیا خراب و ہلاک اس کو سوفِ افعل نے
بحل کر اس کی خطا، ربِّ اغفر و ارحم!(۲۴)

عبدالعزیز خالدؔ کا یہ حمدیہ قصیدہ ان کے شعری مجموعے ''مُنحمنّا'' سے لیا گیا ہے۔یہ حمدیہ قصیدہ سر بُریدہ ہے۔جس کا آغاز باب سوم سے ہوتا ہے۔جس میں چاروں ارکانِ قصیدہ کا بھرپور اہتمام کیا گیا ہے۔لہجے میں تنّوع اور تغیّر و تبدل ہے مگر بُنت میں باہمی ارتباط و انسلاک ہے۔قدیم قصیدہ نگاروں کی طرح روایت کے پابند اور جدید قصیدہ نگاروں کی طرح پُرشکوہ قصیدہ لکھ کر دادِ تحسین کے مستحق ٹھہرے ہیں۔ان کے ہاں صنائع بدائع کے عمدہ نمونے پائے جاتے ہیں۔

شکوہِ الفاظ

عبدالعزیز خالدؔ نے کلام میں مافی الضمیر کو بیان کرنے کے لیے سادہ الفاظ کی بجائے مشکل الفاظ استعمال کیے ہیں۔جس سے ان کے کلام میں ایک خاص چاشنی اور ڈھب پیدا ہوا ہے جسے شکوہِ الفاظ کہا جا سکتا ہے۔اس ضمن میں ابوالاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

> ''صوتی آہنگ اور معنوی فضا کے لحاظ سے بعض الفاظ میں ایک خاص قسم کا طمطراق اور طنطنہ جھلکتا ہے جسے اصطلاح میں شکوہِ الفاظ کہتے ہیں''۔(۲۵)

عبدالعزیز خالدؔ نے قصیدے کی شان کے عین مطابق شکوہِ الفاظ کا بھرپور استعمال کیا ہے جس سے ان کا قصیدہ نگاری کا فن نکھر گیا ہے۔عبدالعزیز خالدؔ کے ہاں شکوہِ الفاظ کا شعر ملاحظہ ہو:

ہمالیہ سے کہیں بڑھ کے ہیں عزیز مجھے
صفا و نُور و احد، صالح و ثبیر و اِضَم (۲۶)

عربی اثرات

اردو حمدیہ قصیدے نے عربی زبان و ادب سے گہرا اثر قبول کیا ہے۔عبدالعزیز خالدؔ

نے عربی قصیدہ نگاروں کی تتبع میں حمدیہ قصیدہ لکھ کر پاکستانی اردو حمدیہ قصیدے کی روایت میں علم وفضل کا سرسبز اور مہکتا ہوا چمن آباد کیا ہے۔عربی اصطلاحات لاتُو آخذنی!، لا تزغ قلبی، ربّ اغفِر وارحَم !وغیرہ استعمال کی ہیں۔مثال ملاحظہ ہو:

ہے بال بال گنہگار ، لا تُو آخذنی!
ہے مرد افگن و مزمن شرابِ تیز منم (۲۷)

فارسی اثرات

عبدالعزیز خالدؔ نے فارسی الفاظ وتراکیب کا استعمال کرکے حمدیہ قصیدے کو فصاحت وبلاغت سے مزیّن کر دیا ہے۔ان کے کشتِ زار میں فارسی الفاظ وتراکیب کا استعمال مہکتے ہوئے پھولوں کا منظر پیش کرتا ہے۔جس سے ان کی ہنرمندی اور علمیّت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ان کے استعمال کردہ فارسی الفاظ کی شعری مثال ملاحظہ ہو:

پڑھوں گداختن و سوختن کا باب مُدام
کہ دمبدم ز تلوّن اسیرِ دامِ نَوم (۲۸)

زبان وبیان کی چاشنی

عبدالعزیز خالدؔ کے کلام میں زبان و بیان کی چاشنی عطیۂ پروردگار ہے۔تخلیق کار نے ڈوب کر اور جذب وکیف وسرمستی میں روزمرہ اور محاورہ برمحل زیبِ قرطاس کیا ہے جس سے روانی، تسلسل اور خیال کی رفعت بڑھ گئی ہے۔زبان و بیان کی چاشنی کا حامل ایک شعر ملاحظہ ہو:

ہے تُو ہی قائم و قیّوم و دائم و دیّوم
ہر اسم ہے ترا اسمِ جلالت و اعظم (۲۹)

سہلِ ممتنع

سادہ سا اور سہل دکھائی دینے والا کلام سہلِ ممتنع ہے لیکن اگر اس جیسا کلام لکھنا مقصود ہوتو نہایت مشکل ہو جائے۔عبدالعزیز خالدؔ اس فن کے ماہر ہیں۔عام فہم الفاظ کو اس

لہجے اور انداز سے کہہ دینے کا فن کہ شعر کی خوبیاں آشکار ہو جائیں۔ سہلِ ممتنع کی شعری مثال ملاحظہ ہو:

میں کر رہا ہوں اسے نوش جبراً و قہراً
نہیں ہے مجھ سے نہاں، زہر ہے مَشُوبِ دَسَم (۳۰)

استفہامیہ لہجہ

استفہامیہ طرز جہاں قاری کی توجہ کے حصول میں معاون ثابت ہوتا ہے وہاں پوچھنے یا دریافت کرنے سے قاری ہمہ تن گوش ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ استفہامیہ انداز کو کلام کی خوبی تصوّر کیا جاتا ہے۔ یوں کلام میں نئی جہات اور استفسارات کا دروا ہوتا ہے۔ عبدالعزیز خالؔد کے ہاں اس کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ کلام موزوں اور مؤثر انداز میں ابلاغ کا فرض نبھاتا ہے۔ متعدد اشعار میں سے ایک شعر بطور نمونہ ملاحظہ ہو:

وہ آفتابِ جہاں تاب ہے میں ظلمتِ شب
ہوں کیسے اس سے ملاقی، بَاوٗ چگونہ رسم؟(۳۱)

ندائیہ لہجہ

پاکستانی اردو حمدیہ قصیدہ نگاری میں ندائیہ لہجہ بھی پایا گیا ہے۔ شعرا نے اپنے ربّ کی مدح میں اُسے پکارا بھی ہے کیوں کہ اُسی ذات کو پُکارنا ہی اہلِ ایمان کا شعار رہا ہے۔ غیر اللہ کا اِرتداد اور اللہ سے اِستمداد ہی عین ایمان ہے۔ حروفِ ندا کو عبدالعزیز خالؔد نے بھی بڑی معنوی صورت میں برتا ہے۔ ندا میں جذبے کی شدّت نے قصیدے کی فنّی تعمیر کو دل آویز اور دل دوز بنا دیا ہے۔ ندائیہ لہجے کی شعری مثال دیکھیے:

کیا خراب و ہلاک اس کو سوفِ افعل نے
بَحَل کر اس کی خطا، ربِّ اِغفِر و اِرحَم!(۳۲)

تلمیح

تلمیح کسی قصّے، تاریخی واقعے یا تاریخی کردار کی طرف اشارہ کرنا، جس میں قرآنی یا

کوئی تاریخی داستان ہو۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

> ”زبان کے ابتدائی دور میں چھوٹے چھوٹے سادہ خیالات اور معمولی چیزوں کے بتانے کے لیے الفاظ بنائے گئے تھے۔ رفتہ رفتہ انسان نے ترقی کا قدم آگے بڑھایا۔ لمبے لمبے قصّوں اور واقعات و حالات کی طرف خاص خاص اشارے ہونے لگے۔ جہاں وہ الفاظ زبان پر آئے وہ قصّے، وہ واقعے آنکھوں کے سامنے پھر گئے، ایسا ہر اشارہ تلمیح کہلاتا ہے۔“(۳۳)

عبدالعزیز خالدؔ نے اس قصیدے میں جاہ و جلال اور پُر شکوہ اسلوب کے لیے تلمیحات کا بھی استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شعر ملاحظہ ہو:

گلِ بہار ہوں لیکن خزاں رسیدہ ہوں
عزیزِ مصرِ سخن ہوں پہ صیدِ سوز و سَدَم(۳۴)

صنعتِ تکرار

شاعری میں ایک لفظ یا چند الفاظ کو دوہرانے کا عمل صنعتِ تکرار کہلاتا ہے۔ صنعتِ تکرار کا استعمال کلام کو خوب صورت اور پُر زور بنا دیتا ہے۔ عبدالعزیز خالدؔ نے صنعتِ تکرار کو عمدگی سے برتنے کی سعی کی ہے۔ یوں کلام میں زورِ بیان، خوش سلیقگی اور تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔ پروفیسر نذیر احمد لکھتے ہیں:

> ”لفظوں کے تکرار سے کلام میں زور، تاثیر یا حسن پیدا کرنا۔“(۳۵)

عبدالعزیز خالدؔ کے ہاں صنعتِ تکرار کی مثال ملاحظہ ہو:

چراغِ قافلۂ درد ہے دلِ پُر درد
صدَف ہے سینے کا گنجینہ دارِ گوہرِ غم(۳۶)

غیر مردف اشعار

تمام عربی قصائد غیر مردف ہوتے تھے لیکن بعد ازاں ایرانی قصیدہ نگاروں نے اس میں ردیف کا بھی اضافہ کر دیا اور اس کا اہتمام باقاعدگی سے کرنے لگے۔ ایرانیوں کی تقلید میں

اردو قصیدہ نگاروں نے بھی ردیف کا اہتمام کرنا شروع کر دیا۔ تاہم عبدالعزیز خالدؔ نے غیر مردف حمدیہ قصیدہ ہی لکھا ہے۔ یہ حمدیہ قصیدہ سر بُریدہ ہے مگر حسنِ ادائیگی، نُدرتِ خیال اور چاشنی کی دولت سے مالا مال ہے۔ غیر مردف ہونے کے باعث قافیہ کی بنیاد پر میمیہ قصیدہ کہلاتا ہے۔ نمونے کے طور پر اس کا پہلا شعر ملاحظہ ہو:

ہے تیری ذات سزاوارِ ہر ثنا یا رب!
کیا ذلیل کو تو نے جلیل کا مَحرم (۳۷)

علیٰ ھذا القیاس ان کا شعری اسلوب قصیدے کی شان کا عکاس اور غماز ہے۔ ہیئت کی پاس داری اور صنفی تشکیل کے باعث قصیدہ متقدمین کی یاد دلاتا نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں فکر و فن نے ایک دوسرے کی تکمیل کر کے عالی شان اور جاہ و جلال کا حامل حمدیہ قصیدہ پاکستانی اردو حمدیہ قصیدے کی روایت کو عطا کیا ہے۔ جو اردو ادب میں ایک معتبر اضافہ ہے۔ یہ توحید، فلسفۂ توحید، رموزِ کائنات اور خدا کی شناخت کا بے پایاں سرمایۂ علم و حکمت ہے۔ قرآنی تعلیمات پر اُستوار فکر اور قصیدے کے مروجہ اُصولوں پر مبنی فن نے اسے اردو ادب کا سرمایۂ افتخار بنا دیا ہے۔ اکیسویں صدی کی اردو حمدیہ قصیدے کی روایت ایسے قصیدہ نگار کی مقروض رہے گی۔

پروفیسر سیّد اصغر علی شاہ

اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کی روایت کا اگلا معتبر نام خاندانِ سادات کے چشم و چراغ سیّد اصغر علی شاہ کا ہے۔

''۲۰ اکتوبر ۲۰۱۶ء کو جب اُن کا انتقال ہوا تو اُن کے جنازے پر
پورا ملتان اُمڈ آیا'' (۳۸)

آپ کے والد سیّد اللہ دیا شاہ کاروباری آدمی تھے۔ آپ نے ۱۹۳۹ء میں سٹی سنٹر سکول اندرون بوہڑ گیٹ ملتان سے تعلیم کا آغاز کیا۔ اسی سکول سے میٹرک کا امتحان اوّل درجے میں پاس کیا۔ ایمرسن کالج ملتان سے ایف اے اور بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اسی دوران میں اس کالج کے استادِ محترم منظور احمد سے علمِ عروض سیکھا۔ ۱۹۵۶ء میں پنجاب

یونیورسٹی اورینٹل کالج سے ایم اے عربی کا امتحان پاس کیا۔اے جی آفس میں ملازمت کے دوران میں ایم اے اسلامیات پاس کیااور ۱۹۵۸ءمیں لیکچرار عربی کی حیثیت سے میانوالی کالج میں فرائض منصبی سنبھالے۔ بعدازاں لیّہ اور منٹگمری (موجودہ ساہیوال) کالج میں فرائضِ منصبی ادا کیے۔۱۹۶۹ءمیں گورنمنٹ کالج ملتان منتقل ہوگئے۔ بیرونِ ملک ریاض یونی ورسٹی اور خرطوم یونی ورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔آپ کوعلم الاصوات کا ماہر ہونے کا شرف حاصل ہے۔ آپ کی علم اور قلم دوستی آپ کے کلام سے بھی جھلکتی ہے۔آپ کا قلم حمد،نعت،منقبت،ہجواور قصیدہ نگاری میں خوب جوہر دکھاتا ہے۔آپ کے کلیات میں ۲۱ شعروں پرمبنی خطابیہ حمدیہ قصیدہ ملتاہے۔یہ اُن کا میمیہ قصیدہ ہے۔

پروفیسر سیّد اصغر علی شاہ کے نزدیک قرآنِ مجید فرقانِ حمید،احادیثِ مبارکہ،شعائرِ اسلام اور آثارِ کائنات حمدیہ قصیدے کی عملی تصاویر ہیں۔محبّت وعقیدت نے عشق کا روپ دھار کر رموزِ کائنات میں پنہاں توحید کو فکر کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔انھوں نے شعر میں موجود ''ع'' کو عقل سے استعمال کر کے شر سے بچا کر خیر بنا دیا ہے۔اللہ تعالیٰ کی توحید کا علم بردار اور قرآنی تعلیمات سے کشید کردہ شعری مثال دیکھیے:

وہ ایک ذات ھو اللہ لا شریک لہٗ
بری ز قیدِ زمان و مکاں ، قدیر و قدیم (۳۹)

سیّد اصغر علی شاہ نے بڑی ہی سلیقگی،عمدگی،شائستگی اور فکری جامعیّت سے اسماءالحسنیٰ کو قصیدے کا موضوع بنایا ہے۔رحم وکرم والی صفات بیان کر کے شاعر اللہ تعالیٰ سے رحم وکرم کا متمنی ہے۔آپ نے مدحِ ربِّ جلیل کے لیے قرآن کی بیان کردہ صفاتِ الٰہیّہ زیبِ قرطاس لاکر فصاحت و بلاغت اور شکوہِ زبان کا گلدستہ بنا دیا ہے۔شعری روپ دھارے اسماءالحسنیٰ کی عمدہ مثال ملاحظہ ہو:

برائے مغفرت الفاظ چند، اے غفار!
کہ تو رحیم ، تو رحمان، تو کرم ، تو کریم (۴۰)

جہاں دیگر سورتوں میں اللہ تعالیٰ کی توحید عمومی طور پر بیان کی گئی ہے اور توحید و

صفاتِ کمالیہ کے گوشوں کو بیان کیا گیا ہے۔ وہیں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاخلاص میں جامع اور پُر حکمت انداز میں توحید کو ایک ہی سورۃ میں بیان فرما کر ہمیں بتا دیا کہ خالص توحید کیا ہے۔ اس سورۃ کی جامعیّت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ تفاسیر میں اس کے بیس ناموں کا تذکرہ ملتا ہے جو اس کی معنویّت کا عکاس ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات لم یزل و لایزال اور احدیّت واُلوہیّت کی شان رکھتی ہے۔ سیّد اصغر علی شاہ نے سورۃ الاخلاص کو شعری صورت میں پیش کر کے اپنی فکری پختگی اور علمی دست گاہ کا لوہا منوایا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

ترجمہ: ''تم فرماؤ وہ اللہ ہے وہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس کی کوئی اولاد۔ اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا۔ اور نہ اس کے جوڑ کا کوئی۔'' (۴۱)

سیّد اصغر علی شاہ کے ہاں توحید کی صفات کی شعری مثال ملاحظہ ہو:

احد ، صمد ہے بلا کفو و ابن و اب ہے تو
تعوذین کا مرجع ہے تیری ذاتِ عظیم (۴۲)

سیّد اصغر علی شاہ نے حمدیہ قصیدے میں ان موضوعات کو موضوعِ سخن بنایا ہے جو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی شان میں بیان فرمائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مختارِ کل ہے۔ تمام اختیارات اس کے ذاتی ہیں۔ کوئی اس کا ساجھی اور شریک نہیں ہے۔ اقتدار و اختیارات کا وہی اکیلا مالک ہے۔ وہ زمان و مکان کی قید سے پاک ہے۔ سارے زمانے اُسی کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

ترجمہ: ''اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔'' (۴۳)

سیّد اصغر علی شاہ کے حمدیہ قصیدے میں اس موضوع پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ ذات مالک و مختار کائنات کن
صفات حاکم مطلق تمام عین حکیم
وہ ایک ذات ھو اللہ لا شریک لہٗ
بری ز قیدِ زمان و مکاں ، قدیر و قدیم (۴۴)

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی تخلیق میں حسنِ ترتیب، ضابطے، قرینے اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی دل کشی رکھی ہے۔ شاعر کے زورِ تخیل کو اس وقت اور تقویت ملتی ہے جب وہ حسین و جمیل کائنات، چمکتا ہوا آفتاب، دمکتا ہوا ماہتاب، روشنی بکھیرتے ستارے اور کہکشاؤں کی پھل جھڑیاں دیکھتا ہے۔ فرشِ ارضی اور سمائی طبق دیکھ کر سیّد اصغر علی شاہ کے قلم نے مچل کر قرآن کی آیتِ مقدسہ کو شعری قالب میں ڈھال کر اپنے حمدیہ قصیدے کا موضوع بنایا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ''بے شک تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمان اور زمین چھ دن میں بنائے پھر عرش پر اِستواء فرمایا جیسا اس کی شان کے لائق ہے رات دن کو ایک دوسرے سے ڈھانکتا ہے کہ جلد اس کے پیچھے لگا آتا ہے اور سورج اور چاند اور تاروں کو بنایا سب اُس کے حکم کے دبے ہوئے سن لو اسی کے ہاتھ ہے پیدا کرنا اور حکم دینا بڑی برکت والا ہے اللہ رب سارے جہان کا۔'' (۴۵)

سیّد اصغر علی شاہ کے ہاں قرآنِ مجید میں بیان کردہ مضمون کے شعری نمونے ملاحظہ ہوں:

بچھانے والا سکوں کے لیے فراشِ ارض
بنانے والا سمائی طبق، بنائے صمیم
نجوم و شمس و قمر تُو نے ہی کیے تسخیر
سکھائی تُو نے ستاروں کی گردشِ تقویم (۴۶)

قصیدے میں علو فکر کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ سید اصغر علی شاہ نے ندرتِ خیال ،فلسفیانہ اندازِ فکر، مضمون آفرینی اور زورِ بیان کو کام میں لاتے ہوئے حیات اور متعلقاتِ حیات کی تاروں کو چھیڑا ہے۔ کائنات میں حیات کی کئی صورتیں ہیں۔ انھی میں جمادات، نباتات، معدنیات اور خود انسان بھی ہے۔ حیات کے ان مختلف پہلوؤں میں انسان افضل ترین ہے۔ اس کائنات کا بقا و قیام اُسی ربّ کی طرف لوٹ جانے میں ہے۔ معدن و نبات و حیات کی منزلوں سے آگے نکل کر فنا فی اللہ ہونے اور سرِ تسلیم خم کرنے میں بقا کا راز رکھاّ گیا ہے۔ خالقِ کائنات نے کئی عالَم پیدا کیے ہیں مثلاً عالَمِ جمادی، عالَمِ نباتی، عالَمِ حیوانی، عالمِ انسانی، عالمِ ظاہری، عالمِ باطنی، عالمِ فانی اور عالمِ بقا وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کی عطاؤں کا شکر بجا

لانے اور مدحِ ربِّ جلیل کے لیے آپ نے گلشنِ حمد میں معرفت کے نگینے جڑے ہیں۔اصغر علی شاہ کے ہاں شعری نمونہ ملاحظہ ہو:

تُو عرض و جوہر کل معدن و نبات و حیات
ترے حضور ہر اک شے کا خم سر تسلیم(۴۷)

اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔سیّد اصغر علی شاہ قرآن سے لے کر لوحِ محفوظ تک کے مضامین کو حمدیہ قصیدے کی زینت بنانا چاہتے ہیں۔وہ ثنائے ربّ ِجلیل کے لیے اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کو بیان کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو اپنا نائب اور خلیفہ بنایا۔اسے علم عطا فرما کر فرشتوں پر مقدم کر دیا۔پھر فرشتوں کو جھکایا تا کہ حق عیاں ہو سکے۔اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بھی بیان کیا ہے۔ارشادِ ربّانی ہے۔

ترجمہ:'' اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں بولے کیا ایسے کو نائب کرے گا جو اس میں فساد پھیلائے اور خونریزیاں کرے اور ہم تجھے سراہتے ہوئے تیری تسبیح کرتے اور تیری پاکی بولتے ہیں فرمایا مجھے معلوم ہے جو تم نہیں جانتے۔''(۴۸)

اصغر علی شاہ کا محاسنِ کلام اور نکتہ سنجی سے محیط یہ شعر دیکھیے:

تری عطا سے ہے آدم خلیفۂ ارضی
جھکیں ملائکہ، وہ اسم اُسے کیے تعلیم(۴۹)

اگر چہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں، رسولوں کو جو شان، انعامات اور فضائل عطا کیے ہیں وہ پیرایہ اظہار سے ماورا ہیں۔نبوت خود عظیم ترین عطا ہے۔یہاں آزمائشوں سے گزارا وہاں اُنھیں ظلم و بربریّت کے سہنے کے بعد اعزاز و اکرام سے بھی نوازا۔نار کے برد و سلام اور طُور پر نُور کی تجلی جیسے موضوعات سے مدحِ ربِّ جلیل اور خدا کی عنایات کو بڑی عمدگی سے کشید کیا ہے۔شعر ملاحظہ ہو:

بنائے نار کو برد و سلام بہرِ خلیلؑ
جلائے نُور تجلّی سے طور بہر کلیم (۵۰)

اللہ تعالیٰ خود علیم ہے بلکہ اس کا علم کائنات کو محیط کیے ہوئے ہے۔ وہ علم کو پسند فرماتا ہے۔ علم کی بدولت ہی انسان کو اللہ تعالیٰ کی پہچان نصیب ہوتی ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ بے علم نتواں خدا را شناخت۔ اللہ تعالیٰ نے علم کی بدولت نہ صرف انسان کو تکریم دی بلکہ فہم و فراست کا خزانہ عطا کر کے اپنی ذاتِ با برکات سے آگاہی کا شعور بھی بخشا ہے۔ علم اور قلم کے بارے میں ارشادِ ربّانی ہے۔

ترجمہ: ''پڑھو اور تمہارا رب ہی سب سے بڑا کریم جس نے قلم سے
لکھنا سکھایا آدمی کو سکھایا جو نہ جانتا تھا۔'' (۵۱)

سیّد اصغر علی شاہ کے ہاں اردو حمدیہ قصیدے کی شان و شوکت، علوِ فکر اور نئے قالب میں ڈھال کر معانی کشید کرنے کے عمدہ نمونے ملاحظہ ہوں:

نوازا تو نے ہی انسانیت سے حیواں کو
سکھا کے نطق بتائے اُسے الف با جیم
عطا کیا اُسے تُو نے ہی علم نامعلوم
قلم کے ساتھ ہی بخشا خزانہ تفہیم (۵۲)

سیّد اصغر علی شاہ کے خطابیہ قصیدے کے آخر میں حسنِ طلب اور دعا بھی مانگی گئی ہے۔ دعا کے اشعار دیکھیے:

بڑے عفو معاصی بہ حمدِ عجز و نیاز
حضور قدس میں لایا ہے ایک عہد اثیم
احد تک احمدِ محبوبِ حق وسیلہ ہے
اسی رعایتِ لفظی سے قافیہ میم (۵۳)

فکر و فن باہم مل کر ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ فکر اگر فن سے خالی ہو تو ادب کا عالی شان محل بھی کھنڈر دکھائی دے گا۔ شاعری طرزِ اظہار کا نام ہے جس میں شاعر بنت اور اسلوب کی مدد سے عالی شان محل تعمیر کرتا ہے۔ سیّد اصغر علی شاہ نے حمدیہ قصیدے میں فن کے جو عمدہ نمونے چھوڑے ہیں ان کا اجمالی خاکہ دیکھتے ہیں۔ مطلع کا شعر دیکھیے:

جسارت اس کی کریما ہے حمد کی تنظیم
زباں میں جس کی ہے لکنت، دماغ جس کا سقیم (۵۴)

سیّد اصغر علی شاہ کا یہ خطابیہ حمدیہ قصیدہ ہے۔ یہ قصیدہ میمیہ قصیدہ ہے جو تشبیب اور گریز کے بغیر ہے۔ ہاں البتہ اس میں قصیدے جیسا جاہ و جلال اور علوِ خیال پایا گیا ہے۔ قصیدے کے تمام ارکان کا اہتمام نہ ہونے کے باعث قصیدہ ہیئتی تشکیل کے اعتبار سے تکمیل کا متقاضی ہے۔ تاہم عمدہ خطابیہ قصیدہ اور صنائع بدائع کی خوبیوں سے مزیّن ہے۔

تراکیب کا تنوّع

سیّد اصغر علی شاہ کا حمدیہ قصیدہ خوش نما تراکیب سے مزیّن ہے جن سے اللہ تعالیٰ کی محبّت کی مٹھاس ٹپکتی ہے۔ انھوں نے حمدیہ قصیدے کی در و بام کو تراکیب کی قندیلوں سے سجایا ہے۔ ان کے ہاں اضافتی تراکیب ملاحظہ ہوں: ذاتِ عظیم، زقیدِ زمان و مکاں، فراشِ ارض، جوازِ غیب، صدرتِ لاحیم، محبوبِ حق، رعایتِ لفظی وغیرہ۔

اصغر علی شاہ کے ہاں عطفی تراکیب کا استعمال ان کے فن کی پرکاری پر دلالت کرتا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں: ظلوم و جہول، قدیر و قدیم، مالک و مختار، برد و سلام، عجز و نیاز وغیرہ۔ سہ لفظی عطفی ترکیب کے نمونے دیکھیں: نجوم و شمس و قمر، معدن و نبات و حیات وغیرہ۔

چستی بندش

دقیق قسم کے الفاظ کو اس طرح مہارت اور سلیقگی سے برتنا کہ کلام کی روانی اور بلاغت متاثر نہ ہو چستی بندش کہلاتا ہے۔ اصغر علی شاہ کے ہاں لفظی نظام کی بوقلمونی اور قادرالکلامی کی شعری مثال ملاحظہ ہو:

وہ ذات مالک و مختار کائنات کُن
صفات حاکم مطلق تمام عین حکیم (۵۵)

شکوہِ الفاظ

قصیدے کی خاص پہچان شکوہِ الفاظ کا جاہ و جلال کے ساتھ استعمال ہے جس سے

کلام میں وضع داری اور شان وشوکت بڑھ جاتی ہے۔اس حوالے سے ابوالاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

''صوتی آہنگ اور معنوی فضا کے لحاظ سے بعض الفاظ میں ایک خاص قسم کا طمطراق اور طنطنہ جھلکتا ہے جسے اصلاح میں شکوہِ الفاظ کہتے ہیں۔''(۵۶)

سید اصغر علی شاہ کے حمدیہ قصیدے میں شکوہِ الفاظ کی مثال ملاحظہ ہو:

تری جزا کے خزائن پہ دال ہشت بہشت
تری سزا کے قرائن پہ دال ہفت جحیم(۵۷)

محاکات نگاری

الفاظ کے اس طرح سے تصویری پیکر تراشنا کہ مجسم متحرک نظر آئے محاکات نگاری کہلاتا ہے۔سید اصغر علی شاہ اپنے کلام میں چشمِ تصور اور مشاہدے کی بنیاد پر کائنات سے تصویری پیکر تراشتے ہیں جس سے کلام میں معنویّت اور عکس اُتر آیا ہے۔اس کی شعری مثال ملاحظہ ہو:

گر ایک قطرے میں لف ہے تسلط کونین
تو ایک ذرّے میں کل کائنات کی ترمیم(۵۸)

تجنیسِ زائدوناقص

صنعت تجنیسِ زائدوناقص میں ایک لفظ میں دوسرے لفظ کی نسبت ایک حرف زیادہ یا کم ہوتا ہے۔جس سے فن کی صوتی اور معنوی تاثیر بڑھ جاتی ہے۔پروفیسر نذیر احمد لکھتے ہیں:

''دو متجانس الفاظ میں سے ایک کا دوسرے سے ایک حرف کم یا زیادہ ہونا۔''(۵۹)

سید اصغر علی شاہ کے ہاں صنعت تجنیسِ زائدوناقص کی شعری مثال ملاحظہ ہو:

تری جزا کے خزائن پہ دال ہشت بہشت
تری سزا کے قرائن پہ دال ہفت جحیم(۶۰)

درج بالا شعر میں ''ہشت اور بہشت''میں صنعت تجنیسِ زائدوناقص استعمال ہوئی ہے۔

قطار البعیر

صنعت قطار البعیر کے استعمال سے شعر میں چاشنی اور حسن بڑھ جاتا ہے۔اس میں مصرع اول کا آخری لفظ مصرع ثانی کے شروع میں استعمال کیا جاتا ہے۔اس ضمن میں رحمت یوسف زئی لکھتے ہیں:

''یہ صنعت مفرد شعر میں ہوتی ہے اور اس میں بھی صنعت محاذ کی طرح پہلے مصرعے کا آخری لفظ اور دوسرے مصرعے کا پہلا لفظ ایک ہوتا ہے۔صنعت محاذ اور اس میں فرق یہ ہے کہ محاذ میں اس صنعت کا تسلسل ہوتا ہے۔اور بند کے دوسرے مصرعوں میں بھی یہ تسلسل برقرار رہتا ہے۔جن کہ قطار البعیر صرف ایک ہی شعر تک محدود ہے۔'' (۶۱)

اس صنعت کے استعمال کی بھر پور مہارت سید اصغر علی شاہ نے برتی ہے۔مثلاً:

احد ، صمد ہے بلا کفو و ابن و اب ہے تو
تعوذین کا مرجع ہے تیری ذاتِ عظیم (۶۲)

اس شعر میں مصرع اول کے اختتام پر لفظ ''تو'' ہوا ہے اور دوسرے مصرعے کا آغاز بھی اسی لفظ سے ہوا ہے۔

ساحرؔ لکھنوی

اصل نام سیّد قائم مہدی نقوی ہے۔ادبی دنیا میں ساحرؔ لکھنوی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

''ساحرؔ لکھنوی نے ۲۵ نومبر ۲۰۱۹ء کو کراچی میں وفات پائی'' (۶۳)

آپ کا تخلص ساحرؔ تھا۔آپ پاکستان کے نام ور مرثیہ گو اور قصیدہ نگار شاعر تھے۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔آپ کا تعلق علمی اور ادبی گھرانے سے تھا۔یوں بچپن سے ہی آپ کو ادبی ماحول میسّر آ گیا تھا۔آپ کے نانا جان سیّد محمد ذکی ہاتف کا شمار مشہور شعراء میں ہوا کرتا تھا۔ساحر لکھنوی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔آپ میدان علم میں ایم اے، ایل ایل بی اور

ڈی آئی ایل ایل کی ڈگریاں حاصل کر کے کامیابیاں سمیٹنے لگے۔آپ نے ایک انٹرنیشنل انڈسٹریل انسٹی ٹیوٹ میں پرسنل اینڈ ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ کے طور پر فرائضِ منصبی بھی ادا کیے۔آپ نے اپنے کارہائے منصبی ۱۹۹۳ء تک ادا کیے۔شاعری سے خاص رغبت تھی۔کئی اصنافِ شاعری میں طبع آزمائی کی۔شاعری کا آغاز سلام لکھنے سے کیا لیکن یہ سفر غزل سے ہوتا ہوا قصیدہ،سلام،منقبت،مرثیہ گوئی،اور رباعیات پر منتج ہوا۔تلمیحات و مصلحات، شمشیر و سناں اور مرثیہ پر اعتراضات کا تنقیدی جائزہ ان کی معروف کُتب ہیں۔یہ ان کی خوش بختی اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے گہری وارفتگی کی علامت ہے کہ ان کے ہاں ایک حمدیہ قصیدہ بھی ملتا ہے۔یہ حمدیہ قصیدہ ان کے مجموعے ''صحیفۂ مدحت'' کی زینت ہے۔۴۰ شعروں پر مشتمل یہ لامیہ قصیدہ ان کی شعری ریاضت اور فکری پختگی کا عمدہ نمونہ ہے۔ساحرؔ لکھنوی کی مدحِ ربِّ جلیل میں توحید کی نورانی کرنیں سجانے کی سعی اور کوشش روح کو اُجالنے کی قوّت رکھتی ہے۔ اردو حمدیہ قصیدے کی روایت میں دورِ جدید کا یہ قصیدہ فکری اُڑان کا ایک عمدہ اضافہ ہے۔حمدیہ قصیدے کا مطلع ملاحظہ ہو:

اے قلم حمد کے جادہ میں چل اب سَر کے بل
اِس میں ہر گام ہے اک شُکر کے سجدہ کا محل (۶۴)

ساحرؔ لکھنوی اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتوں کے اعتراف میں اس کا شکر بجا لاتا ہے اور اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوتا ہے۔دراصل یہ بھی مدحِ ربِّ جلیل ہے کہ اس کا بندہ اللہ کے احسان و نعمت پر حمد سرا ہے۔اللہ کا ذکر کامل ایمان کی علامت بھی ہے اور دنیا و آخرت میں بھلائی پانے کا وسیلہ بھی ہے۔

ساحرؔ لکھنوی نے حمدیہ قصیدے میں شکر و سجود کے موضوع کو برت کر کلام کی معنویّت و جامعیّت میں اضافہ کر دیا ہے۔گلدستۂ فکر کی رنگینی کا شعری نمونہ دیکھیں:

شُکر اُس کا کہ جو ہے لائقِ صد شکر و سجود
شُکر اُس کا کہ جو ہے مرکزِ اُمیّد و امل (۶۵)

قرآنی اصطلاحات کا استعمال حمدیہ قصیدے کو سوچوں کی تطہیر عطا کرتا ہے۔توحید

کا بیان استدلالی انداز اپنا کر کمالِ فکر کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ اللہ کے کلام میں تبدیلی ناممکن ہے۔ خاص علمی یا تکنیکی لوگ ہی قرآن کے بیان کردہ موضوعات سے اختراعات کر سکتے ہیں۔ قرآن کے معانی و مفہوم کو پُر حکمت انداز میں سمجھنے کے لیے ساحؔر لکھنوی نے اپنے کلام کو موضوعاتِ قرآن کی طرف موڑا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

''قُل ھُوَ اللہُ اَحَد (۱) اَللہُ الصَّمَدُ''(۶۶)

ترجمہ:'' تم فرماؤ وہ اللہ ہے وہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے۔''

سورۃ الاخلاص سے کشیدہ کردہ فکری زاویہ دیکھیے اور شعری مثال ملاحظہ ہو:

قل ھواللہ احد لکھ سرِ پیشانیِ حمد
وہ احد جس کا مقابل نہ مماثل نہ بدل
اک فقط ''کن'' کے اشارے سے کیے خلق اس نے
بحر و دریا و دَر و گلشن و صحرا و جبل (۶۷)

قل ھو اللہ احد اللہ کی توحید، کُن تخلیقِ کائنات کے لیے حکمِ ربی اور احسنِ تقویم اشرف المخلوقات (رسولوں، انبیاء، صحابہ، صالحین اور انسانوں) کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ساحؔر لکھنوی نے اسرارِ توحید اور معرفتِ وجودِ باری تعالیٰ کی تاروں کو چھیڑ کر حمدیہ قصیدے میں ندرتِ خیال اور فکر کی اُڑان کو فزوں تر کر دیا ہے۔ وہ ذات جس کے اقتدار کی کُرسی کی وسعت زمین و آسمان سے وسیع ہو اور بندہ مخلوق ہو کر اپنے خالق کی شان کا کیسے احاطہ کر سکتا ہے؟ بندے کی سوچ محدود اور خالق زمین و آسمان کا نُور ہے۔ اللہ ایک چھپا ہوا خزانہ تھا پھر حضرت آدمؑ کی تخلیق کا مقصد اپنی ذات کو اس میں چھپا کہ آنا تھا۔ پھر بھید کھلا جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے اپنے ربّ کو پہچانا۔ عرفانِ ذات ہی عرفانِ الٰہی ہے۔ شعور و اِدراک کو قرآن و حدیث کی نورانی چھڑی کی مدد سے ہی راہِ راست پر گامزن کیا جا سکتا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

کون ہے، کب سے ہے، کیسے ہے وہ اور کیسا ہے
کوئی کر سکتا نہیں ہے یہ معمّہ کبھی حل

ناخنِ عقل سے جو کھل نہیں سکتا ہے کبھی
ذات ہے اس کی وہ اک عقدۂ ما لاینحل
اس کا جلوہ جو دکھا دے نگہِ ظاہر کو
کوئی آئینہ نہیں جس پہ ہو ایسی صیقل (۶۸)

ساحرؔ لکھنوی نے جوہرِ کائنات، عالمِ چار دانگ اور نظامِ کائنات میں اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کے آثار کو اپنے کلام میں سمویا ہے۔ نگاہِ شوق ربِّ جلیل کی کائنات کی بناوٹ، ارتباط وانسلاک اور خوب صورتی کے مشاہدے میں مگن ہے۔ نور ونکہت میں مستغرق تمنّاؤں کا پاکیزہ جھرمٹ بار بار نعرۂ مستانہ بلند کرتے ہوئے مدح سرائی میں لگ جاتا ہے۔ تکوینِ کائنات سے رازِ کائنات عیاں ہو رہے ہیں۔ شعور وفہم کو جھنجوڑتی اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور صفاتِ عالیہ کے حوالے سے شعری مثالیں ملاحظہ ہوں:

سقفِ گیتی پہ جلائے جو ستاروں کے چراغ
دستِ آفاق میں دی شمس و قمر کی مشعل
یہ ستارے ہیں کہ سبزے پہ ہیں بکھرے ہوئے پھول
چاند ہالے میں ہے یا چشمۂ رحمت میں کنول (۶۹)

ساحرؔ لکھنوی نے اللہ تعالیٰ کے غفار وقہار ہونے کا ذکر کر کے اس ذات کی طرف رجوع کرنے کی ترغیب دلائی ہے۔ اطاعت وکرم کی صورت میں جنّت کی بشارت اور بغاوت و غیظ کی صورت میں جہنّم کی وعید کو موضوع بنا کر قصیدے کو جاہ وجلال کا مرقّع بنا دیا ہے۔ اس میں ظالموں کے لیے نصیحت اور صالحین کے لیے کرم وبخشش کی نوید وخوش خبری ہے۔ یہی ایک مصلح اور انسان دوست کا اندازِ فکر ونظر ہوا کرتا ہے۔ قصیدہ نگار نے بھولتے ہوؤں کو پھر سے سبق یاد دلایا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔

"اِنَّ بَطۡشَ رَبِّکَ لَشَدِیۡد" (۷۰)

ترجمہ: " بے شک تیرے رب کی گرفت بہت سخت ہے۔"

قصیدے میں نوید و وعید کا شعر دیکھیے:

غیظ میں وہ ہو تو دنیا بھی جہنم ہو جائے
ہو کرم اُس کا تو دوزخ ہو کم از یک منقل (۷۱)

قرآن میں ایک اور مقام پر ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ: ''تم فرمادو کہ حکم مانو اللہ اور رسول کا پھر اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ کو خوش نہیں آتے کافر۔'' (۷۲)

شعلۂ نارِ جحیم اس سے بغاوت کی سزا
ثمرِ باغِ جناں اُس کی اطاعت کا ہے پھل (۷۳)

ساحر لکھنوی نے نہایت حسّاس موضوع کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے اور اسے حمدیہ قصیدے میں زیرِ بحث لا کر توحید کے حوالے سے اس کی حسّاسیّت اُجاگر کی ہے۔ ستاروں (عقرب، قوس، سنبلہ، ثور، حمل) کی چال سے آنے والے حالات و واقعات جاننے کی کوشش کرنا حرام ہے۔ ستاروں کی چال سے قطعی اور یقینی فیصلہ صادر کرنا اور ایمان رکھنا ناجائز عمل ہے۔ کیوں کہ سب اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ تو ہم پرستی کی روّش اہلِ ایمان کی روّش نہیں ہے۔ تقدیر غالب آ کر رہتی ہے کیوں کہ تقدیر منجانب اللہ ہے۔ جب کہ تدبیر انسانوں کی طرف سے اپنائی گئی حکمت عملی ہوتی ہے۔ لہٰذا تقدیر تدبیر پر غالب آ کر رہتی ہے۔ پس اپنے معاملات خالصتاً اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دینے چاہئیں۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ کے کلی تصرف میں ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ: ''اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔'' (۷۴)

پاکستان میں اردو حمدیہ قصائد میں فکری معنویّت کو مرکزی حیثیّت حاصل ہے۔ پاکستانی حمدیہ قصائد نگاروں نے تصوّرِ خدا، قدرتِ خدا اور کائنات کے فلسفیانہ پہلوؤں کو مربوط روایت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ عقرب و قوس ہوں یا سنبلہ و ثور و حمل کو ساحر لکھنوی نے نہایت ہی اچھوتے انداز میں شعر میں سمویا ہے۔ شعری مثال دیکھیے:

اس کی تقدیر کے پابند نجوم اور بروج
عقرب و قوس ہوں یا سنبلہ و ثور و حمل (۷۵)

اشرفِ خلق اور احسنِ تقویم کے لیے افضلیّت ،شرف ،آدمیّت ،انسانیّت ،فطرتِ سلیم اور سلیقہ کی استدعا کی ہے کیوں کہ عروجِ آدمِ خاکی کی انتہا احترامِ آدمیّت میں پنہاں ہے۔انسانیّت سے گرنے والا حیوانیّت کی اندھی غار میں جا گرتا ہے۔ساحر لکھنوی نے بڑی عمدگی سے یہ بات باور کروائی ہے کہ پھول اور کانٹے گلشن میں دست و بغل ہو سکتے ہیں تو انسان کیوں مل جل کر نہیں رہ سکتے؟ ساحرؔ لکھنوی توحید کا سبق یاد دلا کر توحید کے پرستاروں کو مثالی معاشرے کی ترغیب دلا رہے ہیں۔مثالی و اسلامی معاشرے کے ضمن میں قرآنی آیات ملاحظہ ہو۔

ترجمہ: ’’اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی میں سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت پھیلا دیئے اور اللہ سے ڈرو جس کے نام پر مانگتے ہو اور رشتوں کا لحاظ رکھو بے شک اللہ ہر وقت تمھیں دیکھ رہا ہے۔‘‘(۷۶)

انھوں نے اسلامی فلاحی معاشرے کی تشکیلی اقدار اور روایات کو جس فکری خوبی اور علم و حکمت سے اپنے حمدیہ قصیدے کا موضوع بنایا ہے۔ان کے ہاں شعری مثالیں ملاحظہ ہوں:

اِس کی سیرت میں بظاہر تو شرف کوئی نہیں
ہے جو افضل تو یہ ثابت کرے خود کو افضل
کیوں سلیقہ نہیں مل جُل کے اِسے رہنے کا
خار و گل رہتے ہیں گلشن میں سدا دست و بغل (۷۷)

ساحرؔ لکھنوی کا یہ لامیہ قصیدہ ہے جس کی تشبیب فنّی پختگی اور تراشیدگی کے اعتبار سے خوب صورت پیراہن میں جلوہ افروز ہے۔گریز فنّی حوالے سے کمزور ہے مگر مدح میں ساحرؔ لکھنوی نے فنّی چابک دستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کاری گری کے جوہر دکھائے ہیں۔تکوینِ مدح عالی شان نگینوں سے تعمیر کی گئی ہے جس میں علم و عرفان کا گوندھا گیا گارا استعمال ہوا ہے۔مدح کے بعد قصیدے کے آخری رُکن دعا یا حسنِ طلب شاعر کے گہرے جذبوں کی تصویر ہے۔قصیدے کی ہیئتی اور صنفی تشکیل جاندار ہے۔کلام صنائع بدائع کی گل کاریوں کا شاہکار ہے۔

تراکیب کا تنوّع

ساحرؔ لکھنوی کا حمدیہ قصیدہ مختلف تراکیب سے مزیّن ہے۔تراکیب کا استعمال کلام میں جگنو کی ٹمٹماتی روشنی کی طرح جلوہ افروز ہے۔جس سے کشش میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ان کے ہاں اضافتی تراکیب ملاحظہ ہوں:سرِ حمد،نگہِ ظاہر،دلیلِ محکم،رگِ جاں، گلزارِ جہاں،سرِ ارض،سقفِ گیتی،دستِ آفاق،خطِ شعاعی،سامانِ حیات،آبِ رحمت، نارِ جحیم،احسنِ تقویم،اشرفِ خلق،باغِ محبت،ربِ کریم،عبدِ اقل وغیرہ۔

سہ لفظی اضافتی تراکیب کے استعمال سے کلام میں شگفتگی اور تازگی کا تاثر دیکھیے:سر سبزیِ گلزارِ جہاں،ثمرِ باغِ جناں وغیرہ۔

ساحرؔ لکھنوی کے حمدیہ قصیدے میں خوب صورت اور رواں عطفی تراکیب کی عمدہ مثالیں دیکھنے میں آئی ہیں مثلاًشمس وقمر،دشت وجبل محتاج واذل،خار وگل،دست وبغل وغیرہ۔سہ لفظی عطفی تراکیب کا استعمال دیکھیے:سبزہ ونخل وثمر وغیرہ۔

ساحرؔ لکھنوی نے اپنی مہارت ،کاری گری اور فنّی چابک دستی کا مظاہرہ کرنے کے لیے پانچ لفظی عطفی ترکیب کا استعمال بھی خوب صورت انداز میں کیا ہے۔مثال ملاحظہ ہو:بحر و دریاو دَرو گلشن وصحراوجبل وغیرہ۔

ساحرلکھنوی نے اضافت کے ساتھ مرکبِ عطفی کو بڑے دل آویز انداز میں زینتِ کلام بنایا ہے۔جیسے:لائقِ صد شکر وسجود،مرکزِ اُمید واَمل،برسرِ دشت وجبل وغیرہ۔

عربی اثرات

اردو زبان کئی زبانوں کا آمیزہ ہے۔اس میں دخیل الفاظ کا وسیع ذخیرہ موجود ہے مگر اس کے خمیر میں عربی اور فارسی کو بنیادی درجہ حاصل ہے۔زبانوں کا ادغام اگر فنّی مہارت سے کیا جائے تو زبان و بیان کی چاشنی بڑھ جاتی ہے جس سے کلام کا مرتبہ بلند ہو جاتا ہے۔معّرب و مفّرس تراکیب کے استعمال سے زبان کی شُستگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔اردو زبان کے چشمے عربی اور فارسی سے پھُوٹنے کے باعث یہ زبان شیریں مشروب بن چکی ہے۔عربی فصاحت و بلاغت کا سرچشمہ زبان ہونے کے باعث اس کا استعمال کلام میں معنوی رنگ اُجاگر کر دیتا ہیاور اگر آپ

نے قرآن سے موضوع اختراع کیا ہوتو اور بھی مؤثر ہو جاتا ہے۔شعری نظائر ملاحظہ ہوں:

قل ھو اللہ احد لکھ سرِ پیشانیِ حمد
وہ احد جس کا مقابل نہ مماثل نہ بدل
تُو ، نے تو ''احسنِ تقویم'' کی دی اِس کو سند
ہوگیا کیوں یہ سگ وخوک سے بڑھ کرارزل (۷۸)

سیاق الاعداد

سیاق کے لفظی معنی ''حساب،شمار یا گنتی'' وغیرہ کے ہیں۔شعر میں اعداد وشمار کا ذکر کرنا صنعتِ سیاق الاعداد کہلاتا ہے۔ساحرؔ لکھنوی کے ہاں صنعت سیاق الاعداد کے استعمال نے کلام میں زور پیدا کر دیا ہے۔مثال دیکھیے:

شکر اُس کا کہ جو ہے لائقِ صد شکر و سجود
شکر اُس کا کہ جو ہے مرکزِ امید و امل (۷۹)

استفہامیہ لہجہ

ساحرؔ لکھنوی نے استفہامیہ انداز اپنا کر قاری کی توجہ کا حصول یقینی بنا دیا ہے۔کلام میں استفہامیہ لہجہ موزوں اور مؤثر انداز میں ذہن کے نہاں خانوں میں سوالات کو جنم دیتا ہے۔استفہامیہ لہجہ ملاحظہ ہو:

کون ہے، کب سے ہے، کیسے ہے وہ اور کیسا ہے
کوئی کر سکتا نہیں ہے یہ معمّا کبھی حل(۸۰)

کنایہ

کنایہ کے لغوی معنی ''اشارہ اور رمز'' کے ہیں۔سیّد عابد علی عابد اپنی کتاب ''البیان'' میں سجاد مرزا بیگ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''کنایہ لغت میں پوشیدہ بات کرنے کو کہتے ہیں اور اصطلاحِ علم بیان میں ایسے کلمے کو کہتے ہیں جس کے لازمی معنی مراد ہوں اور اگر حقیقی معنی مراد لیے جائیں تو بھی جائز ہو۔''(۸۱)

ساحرؔ لکھنوی کے ہاں کنایہ ملاحظہ ہو:

وہ مکیں وہ کہ رگِ جاں سے بھی نزدیک مقیم
لامکاں وہ ہے کہ جس کا نہ مکاں ہے نہ محل (۸۲)

غیر مردف اشعار

عربی قصائد غیر مردف ہوتے تھے لیکن ایرانیوں نے ردیف کا اہتمام بھی التزام کے ساتھ کیا۔اب اردو حمدیہ قصائد دونوں صورتوں میں ملتے ہیں۔تاہم ساحر لکھنوی نے غیر مردف یعنی لامیہ قصیدہ لکھا۔مطلع کا شعر ملاحظہ کیجیے:

اے قلم حمد کے جادہ میں چل اب سَر کے بل
اِس میں ہر گام ہے اک شکر کے سجدہ کا محل (۸۳)

صنعتِ تکرار

شاعری میں ایک لفظ یا چند الفاظ کو دہرانے کا عمل صنعتِ تکرار کہلاتا ہے۔اس صنعت کے استعمال سے زورِ بیان، شان وشوکت اور خوش سلیقگی کلام کی زینت بنتی ہے۔ساحر لکھنوی کے ہاں صنعتِ تکرار ملاحظہ ہو:

ذرّہ ذرّہ سے وجود اس کا دکھانے کے لیے
وقت کے ہاتھ میں ہے شمس وقمر کی مشعل (۸۴)

اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مبارکہ ازلی وابدی سچائی اور حقیقت ہے۔اُس کی سجائی گئی کائنات کی آرائش وزیبائش، تخلیق، بناوٹ، حُسن، دلآیزی، دل کشی، قرینہ، سلیقہ اور نظم وضبط اپنے خالق کی عظمتوں پر دلالت کرتی ہے۔ہر کس وناکس کی یہ بساط نہیں کہ وہ حمدیہ قصیدہ کہنے کی جسارت کر سکے۔اس کے لیے گہرے مطالعہ اور ژرف نگاہی کی ضرورت ہوتی ہے۔اسے فکر وخیال، لفظی ومعنوی صنائع، اصول وضوابط، تزئین وآرائش سے ہم دوشِ ثریّا بنایا جا سکتا ہے۔اردو حمدیہ قصیدے کی روایت کا حمدیہ قصیدہ نگاروں کے قلوب واذہان پر محرکات، احساسِ جمال، پیکر تراشی اور فکری جاہ وجلال کا نقش منقوش ہے۔ساحرؔ لکھنوی نے لامیہ حمدیہ قصیدہ لکھ کر اپنی خوش بختی کا سامان اور توشۂ آخرت تیار کر لیا ہے۔مروجہ اور غزلیہ ہیئت میں قصیدہ الفاظ کے موزوں استعمال، خیال کی تہ

داری اور مدحِ ربِّ جلیل کا عمدہ نمونہ ہے جس میں توحید،تکوینِ کائنات ،فلسفۂ وحدت الوجود و فلسفۂ وحدت الشہود اور خدا کی صفات کمالیہ کا استدلال وادِراک پایا گیا ہے۔

بدلتی ہوئی زمانی اقدار کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اُردو حمدیہ قصائد کے نئے نئے گوشے اور فکری وفنّی جہات سے آگہی ضروری ہوگئی ہے تا کہ ہمارے نظریات کی تجدید اور ہماری نسلِ نو توحید کے تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل ہوسکے۔ساحؔر لکھنوی نے اس عظیم اور بامقصد ذمہ داری کو بطریق احسن نبھانے کی سعی وکوشش کی ہے۔شعور ولاشعور کی گرہیں کھلنے سے انکشافاتِ ذاتِ الٰہی کی دولت میسر آگئی ہے۔الفاظ کی کلیوں کے تبسم سے حمدیہ قصیدے کا کشتِ زار مہک اُٹھا ہے۔ساحؔر لکھنوی کے حمدیہ قصیدے میں مشعلِ توحید کی کرنیں پھُوٹتی ہیں۔مشعلِ دینِ مبین کی پھل جھڑیاں دل کشی کا سامان ہیں۔زبان محوِگل افشاں اور بول میں امرت ہے۔فکر کوفن کی مہارت سے پیش کرنا بھی ایک آرٹ ہے۔علمِ بیان وبدیع کو کسی قرینے اور سلیقے سے زینتِ کلام بنانا شاعر کا امتحان ہوتا ہے۔جب بندہ اپنے رب کا حمد سرا ہوتو عقیدت کے پھُول مزید مہکنے لگتے ہیں۔صنائع بدائع کی گل کاریوں اور بیان وبدیع کی آرائش وزیبائش نے کلام کو چار چاند لگادیے ہیں۔

غلام علی وفاؔ

غلام علی وفاؔ(متوفی:۱۱فروری ۲۰۲۴) پاکستان کے شعری منظر نامے کے درخشاں ستارے ہیں۔آپ کا تعلق کراچی سے ہے۔آپ قادر الکلام شاعر ہیں۔آپ کے دادا بھی شاعر تھے۔آپ غزل ،موسیقی اور راگ راگنیوں کے دل دادہ ہیں۔آپ روایت اور جدت کے امین ہیں۔گزشتہ کا ادراک رکھتے ہیں اور فردا کے نباض ہیں۔آپ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے منسلک رہے ہیں۔گہرا مشاہدہ،مشاّقی ،مطالعہ اور مضمون آفرینی آپ کا خاصا ہے۔غلام علی وفاؔ کے دوشعری مجموعے''رنگ ہائے وفا''اور''غزل سے لب ہیں ترے''شائع ہوچکے ہیں۔فلمی دنیا اور بیرونِ ملک اردو وراجستھانی گیتوں اور دوہوں کے باعث مقبول ہیں۔موسیقی اور شاعری کے استاد ہیں۔''آؤ سورج اُگائیں،خواب دیکھتے رہنا،یہ گیت میرے''آپ کی خاص پہچان ہیں۔اُن کے مضامین مختلف جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

غلام علی وفاؔ کے ہاں ایک ۵۶ شعروں کا اردو حمدیہ قصیدہ بھی موجود ہے جسے ''قصیدۂ ربِّ العظیم'' کا نام دیا گیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی صفات، دلائلِ توحید، حقیقتِ شرک، توحید کے ضمن میں فلسفہ اسلام اور فنا فی اللہ کو فلسفیانہ اندازِ نظر سے زینتِ کلام بنا کر متلاشیانِ حق کی راہ نمائی کی گئی ہے۔ حمدیہ قصیدے کا مطلع ملاحظہ ہو:

ہزار شکر کے سجدے کروں ہیں کم بے شک
کہاں میں اور کہاں میرا رتبۂ زیرک (۸۵)

غلام علی وفاؔ نے تخیّل اور فکر کی بنیاد بڑے معنی خیز بنیادوں پر اُستوار کی ہے۔ کرب ناک مراحل، جاں گداز کسک، درد گیر نظر، خوں چکیدہ پلک، نہ غمگسار، نہ آشنا ہم دم، چہار سمت غیریّت، دہکتی تنہائی، نہ اطمینان، اندھیرے کی دہشت، صبح وشام گھٹاؤں کی یورشیں، تیرگی، آتشی فضا، سرد غاریں، حیوان اور انسان کے امتیاز کا خاتمہ، بدن کی عریانی، پیرہن سے لاعلمی، حریر و دیبا و کم خواب سے بے خبری، کائنات کی رعنائیوں کا عدم شعور، موسیقی، نغموں، آلاتِ موسیقی اور فنِ موسیقی کی جدتوں سے لاعلم بسر ہوتی زندگی کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے فکری جہات میں اپنی بساط اور حیثیّت و درجے کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ نہ رقصِ شعلہ جبیناں، نہ کارخِ روماں، نہ مغلی کتھک، نہ گلاب و لالہ کی جذب و کسک، عنبر و کافور و صندل اور لعل و جواہر سے نابلد، فیروزہ و زمرد اور نیلم و یاقوت کی بھی بھنک نہیں تھی۔ شعور و فہم اور ادراک کے بغیر انسان کس درجے کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ غلام علی وفاؔ کے ہاں چند شعری نمونے ملاحظہ ہوں:

نہ غم گسار کوئی تھا نہ آشنا ہم دم
چہار سمت اگر تھی تو غیریت کی تپک
معیارِ عنبر و کافور و عود و صندل سے
حریمِ جاں کو مرے تھی نہیں ذرا بھی دَرک (۸۶)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم عطا فرما کر اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز کیا۔ انسان کو فرشتوں پر برتری بھی علم کی بدولت نصیب ہوئی ہے۔ یہ علم کے ثمرات ہی ہیں کہ آج کا انسان ماضی کی نسبت زیادہ بہتر زندگی بسر کر رہا ہے۔ غلام علی وفاؔ بیان کرتے ہیں کہ ایک وہ وقت بھی تھا جب کنارِ آب لہروں کے گیت نہیں سنتا تھا اور نہ ہی ہنوز ذوق و شوق رنگِ بہم

تھا۔ تہی نظر تھا، آ ہورا مزدا بھی نہیں تھا۔ بے علم اور بے ہنر زندگی بھی رنگوں اور خوشبوؤں سے خالی چمن کی مانند ہوا کرتی ہے۔ان کے ہاں انسانی جذبات واحساسات کو بیدار کرتی فکراور سوچ علوِ خیال کی دلیل ہے۔شعری مثال دیکھیے:

نہ ذوق ، رنگ بہم تھا نہ شوق ہائے خطوط
ہنوز غیر تھی تیشے کی کارساز دھمک(۸۷)

انسانی تاریخ کے قدیم آثار اور قدیم شہر بعلبک، ہڑپہ، بابل، روما اور نہ ہی معبدِ ناہید کی لپک روا تھی۔شعور وفہم کی بلندیوں پر پہنچنے سے قبل انسان کا طرزِ معاشرت اور تہذیب و تمدن درج بالا شہروں کی ثقافت کے آثارِ قدیمہ سے جھلکتا ہے۔غلام علی وفاؔ اس وقت کو زینتِ قرطاس بناتے ہیں جب وہ فطرت کا ناتراشیدہ کا وجود تھا۔وہ سامی، دراوڑ اور آریا گوتھک سے لاعلم تھا۔جب کچھ نہ تھا تو وجودِ باری تعالیٰ تھا وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔یہی پیغام غلام علی وفاؔ اپنے کلام اردو حمدیہ قصیدے میں دینا چاہتا ہے۔ان کے ہاں فکری بالیدگی کے نمونے ملاحظہ ہوں:

نہ بعلبک نہ ہڑپہ نہ بابل و روما
ابھی نہ معبدِ ناہید کی روا تھی لپک
میں اک وجود تھا فطرت کا ناتراشیدہ
نہ میں تھا سامی دراوڑ نہ آریا گوتھک(۸۸)

غلام علی وفاؔ بیان کرتے ہیں کہ جب وہ مہر و ماہ کو تکتا تھا اور خدا کا نام ہونٹوں تک نہیں آیا تھا اس وقت وہ تہی دولتِ اظہار تھا۔جب رودِ نیل کا دامن نہیں سجا تھا اور فرات و دجلہ کی لہریں بھی ابھی تک گنجلک تھیں۔نہ وہ رومی، ترکی، بربر، ازبک اور نہ ہی نہ اسے اجداد کے مسکن کا غرور تھا وہ محض تہی دامن ہی تھا۔ایسے میں اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل فرما کر شعور کی دولت سے اشرف المخلوقات بنایا۔اللہ تعالیٰ نے قرآن میں علم اور شعور کے بارے میں ارشاد فرمایا:

ترجمہ: ’’ پڑھو اور تمہارا رب ہی سب سے بڑا کریم جس نے قلم سے لکھنا سکھایا۔آدمی کو سکھایا جو نہ جانتا تھا۔‘‘(۸۹)

غلام علی وفاؔ نے ایک زیرک شاعر کی طرح قصیدے کی زبان و بیان کو چاشنی اور جاہ و جلال عطا کیا ہے۔اُن کے ہاں اس موضوع کی فکری بُنت کے اشعار ملاحظہ ہوں:

علم بلند ہوا تھا نہ میری سطوت کا
تھی محوِ خواب مرے خنجر و دشنہ کی چمک
غرور مسکن و اجداد کا کیا ہوتا کہ
نہ میں تھا رومی و ترکی نہ بربر و ازبک
کرم یہ ربِ جلی کا مگر ہوا مجھ پر
شعور دے کے کیا اشرف الخلق بے شک (۹۰)

غلام علی وفاؔ نے سات اشعار کا آغاز لفظ شعور سے کیا ہے جس سے شعور کی معنویّت اُجاگر ہوتی ہے۔چھے مرتبہ لفظ شعور اشعار کے اندر استعمال کیا ہے۔یوں تیرہ مرتبہ لفظ شعور استعمال ہوا ہے۔تیرہ مرتبہ لفظ شعور دس اشعار میں برتا گیا ہے جس سے غلام علی وفاؔ کے ہاں شعور کی فکری اہمیّت وافادیّت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔بلاشبہ شعور وآگہی خیر وشر کے درمیان میں فرق کرتی ہے۔شعور سے ہی بیداری جنم لیتی ہے۔شعور وفہم علم ہی سے مشتق ہے۔علم ہی کی بدولت انسان فرشتوں سے افضل ہوا ہے۔یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر انعام ہے کہ اس نے انسان کو شعور بخشا۔اس کائنات میں میں فقط علم ہی اللہ تعالیٰ کا بھید پانے کا ذریعہ ہے۔اللہ تعالیٰ کی پہچان کا اگر کوئی اس دنیا میں ذریعہ ہے تو وہ فقط علم ہے۔علم نور ہے اور نور اللہ تعالیٰ کی ذات کی صفت ہے۔لٰہذا صفاتِ باری تعالیٰ کو اپنانے والا ہمیشہ باآبرو، باوقار اور سرخ رُو رہتا ہے۔علم وشعور ہی وہ سرمایہ ہے جس کو مانگنے اور جس کے اضافے کی دعا کا آنحضرت ﷺ مالکِ ارض وسما کی طرف سے حکم دیا گیا ہے۔ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ:''اے میرے باپ بیشک میرے پاس وہ علم آیا جو تجھے نہ آیا
تو تو میرے پیچھے چلا آ میں تجھے سیدھی راہ دکھاؤں۔''(۹۱)

معلوم ہوا علم وشعور اور صاحبِ علم ہی احدیّت و واحدیّت کا فلسفہ سمجھا سکتا ہے۔شعور کے مضمون پر دو اشعار ملاحظہ ہوں:

شعور کی ہی یہ لوح و قلم عنایت ہیں
یہ شعر و نغمہ سرودِ شبانہ لطف و کسک
فقط شعور کے دم سے فضیلتِ انساں
شعور و فہم کے آگے جھکے ہیں جن و ملک (۹۲)

یہ انسان پر لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید، مدح اور ستائش کے نغمے گائے اور اس کا صد شکر بجالائے کیوں کہ وہ اس لائق ہے۔غلام علی وفاؔ کے ہاں اس ضمن میں اشعار دیکھیے:

یہ اس کی خاص نوازش ہے نسل انساں پر
کہ درمیان تھے جتنے گئے ہیں پردے سرک
وفاؔ عزیز اسے بھی ہے تیرا عجز و نیاز
بہ شکلِ اشک نہ یوں دیدۂ بینا سے ٹپک (۹۳)

فن ہی فکر کی آرائش و زیبائش کرتا ہے۔صنائع بدائع کا سنگھار کلام میں چاشنی بھر کر اسے جاذبِ نظر بنا دیتا ہے۔

شکوہِ الفاظ

شکوہِ الفاظ کی وجہ سے قصیدے کو دیگر اصنافِ سخن میں اقلیمِ سخن کا درجہ حاصل ہوا ہے۔شعرائے کرام نے سادہ لفظوں کو برتنے کی بجائے دقیق اور مشکل الفاظ کو بڑی مہارت سے برتا ہے یوں کلام میں شان و شوکت کا عنصر در آیا ہے۔اس حوالے سے ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کی رائے ملاحظہ ہو:

''صوتی آہنگ اور معنوی فضا کے لحاظ سے بعض الفاظ میں ایک خاص قسم کا طمطراق اور طنطنہ جھلکتا ہے جسے اصطلاح میں شکوہِ الفاظ کہتے ہیں۔'' (۹۴)

غلام علی وفاؔ کے ہاں شکوہِ الفاظ کی نظیر ملاحظہ ہو:

نہ چنگ و عود و رباب ، نہ نے نہ طبل و ڈھل
نہ فنِ نغمہ سرائی نہ تان پلٹا گھمک (۹۵)

تلمیح

تلمیح میں کسی تاریخی کردار، قصّے یا واقعے کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو کہ قرآنی یا اسلامی واقعہ ہوسکتا ہے۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی تلمیح کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''زبان کے ابتدائی دور میں چھوٹے چھوٹے سادہ خیالات اور معمولی چیزوں کے بتانے کے لیے الفاظ بنائے گئے تھے۔ رفتہ رفتہ انسان نے ترقی کا قدم آگے بڑھایا۔ لمبے لمبے قصّوں اور واقعات و حالات کی طرف خاص خاص اشارے ہونے لگے۔ جہاں وہ الفاظ زبان پر آئے وہ قصّے، وہ واقعے آنکھوں کے سامنے پھر گئے، ایسا ہر اشارہ تلمیح کہلاتا ہے۔''(۹۶)

غلام علی وفاؔ کے ہاں تلمیح کا عمدہ نمونہ ملاحظہ ہو:

خجل شعور سے فرعون کی شقاوت ہے
زبوں ہے آزری بت خانے کا جلال و دمک(۹۷)

سیاق الاعداد

شعر میں اعداد و شمار کا ذکر کرنا صنعتِ سیاق الاعداد کہلاتا ہے۔ غلام علی وفا نے صنعت سیاق الاعداد کو بھی برتا ہے۔ چہار سمت کے استعمال سے کلام کی معنویّت کو فنّی اعتبار سے دل کشی عطا ہوئی ہے۔ سیاق الاعداد کی عمدہ مثال دیکھیے:

نہ غم گسار کوئی تھا نہ آشنا ہم دم
چہار سمت اگر تھی تو غیریّت کی تپک(۹۸)

تکرارِ لفظی

تکرار اور الفاظ کا دہراؤ کلام میں زور پیدا کرتا ہے۔ صوتی آہنگ میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ تقریر ہو یا شعر تکرارِ لفظی سے بات میں تاکید پیدا ہوجاتی ہے۔ صنعتِ تکرار سے کلام میں خوب صورتی اور حُسن پیدا ہوجاتا ہے۔ غلام علی وفا نے صنعتِ تکرار سے کلام کی دل آویزی کو فزوں تر بنادیا ہے۔ پروفیسر نذیر احمد اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''لفظوں کے تکرار سے کلام میں زور، تاثیر یا حسن پیدا کرنا۔'' (۹۹)

غلام علی وفاؔ کے حمدیہ قصیدے میں تکرارِ لفظی کی نظیر ملاحظہ ہو:

میں چُور چُور لہو میں تھا رست خیزی سے
میں کائنات میں گویا تھا ناتواں بالک (۱۰۰)

تنسیق الصفات

اردو حمدیہ قصائد میں زورِ کلام پیدا کرنے کے لیے صنعتِ تنسیق الصفات کا استعمال بھی دیکھنے میں آیا ہے۔ اس صنعت میں ممدوح کی صفات کا متواتر تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں نجم الغنی رام پوری لکھتے ہیں:

''کسی چیز یا کسی شخص کا ذکر صفاتِ متواترہ کے ساتھ کریں، خواہ وہ صفات مدح کی ہوں یا مذمت کی۔'' (۱۰۱)

وہ صبح و شام گھٹاؤں کی یورشیں توبہ
وہ شورِ باراں! وہ اکلاپا وہ گرج وہ چمک (۱۰۲)

غیر مردف

غلام علی وفاؔ نے بھی عربی قصیدے کی روایت کے پیروی میں غیر مردف حمدیہ قصیدہ لکھ کر پاکستانی اردو حمدیہ قصیدے کی روایت میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ بعض اردو حمدیہ قصیدہ نگاروں نے ایرانیوں کی تتبّع میں قافیے کے ساتھ ردیف کا اضافہ بھی کیا ہے۔ تاہم غلام علی وفا نے دورِ جدید میں بھی غیر مردف حمدیہ قصیدہ ہی لکھا ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

ہزار شکر کے سجدے کروں ہیں کم بے شک
کہاں میں اور کہاں میرا رتبۂ زیرک (۱۰۳)

غلام علی وفاؔ نے ایک الگ ڈکشن کا برتاؤ کرتے ہوئے روایتی اسلوب سے ہٹ کر عمدہ حمدیہ قصیدہ کہا ہے۔ تخلیق کار اردو کے مزاج، آہنگ، تار و پود، طرزِ اظہار، محاوروں اور لب و لہجہ سے پوری طرح آشنا ہے۔ تخلیقی فعالیّت اور حمدیہ قصیدے کے شعور کا انعکاس پذیر ہونا متوازن فکر کا آئینہ دار ہے۔ شادابیٔ فکر نے قصیدے کو ڈکشن کی چھاپ سے شعری نگارشات میں ممتاز درجہ دیا ہے۔ روایتی اُسلوب سے ہٹ کر وسیع المشربی کا ثبوت دیا

ہے۔ ہیئتی اعتبار سے بھی کام یاب تجربہ ہے۔

قاضی حبیب الرحمٰن

قاضی حبیب الرحمٰن (متوفی: ۳۰ مارچ ۲۰۲۲) علمی و ادبی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔آپ کے والدِ گرامی قاضی عبدالرحمٰن صاحبِ دانش و بینش تھے۔ انھیں پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد کا نام تجویز کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔آپ کے والد قاضی عبدالرحمٰن کو علامہ اقبال کے انتخابی جلسوں اور جلوسوں کی امامت کروانے کا شرف بھی حاصل ہے۔اردو ادب میں آپ کے خاندان کی ایک خاص پہچان ہے۔آپ کے والد ’’ہوائے طیبہ‘‘ نعتیہ شعری مجموعے کے خالق ہیں۔قاضی حبیب الرحمٰن نے اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے اردو میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔

ان کا ۵۹ شعروں کا ایک اردو حمدیہ قصیدہ ماہ نامہ ’’بیاض‘‘ میں لاہور سے اکتوبر ۲۰۱۰ء کے شمارے میں چھپا۔ان کا حمدیہ قصیدہ دقیع علم وعرفان کے ہمہ جہت پہلوؤں اور فلسفۂ توحید کی معنویّت سے مملو ہے۔یہ قصیدہ دیگر پاکستانی اردو حمدیہ قصائد کی طرح توحیدِ الٰہی، تصورِ خدا، فلسفۂ اسلام اور اثباتِ اُلوہیّت کا علم بردار ہے جس میں اسلامی نظریاتی موضوعات کا تحفظ ہے۔مستزاد یہ کہ اندازِ نظر بلیغ اور ہمہ جہت انوار و تجلیاتِ حمد سے مستنیر ہے۔مطلع ملاحظہ ہو:

زوروں پر ہے چشمۂ نور
اپنا ظرف، اپنا مقدور (۱۰۴)

فکر کو کلام میں وہی درجہ حاصل ہے جو گلاب کے پھول میں خوش بُو کو حاصل ہے۔قاضی حبیب الرحمٰن کا حمدیہ قصیدہ ایک گلِ تازہ کی مانند ہے جو اپنی فکر کی بھینی بھینی خوش بُو سے معطّر ہے۔ان کی فکر کا محور قرآنِ مجید فرقانِ حمید، فرمانِ رسول ﷺ، آفاقی دلائلِ توحید اور شعائرِ اسلام پر مبنی ہے۔انھوں نے نُدرتِ فکر سے حمدیہ قصیدے کو قرآنِ پاک کی تفسیر سے عبارت بنا دیا ہے۔توحید، فلسفۂ توحید اور انسانیّت کا اس سے تعلق لازم و ملزوم ہیں۔قاضی حبیب الرحمٰن نے کائنات کے مشاہدے سے اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ کائنات میں پھیلے مظاہر فطرت زمین و آسمان، ہوا، فضا، نباتات، جمادات، باغات، اور انواع

و اقسام کی مخلوقات اپنے خالق کی خلّاقی کا اور تخلیق کا طبل بجا رہے ہیں۔ سورج، ہوا، طیّور، دھنک، ندیاں، صحرا، چمن اور رنگ اس احسن الخالقین کے پیدا کردہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی الخالق اور کمال درجے کا پیدا کرنے والا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ: ''تو بڑی برکت والا ہے اللہ سب سے بہتر بنانے والا ہے۔'' (۱۰۵)

اس کائنات کی تصویر کشی اپنے خالقِ باری اور مصوّرِ حقیقی کی بیّن دلیل ہے۔ قرآن انسانوں کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ کی عظمت کا احساس دلاتا ہے۔ قاضی حبیب الرحمٰن کے ہاں اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

میں نے سورج دیکھا ہے
ذرّے ذرّے میں مستور
موجِ ہوا کے رستے کا
اک ذرّہ ہے کوہِ طور
خوش بُو کے جھونکے، دمِ صبح
جیسے چھلکے مے ظہور (۱۰۶)

قاضی حبیب الرحمٰن نے آج کے اس نفسا نسی کے دور کو موضوعِ سخن بنا کر کلام میں شدّتِ احساس پیدا کر دی ہے۔ آج کے اس صارفینی دور میں انسان احساسات سے عاری اور مشین کی طرح چلنے لگا ہے جو انسانیّت کے لیے باعثِ عار اور باعثِ شرمندگی ہے۔ یومِ نشور جیسی بھاگ دوڑ کا شکار انسان زر کا غلام ہو گیا ہے۔ اس کی ترجیحات بدل چکی ہیں۔ وہ اپنے انجام سے بے خبر ہو چکا ہے حالاں کہ وہ بہت سارے لوگوں کا انجام دیکھ چکا ہے۔ چین کے قدیم بادشاہ اور یونان کا عظیم فاتح سکندرِ اعظم بھی وقت کے دھارے میں بہہ گیا ہے۔ قاضی حبیب الرحمٰن کے ہاں اس حوالے سے اشعار دیکھیے:

بھاگ رہا ہے یوں ہر شخص
جیسے سرعتِ یومِ نشور
وقت کے بہتے دھارے میں
کون سکندر، کیا فغفور

دیکھ رہا ہوں آنکھوں سے
اگلے صحیفوں میں مسطور(۱۰۷)

قاضی حبیب الرحمٰن نے انسان کے جاہل ہونے کا موضوع بھی بیان کیا ہے۔ انسان کی فطری کمزوری اور خامی ہے کہ یہ جلد باز اور اپنی حد سے بڑھ کر بار اُٹھانے والا ہے۔ منصب، عہدے، شہرت اور اختیارات ملنے کے شوق میں ذمہ داریوں اور امانت و دیانت سے بے خبر ہو کر کوتاہیوں کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ یوں ناشکری اور ناانصافی کا ارتکاب کرتا ہے۔ یہی منظر نامہ قرآن بیان فرماتا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ: ''بیشک ہم نے امانت پیش فرمائی آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر تو اُنہوں نے اس کے اُٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور آدمی نے اُٹھالی بیشک وہ اپنی جان کو مشقت میں ڈالنے والا بڑا نادان ہے۔''(۱۰۸)

قاضی حبیب الرحمٰن کے ہاں اس موضوع کی شعری مثال ملاحظہ ہو:

مانا ، میں ہی ظلوم و جہول!
مانا ، میں ہی عجول و کفور(۱۰۹)

قاضی حبیب الرحمٰن کے مطابق اللہ الحق ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات برحق ہے۔ انسان کا وہم و گمان، فہم و ادراک، شعور، تصوّر اور عقل اللہ تعالیٰ کی ذاتِ کریم تک نہیں پہنچ سکتے۔ وہ ذات مشابہت و مماثلت سے پاک ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے۔

ترجمہ: ''اور ان کا علم اسے نہیں گھیر سکتا۔''(۱۱۰)

لوگوں کا علم و فضل ذاتِ الٰہی کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

حق ہے بس اک حسنِ ازل
باقی ، کم نظری کا فتور(۱۱۱)

انسان بے بس ہے۔ خواہ بظاہر وہ اقتدار اور اختیارات کا مالک ہو جائے لیکن اس کی بے بسی اور بے کسی اس وقت عیاں ہوتی ہے جب وہ قدرتی اور فطری آفات و بلیات کے سامنے بے بس نظر آتا ہے۔ یوں قاضی حبیب الرحمٰن حمدیہ قصیدے کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی

عظمت بیان کرتے ہوئے انسان کو احساس دلاتے نظر آتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عظمتوں کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہی دانش مندی ہے۔ان کے ہاں شعری مثالیں ملاحظہ ہوں:

لاکھ ہو کوئی خود مختار
اپنی فطرت سے مجبور
حد سے باہر بھی بے حال
حد کے اندر بھی معذور(۱۱۲)

قاضی حبیب الرحمٰن کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی ذات دل کے نزدیک ہے اور آنکھوں سے دُور ہے۔اللہ تعالیٰ پوشیدہ رازوں سے واقف ہے۔وہ اپنے علم سے اپنے بندے کی دل کی رگ سے بھی زیادہ قریب اور خوب جاننے والا ہے۔قرآنی تعلیمات سے مطابقت ان کے حمدیہ قصیدے کا خاصا ہے۔ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ:''اور ہم دل کی رگ سے بھی اس سے زیادہ نزدیک ہیں''(۱۱۳)

قاضی حبیب الرحمٰن کے ہاں قرآنی فکر کا شعری عکس ملاحظہ ہو:

اے میرے دل سے نزدیک
اے میری آنکھوں سے دُور(۱۱۴)

فکروفن کا باہمی انحصار گاڑی کے دو پہیّوں جیسا ہوتا ہے اگر دونوں متوازن ہوں گے تو دل کش محسوس ہوں گے نہیں تو اپاہج۔فکر کو فن کی عمدگی اور صنائع و بدائع کی دل آویز سجاوٹ سے حمدیہ قصیدہ چہرۂ گلگوں کی مانند نکھر گیا ہے۔

شکوہِ الفاظ

شکوہِ الفاظ کا استعمال قصیدے کو دیگر اصنافِ سخن سے ممتاز بناتا ہے۔شاعر سادہ لفظوں کو برتنے کی بجائے دقیق اور ثقیل الفاظ کو مہارت سے کام میں لاتا ہے یوں کلام میں وضع داری کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے۔اس حوالے سے ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کی رائے ملاحظہ ہو:

''صوتی آہنگ اور معنوی فضا کے لحاظ سے بعض الفاظ میں ایک
خاص قسم کا طمطراق اور طنطنہ جھلکتا ہے جسے اصطلاح میں شکوہِ الفاظ

کہتے ہیں۔"(۱۱۵)

قاضی حبیب الرحمٰن کے کلام میں شکوہِ الفاظ کا استعمال ملاحظہ ہو:

شعر آج بھی بیدَ خت پرست
چاہِ بابل کے مسحور(۱۱۶)

ہندی الفاظ

قاضی حبیب الرحمٰن کا لفظی اُسلوب اردو اور فارسی کے علاوہ ہندی الفاظ کی صوتی اور معنوی حسن کی جلوہ گری سے مزیّن ہے۔ ہندی الفاظ کی آمیزش اس عُمدگی سے کی گئی ہے کہ ان کے کلام میں چار چاند لگ گئے ہیں اور ان کے ہندی ہونے کا خیال اور احتمال تک نہیں گزرتا۔ شعری مثال ملاحظہ ہو:

چاروں اور کُروں کا جال
بیچ میں اک دھڑکن محصور(۱۱۷)

عربی اثرات

اردو حمدیہ قصیدے نے عربی زبان وادب سے گہرا اثر قبول کیا ہے۔ قاضی حبیب الرحمٰن نے عربی قصیدہ نگاروں کی طرز پر اردو حمدیہ قصیدہ زینتِ قرطاس بنا کر پاکستانی اردو حمدیہ قصیدے کی روایت میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

مالکِ نفسِ امارہ
جفّ القلم بھی میرا قصور(۱۱۸)

تلمیح

تلمیح میں کسی قصّے یا واقعے کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو کہ قرآنی یا تاریخی واقعہ ہوسکتا ہے۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی تلمیح کے بارے میں لکھتے ہیں:

"زبان کے ابتدائی دور میں چھوٹے چھوٹے سادہ خیالات اور معمولی چیزوں کے بتانے کے لیے الفاظ بنائے گئے تھے۔ رفتہ رفتہ

انسان نے ترقی کا قدم آگے بڑھایا۔ لمبے لمبے قصّوں اور واقعات و حالات کی طرف خاص خاص اشارے ہونے لگے۔ جہاں وہ الفاظ زبان پر آئے وہ قصّے ،وہ واقعے آنکھوں کے سامنے پھر گئے، ایسا ہر اشارہ تلمیح کہلاتا ہے۔‘‘ (۱۱۹)

قاضی حبیب الرحمٰن کے ہاں مثال ملاحظہ ہو:

وقت کے بہتے دھارے میں
کون سکندر ، کیا فغفور؟ (۱۲۰)

سیاق الاعداد

شعر میں اعداد و شمار کا ذکر کرنا صنعتِ سیاق الاعداد کہلاتا ہے۔ قاضی حبیب الرحمٰن کے ہاں صنعت سیاق الاعداد کے استعمال بھی ہوا ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر نذیر احمد لکھتے ہیں:

’’یعنی کلام میں اعداد کا ذکر کرنا خواہ ترتیب سے خواہ بے ترتیب۔‘‘ (۱۲۱)

قاضی حبیب الرحمٰن کے ہاں اس کی شعری مثال دیکھیے:

اک دو سطرِ سحر طراز
ہم رنگِ آہنگِ زَبور (۱۲۲)

تکرارِ لفظی

صنعتِ تکرار سے کلام میں خوب صورتی اور حُسن پیدا ہو جاتا ہے۔ صنعتِ تکرار سے کلام میں زور، خوب صورتی اور خوش گوار تاثیر کا احساس ہوتا ہے۔ قاضی نے صنعتِ تکرار کو عمدگی سے برتا ہے۔ پروفیسر نذیر احمد لکھتے ہیں:

’’لفظوں کے تکرار سے کلام میں زور، تاثیر یا حسن پیدا کرنا۔‘‘ (۱۲۳)

قاضی حبیب الرحمٰن کے ہاں تکرارِ لفظی کی مثال ملاحظہ ہو:

میں نے سورج دیکھا ہے
ذرّے ذرّے میں مستور (۱۲۴)

تنسیق الصفات

اردو حمدیہ قصائد میں زورِ کلام پیدا کرنے کے لیے صنعتِ تنسیق الصفات کا استعمال بھی دیکھنے میں آیا ہے کیوں کہ اس صنعت میں ممدوح کی صفات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔اس ضمن میں نجم الغنی رام پوری لکھتے ہیں:

''کسی چیز یا کسی شخص کا ذکر صفاتِ متواترہ کے ساتھ کریں، خواہ وہ صفات مدح کی ہوں یا مذمت کی۔''(۱۲۵)

مانا، میں ہی ظلوم و جہول!
مانا، میں ہی عجول و کفور(۱۲۶)

صنعتِ طباق یا تضاد

کلام میں ضد اور متضاد الفاظ کا چناؤ سے چیزوں کے درمیان میں فرق واضح ہو جاتا ہے۔ پروفیسر نذیر احمد اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''اس صنعت کو صنعتِ مطابقت بھی کہتے ہیں۔تعریف اس کی یہ ہے۔کہ کلام میں دو ایسے الفاظ لائے جاتے ہیں جن کے معنی آپس میں فی الجملہ ضد یا مقابل ہوتے ہیں۔جیسے آنا جانا۔''(۱۲۷)

اس کی دو اقسام ہیں: ایجابی اور سلبی۔طباقِ ایجابی کی مثالیں قاضی حبیب الرحمٰن کے حمدیہ قصیدے میں پائی گئی ہیں۔مثال ملاحظہ ہوں:

اے میرے دل سے نزدیک
اے میری آنکھوں سے دُور(۱۲۸)

صنعت فوقانیہ یا فوق النقاط

شعر میں صنعتِ فوقانیہ استعمال کرنا شعری ریاضت کا ثبوت ہے۔شاعر اپنی محنت شاقہ سے ایسی فنّی مہارتوں کا مظاہرہ کرتا ہے۔اس ضمن میں پروفیسر نذیر احمد یوں رقم طراز ہیں:

''یہ صنعت بھی لزوم مالا یلزم کی ایک قسم ہے۔کلام میں ایسے الفاظ لانا کہ حروف کے تمام نقاط حروف کے اُوپر آئیں۔''(۱۲۹)

قاضی حبیب الرحمٰن کے ہاں صنعتِ فو قانیہ یا فوق النقاط کی شعری مثال ملاحظہ ہو:

اے دل ، اے سر الاسرار!
اے کہ ورائے حدود و ثغور(۱۳۰)

تجنیس قلب

اس صنعت میں حروف کے ردوبدل سے نئے الفاظ لائے جاتے ہیں۔ پروفیسر نذیر احمد لکھتے ہیں:

''دو الفاظ متجانس کے حروف کی ترتیب میں اختلاف کا ہونا۔جیسے رات اور تار۔مرحوم اور محروم،رام اور مار وغیرہ۔''(۱۳۱)

قاضی حبیب الرحمٰن کے ہاں اس کی شعری مثال ملاحظہ ہو:

موجِ ہوا کے رستے کا
اک اک ذرہ ہے کوہِ طور(۱۳۲)

غیر مردف اشعار

قاضی حبیب الرحمٰن کا شمار اردو ادب کی نمایاں شخصیات میں ہوتا ہے انھوں نے عربی قصیدے کی روایت کے تتبع میں غیر مردف قصیدہ لکھا ہے۔حالانکہ بعض قدیم وجدید اردو قصیدہ نگاروں نے ایرانیوں کی تقلید میں قافیے کے ساتھ ردیف کا اضافہ بھی کیا ہے۔خواہ ایرانیوں کے مطابق ردیف کا اہتمام کلام کی آرائش وزیبائش کوفزوں تر کرتا ہے مگر قاضی حبیب الرحمٰن نے غیر مردف حمدیہ قصیدہ لکھ کر اپنی صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے۔مثال کے طور پر حمدیہ قصیدے کا مطلع ملاحظہ ہو:

زوروں پر ہے چشمۂ نور
اپنا ظرف، اپنا مقدور(۱۳۳)

تجنیسِ زائد و ناقص

صنعت تجنیسِ زائد و ناقص میں ایک لفظ میں دوسرے لفظ کی نسبت ایک حرف زیادہ یا کم ہوتا ہے۔جس سے فن کی صوتی اور معنوی تاثیر بڑھ جاتی ہے۔قاضی حبیب الرحمٰن کے ہاں

صنعتِ تجنیسِ زائدوناقص کا ستعمال بھی ملتا ہے۔ پروفیسر نذیر احمد لکھتے ہیں:

''دومتجانس الفاظ میں سے ایک کا دوسرے سے ایک حرف کم یا زیادہ ہونا۔''(۱۳۴)

قاضی حبیب الرحمٰن کے ہاں صنعتِ تجنیسِ زائدوناقص کا ستعمال کی مثال ملاحظہ ہو:

دل میں اڑتے پھرتے ہیں
ہر سو رنگ برنگ طیور(۱۳۵)

ڈاکٹر ریاض مجید

ڈاکٹر ریاض مجید(بقیدحیات)نعت کے میدان میں پاکستان کا بہت بڑا اور قابلِ قدر نام ہے۔ان کا تعلق فیصل آباد سے ہے۔ڈاکٹر ریاض مجید کے کلام کے بلند پایہ ہونے کی وجہ ان کی شعری ریاضت اور مشاہدے کی گہرائی و گیرائی ہے۔جالندھر (انڈیا) میں پیدا ہوئے۔۱۹۸۰ءمیں ''اردونعت گوئی'' کے عنوان سے پی ایچ ڈی مقالہ لکھ کر پنجاب یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔آپ نہایت زیرک محقق،نقاد،ادیب،شاعراوراستاد ہیں۔ آپ کے نعتیہ مجموعے حی الثنا،(پنجابی نعتیہ ہائیکو کلام)،۱۹۹۱ء،اللھم صلی علیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم(نعتیہ مجموعہ)،۱۹۹۴ء،سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم (اردونعتیہ دیوان)،۲۰۰۳ء،اللھم بارک علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم(نعتیہ مجموعہ)،۲۰۰۵ء،سیدنا رحیم صلی اللہ علیہ وسلم (نعتیہ مجموعہ)، ۲۰۱۳ء،سیدنا کریم صلی اللہ علیہ وسلم (نعتیہ مجموعہ)۲۰۱۸ء،ربنا لک الحمد(حمدیہ دیوان)، ۲۰۱۸ء،سیدنا بشیر صلی اللہ علیہ وسلم (نعتیہ مجموعہ)،۲۰۲۰ء،سیدنا طٰہٰ (نعتیہ مجموعہ،کلیات مجید، ۲۰۲۰ءان کے ذوقِ شعری کی علم بردار ہیں۔ریاض مجید کے حال ہی میں چھپنے کے لیے تیار تازہ نعتیہ مجموعے سیّدنا المنعوت،سیدنا یٰسین،سیدناطٰہٰ،سیدنا بشیراورسیدنا ختم النّبیین ہیں۔ان کے ہاں تخلیق کا عمل اپنی تمام تر توانائیوں سے جاری و ساری ہے۔ایران، ترکی ،بنگلہ دیش، بھارت،روس،یوکے،چائنہ،سعودی عرب،،تھائی لینڈ اورسنگاپور کا سفر کیا۔کئی قومی اور بین الاقوامی ایوارڈ اپنے نام کر چکے ہیں۔گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی فیصل آباد،پشاور میں قرطبہ

یونی ورسٹی،اور رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی فیصل آباد ان سے مستفید ہو چکے ہیں۔نعت اُن کا تعارف ہے۔نعت کے علاوہ ان کے کلام میں تین حمدیہ قصائد بھی پائے گئے ہیں۔ایک طویل قصیدہ گزشتہ صدی کی نویں دہائی میں اُس سفر کی یادگار ہے جو ڈاکٹر ریاض مجید نے جناب حافظ لدھیانوی اور جناب حفیظ تائب کی معیت میں کیا۔ نامکمل صورت میں یہ اشعار اس سفر کے بارے میں لکھے گئے سفر نامے بعنوان معراجِ سفر کی ابتدا میں دیباچے کے طور پر شائع ہو چکے ہیں یہ قصائد فلسفۂ حمد، فلسفۂ توحید، توحید کے فلسفیانہ پہلوؤں ،تصورِ خدا، کائنات کی جہات،فلسفہ وحدت الوجود و وحدت الشہود اور پاکستانی اردو حمدیہ قصائد کے دیگر پہلوؤں کی فکری معنویّت کو اُجاگر کرتے ہیں۔اردو حمدیہ قصائد کے مطالعہ ملاحظہ ہوں:

یا اللہ! الامان، المدد،
اللہ حمدِ احترام ہزار بہ (۱۳۶)
سبحان تری قدرتِ تخلیق نژادہ
امکاں پسِ امکاں ہے جو اسرار نہادہ (۱۳۷)

ڈاکٹر ریاض مجید کی فکر کی جڑیں گہری اور فلک بوس ہیں۔ان کی فکر فلک نشین اور گہرے مشاہدوں کی مالک ہے۔انھوں نے اردو حمدیہ قصائد لکھتے ہوئے اپنی سوچ پر قرآن کا پہرا لگا رکھا ہے۔مدحِ ربِّ جلیل کرتے ہوئے وہ تدبّر و تفکّر سے اسلامی شعار کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اختراعات سے کام لیتے ہیں۔جس سے حمدیہ قصائد حقانیّت کا مرقّع پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ با برکات وحدہٗ لا شریک، مالک الملک،قادر و قدیر،معبودِ برحق،ذاتِ واجب الوجود اور دادخواہی کرنے والی ہے۔وہ ذات ہمہ اوست و ہمہ داں ہے۔قرآن میں ارشادِ ربانی ہے:

ترجمہ: ''وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہر نہاں و عیاں (چھپی وظاہر) کا جاننے والا وہی ہے بڑا مہربان رحمت والا۔''(۱۳۸)

ڈاکٹر ریاض مجید کے ہاں قرآن تعلیمات اور حکمتِ توحید کے مضامین شعری

صورت میں جلوہ گر ہیں۔ انھوں نے صفاتِ الٰہیہ کو شعری قالب میں ڈھال کر قصیدے کو علوِ فکر سے مالا مال کر دیا ہے۔ یوں ان کے قصائد جاہ وجلال کا مرقّع ہیں۔ شعری نظائر ملاحظہ ہوں:

وحدہٗ لا شریک تیری ذات
بالیقیں لا الہ الا للہ (۱۳۹)

رو میں ہیں صفاتِ ازلی غیرِ تعطل
جاری ہے سفر ذات کا بے منزل و جادہ (۱۴۰)

ڈاکٹر ریاض مجید دلائلِ توحید، خلاقیتِ الٰہی، تصرفِ باری تعالیٰ اور مدحِ ربِّ جلیل میں اجرامِ فلکی، شمس وقمر، آغوشِ فلک، رخشندہ کواکب، کہکشاؤں اور ثابت وسیار پر اللہ تعالیٰ کے کُلی اختیار کو بیان کرتے ہیں کہ یہ حکمِ ربی سے مستنیر ہیں۔ یہ خالقِ کائنات کی قدرتوں کی بیّن نشانیاں ہیں۔ اُس ذات نے تاریک شب کو بھی روشنی کے لیے تاروں اور سیّاروں سے منور کر دیا ہے۔ یہ متعیّن دائرے اور مدار و محور اہلِ عقل وبصیرت کے لیے خالق کی نشانیاں ہیں تاکہ اسی کی عظمت تسلیم کرتے ہوئے سر سجدے میں رکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ کلامِ مجید میں ارشاد فرماتے ہیں:

ترجمہ: ''بڑی برکت والا ہے وہ جس نے آسمان میں بُرج بنائے
اور ان میں چراغ رکھا اور چمکتا چاند۔'' (۱۴۱)

ڈاکٹر ریاض مجید نے قرآنی احکامات کو اپنے فکری قالب میں ڈھال کر الفاظ کے خوش نما رنگوں سے سجا کر قصیدے کو رفعت بخش دی ہے۔ انھوں نے حمدیہ قصیدے کو علوِ فکر اور حقیقت کا آئینہ دار پیش کر کے گہری فکر کا عملی نمونہ پیش کیا ہے۔ اس عظیم کائناتِ ہست و بود میں ربِّ محمد ﷺ کی تخلیق کے ان گِنت مظاہر موجود ہیں۔ اجرامِ فلکی، تخلیقِ ارض و سماوات، مظاہر فطرت، تشکیلِ کائنات اور رازہائے سربستہ ہمارے لیے سامانِ تدبّر وتفکّر ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ: ''اور ان میں ایک نہایت چمکتا چراغ رکھا۔'' (۱۴۲)

ڈاکٹر ریاض مجید کے مشاہدے کی شعری مثال ملاحظہ ہو:

معدوم خلاؤں میں، جو پنہاں ہیں نظر سے
جو تیرگی ہے اصل میں ہے روشنی زادہ (۱۴۳)

ڈاکٹر ریاض مجید نے قرآنِ مجید سے موضوع کشید کر کے حکمتِ ربِّ رحمٰن کو بیان کیا ہے۔خلا کی وسعتیں،شعاعیں،اثرات،زمین کا تحفظ اور ماحول کو محفوظ بنایا۔ارشادِ کریم ہے:

ترجمہ:''بیشک ہم نے نیچے کے آسمان تاروں کے سنگار سے
آراستہ کیا۔''(١٤٤)

ڈاکٹر ریاض مجید کے حمدیہ قصیدے میں قرآنی حقائق کو بڑی بصیرت کے ساتھ چمنِ سخن میں سجایا گیا ہے۔نظامِ فلکیات پر شعری مثال دیکھیے:

سیارہ بہ سیارہ، ستارہ بہ ستارہ
ہے کہکشاں در کہکشاں، نیرنگِ کشادہ(١٤٥)

ڈاکٹر ریاض مجید نے قرآنِ مجید سے مختلف روشن وپُر مغز وپُر حکمت اورانسانی احوال وآثار سے جڑے موضوعات کو حمدیہ قصیدے کی زینت بنا کر انسانیّت کو اُس درِ عظیم سے رشتہ اُستوار کرنے کی رغبت دلائی ہے۔کیوں کہ قرآن انسان کو مخاطب کرتا ہے اس لیے اس کے بیان کردہ موضوعات اس کی فلاح ،بھلائی،خیرخواہی اور راست انجام کے صراطِ مستقیم متعیّن کرتے ہیں۔امیّد و رجااور اللہ سے رحمت کی تمنّا کہ وہ برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔قرآن مجیداس حوالے سے ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ:''اللہ کسی جان پر بوجھ نہیں ڈالتا مگراس کی طاقت بھراس کا
فائدہ ہے جواچھا کمایااوراس کا نقصان ہے جو برائی کمائی اے رب
ہمارے ہمیں نہ پکڑ اگر ہم بھولیں یا چوکیں اے رب ہمارے اور ہم
پر بھاری بوجھ نہ رکھ جیسا تو نے ہم سے اگلوں پر رکھا تھا اے رب
ہمارے اور ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کی ہمیں سہار (طاقت) نہ ہو
اور ہمیں معاف فرمادے اور بخش دے اور ہم پر مہر (رحم) کر تو ہمارا
مولیٰ ہے تو کافروں پر ہمیں مدد دے۔''(١٤٦)

ڈاکٹر ریاض مجید کے ہاں اس قرینے اور حکمت سے معمور اشعاران کی گہری سوچ کے عکاس ہیں۔اشعار ملاحظہ ہوں:

رکھتا ہے تو قدرت کے مطابق ہی مکلّف
تکلیف نہیں دیتا تو طاقت سے زیادہ
ہے فصل عجب توبہ و بخشش طلبی کی
بڑھ جاتی ہے ہر اشکِ ندامت سے زیادہ (۱۴۷)

ڈاکٹر ریاض مجید نے حمدیہ قصیدے میں گرتی ہوئی اقدار، روایات، طرزِ معاشرت، سیاست، اخلاقیات، ڈیجیٹل شہری کو لاحق خدشات، میڈیا، انفرادی اور اجتماعی گراوٹ کو بڑے دل دوز انداز میں بیان کیا ہے جوان کی ملیّ اور قومی سوچ کے دھارے کا نوحہ بھی ہے اور شہرِ آشوب بھی۔ امّتِ مسلمہ کا بکھرتا ہوا شیرازہ کسی قیامت خیز منظر سے کم نہیں۔ سیاست دانوں کی کوتاہیاں اور راہنماؤں کا فقدان نا قابلِ تلافی نقصان کا سبب بن رہا ہے۔ آپ نے ایک ذمہ دار اور دردِ دل رکھنے والے ادیب کی طرح حقائق سے پردہ اُٹھا کر سامانِ آگہی فراہم کیا ہے۔ آپ کے ہاں امّت کی بکھری ہوئی مالا کا دُکھ شعری رُوپ دھار چکا ہے۔ اشعار دیکھیے:

ضابطے کیسے تھے اس امّت کے
ہو رہے ہیں جو آج گردِ راہ (۱۴۸)
سربراہانِ ملتّ بیضا
مصلحت کیش و بزدل و دژگاہ
کیا سیاست کی بات کیجیے، ہمہ
شغل بے کار و کارِ اسکراہ (۱۴۹)

دورِ جدید کے بدلتے ہوئے تیور اور حالاتِ حاضرہ پر ڈاکٹر ریاض مجید کی گہری نگاہ ہے۔ انتشار، خرابہ، باہم برسرِ پیکار عوام وسپاہ، دھماکوں کی گونج، تہذیب وتاریخ کا مسخ ہوتا ہوا چہرہ، فضاؤں میں بارود، خاکستر گیاہ وکاہ، زخموں کی نمائش، خوف و ہراس، نفسانفسی، شکوک و شبہات، حزن و ملال، قدرتی وسائل پر اجارہ داروں اور زرداروں کا قبضہ، اشک و بے چارگی، سوشل میڈیا، پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا کی زرد صحافت، دروغ گوئی کا فروغ، قیل و

قال، لاحاصل گفتگو، لا یعنیّت ، جاہل اور حکمت سے عاری ملاّ، تفرقہ بازی، عدم برداشت، تھوڑی قیمت پر بِکنے والے ذاکر، ڈالروں پر بکنے والے زاہد، سستی موت، انسان کی ناقدری، ظالم کو محکمہ عدل کی آشیر باد، رہزنوں سے مصلحت، مکر کی داد و تحسین اور امر و نہی کا فقدان جیسے شدید حالات و واقعات میں فقط اللہ رب العزّت پر یقین ہی سے کائنات کی تیرگی دُور ہو سکتی ہے۔ اسی سے رحمت، انبساط، خیر اور بھلائی کی امیّد رکھی جانی چاہیے۔ ڈاکٹر ریاض مجید کے ہاں اس گہری تشویش کے اشعار ملاحظہ ہوں:

عالم ان پڑھ ، پڑھے لکھے جاہل
کیسے اذہان کر رہے ہیں تباہ(۱۵۰)
جو محافظ تھے دیں کے قاتل ہیں
بنے قزّاق جو تھے دُژ آگاہ(۱۵۱)

ڈاکٹر ریاض مجید نے قومی و بین الاقوامی مسائل بیان کر کے اور انسانی جذبات کو اشتہا دلا کر انھیں نجات دینے والی ذات کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیوں کہ آج کے دور میں سامعین کی تعداد کم یا پھر نہ ہونے کے برابر ہے اس لیے انھوں نے انتہائی فکر انگیز حمدیہ قصائد لکھ کر سنجیدہ قارئین کے لیے علم و فضل کے موتی چُن دیے ہیں تا کہ راہِ راست کا تعیّن کر سکیں۔ راندہ و درماندہ، خستہ حال، غم گرفتہ، شکستہ دل اور بے چین کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے نویدِ صبح اور مژدہ بخشش و عطا ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے امیّد و رجا کے بارے میں ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ: ” اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا اور گناہوں سے درگزر فرماتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو اور دعا قبول فرماتا ہے اُن کی جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور انہیں اپنے فضل سے اور انعام دیتا ہے اور کافروں کے لیے سخت عذاب ہے۔“(۱۵۲)

ڈاکٹر ریاض مجید نے قرآن کی بہت بڑی تعلیم و حکمت کو سپردِ قرطاس کر کے اللہ

تعالیٰ کی پاکی، بزرگی، گناہوں کی معافی ،توبہ اور توبتہ النصوح کے اجرِ عظیم کے موضوع کو قصیدے کی زینت بنایا ہے۔ چند شعری مثالیں ملاحظہ ہوں:

راندہ و ماندہ غم گرفتوں کی
تو ہی آماج گاہ ہے تو ہی پناہ(۱۵۳)

ہوں تجھ سے کرم خواہ اے ستّار ! اے غفّار!
میں عجز سے، منت سے،ساجت سے زیادہ(۱۵۴)

ڈاکٹر ریاض مجید نے دیگر پاکستانی حمدیہ قصیدہ نگاروں کی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کے نور ہونے کے موضوع پر طبع آزمائی بھی کی ہے۔قرآن کے اسی موضوع کو ڈاکٹر ریاض مجید نے معرفتِ الٰہی کے لیے زمین و آسمان کے نور یعنی اللہ تعالیٰ کے نور کو بیان کیا ہے۔خدا کی خدائی کی عظمت فقط مومن ہی اس دنیا میں دیکھ سکتا ہے۔خالق و معبودِ حقیقی ذات ہر شے پر قادر ہے۔وہی اس کائنات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔وہ ذات نور ہے اور اس کے مستوی ہونے کا ہمیں مکمل اِدراک نہیں ہے کیوں کہ اس کی معیت ہم سب کو حاصل ہے۔ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ:''اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا اس کے نور کی مثال ایسی جیسے ایک طاق کہ اس میں چراغ ہے وہ چراغ ایک فانوس میں ہے وہ فانوس گویا ایک ستارہ ہے موتی سا چمکتا روشن ہوتا ہے برکت والے پیڑ زیتون سے جو نہ پورب(مشرق) کا نہ پچھّم (مغرب) کا قریب ہے کہ اس کا تیل بھڑک اُٹھے اگرچہ اُسے آگ نہ چھوئے نور پر نور ہے اللہ اپنے نور کی راہ بتاتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے لوگوں کے لیے اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔''(۱۵۵)

ڈاکٹر ریاض مجید کے مطابق اللہ تعالیٰ کی قدرت ہر لحہ فزوں تر ہو رہی ہے۔شاعر کا شعور و فہم کم اور اللہ تعالیٰ کی شان کے ہمہ اوست امکانات،مدحتیں،عظمتیں ،رفعتیں اور اوصاف زیادہ ہیں۔نورِ الٰہی پر شعر ملاحظہ ہو:

انوار کی یلغار ہے برداشت سے بڑھ کر
جلوے ہیں، مری تابِ بصارت سے زیادہ (۱۵۶)

اللہ تعالیٰ کی ذات رحمت و بخشش کا بہانہ ڈھونڈتی ہے کیوں کہ ''الرحمٰن'' اور ''الرحیم'' جیسی وسیع ترین اور جامع الکلم صفات اللہ تعالیٰ کی صفاتِ عالیہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے رحمت، بخشش، معافی اور مغفرت کی رغبت رکھتا ہے۔ پس اس کی رحمت، فضل، انعام، عطاؤں سے نا امیّد نہ ہوں۔ ہمیں اپنے دامنوں کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پھیلاتے رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں کئی مقامات پر اپنی رحمتوں کا ذکر کیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

ترجمہ: ''اور جب تمہارے حضور وہ حاضر ہوں جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں تو ان سے فرماؤ تم پر سلام تمہارے رب نے اپنے ذمۂ کرم پر رحمت لازم کرلی ہے کہ تم میں جو کوئی نادانی سے کچھ برائی کر بیٹھے پھر اس کے بعد توبہ کرے اور سنور جائے تو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔'' (۱۵۷)

قرآن کے اسی موضوع کو ڈاکٹر ریاض مجید نے معرفتِ الٰہی اور رجوع الی اللہ کے لیے بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت، خالق و معبودِ حقیقی کا فضل ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے۔ وہ ذات بخشش طلب کرنے والوں پر بخشش عنایت کرتی ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید کے ہاں اس موضوع کو شعری رُوپ میں ملاحظہ کیجیے:

امتی ہیں ترے رسول کے ہم
کرم خاص ہم پہ بارِ الٰہ!
چشمِ رحمت، کرم، رحیم! کریم!
المدد! الامان، یااللہ! (۱۵۸)

فکر کو قید کر کے کسی ہیئت، شکل، پیرائے اور قالب میں ڈھال دینا فن کہلاتا ہے جو براہِ راست کسی نہ کسی نظام، اصول، ضابطے، قرینے، ڈھنگ اور اسلوب کا پروردہ ہوتا ہے۔ تاریخ، ادب، تہذیب، تمدن، ثقافت، ماحول، معاشرت، نظریات، افکار اور دینی و ملی بنیادوں پر استوار موضوعات کی پیش کش کا انداز جو کوئی ادیب اپناتا ہے فن کہلاتا ہے۔ یہ ادیب پر منحصر

ہے کہ وہ کون سی ہیئت اپنا کر اپنے کلام کو کس صنفِ ادب کے سپرد کرتا ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ فکر اور فن کا گہرا تعلق ہے۔ یہ دونوں باہم ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ یہ گہرا رشتہ ہی اس کو وجود بخشتا ہے۔ ادب کا داخلی نظام خارجی محرکات سے ہی تشکیل پاتا ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید نے نعت گوئی کے علاوہ پاکستانی اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کی روایت میں تین اردو حمدیہ قصائد لکھ کر اپنے علم و فضل کا لوہا منوایا ہے۔ وہ ایک عہد ساز شخصیت ہیں۔ ان کا اُسلوب، طرزِ نگارش اور طرزِ ادا اچھوتا و پرشکوہ ہے۔ انفرادی رنگ کے مالک ریاض مجید نے حمدیہ قصیدے کی مروجہ خوبیاں بدرجہ اتم اپنے کلام میں سمودی ہیں۔ کلام میں شان وشوکت، علوِ فکر، جاہ وجلال اور ندرتِ خیال سے بلا کی تاثیر اور چاشنی در آئی ہے۔ جس طرح مرثیہ کے اجزائے ترکیبی مثلاً چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، رزم، شہادت اور بین وغیرہ اس کی تاثیر بڑھا دیتے ہیں اسی طرح قصیدے میں تشبیب، گریز، مدح اور دعا اس کو ''اقلیمِ ادب'' کا درجہ دیتے ہیں۔ ڈاکٹر ریاض مجید نے تینوں قصائد میں بھر پور تشابیب لکھی ہیں۔ ان تشابیب کا مطالعہ ہمیں ان کی علمیت کا معترف بنا دیتا ہے۔ قدیم سے جدید دور تک کی تمام فکری و فنی خوبیوں سے مزیّن حمدیہ قصائد پاکستانی اردو حمدیہ قصائد کی روایت میں باوقار مقام کے حامل ہیں۔ گریز میں شاعر کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ کتنی چابکدستی سے مربوط اور مضبوط گریز لکھنے میں کام یاب ہوتا ہے مگر ڈاکٹر ریاض مجید نے استاد اور قادر الکلام شعراء کی طرح اسے نبھایا ہے۔ مدحِ ربِّ جلیل میں انھوں نے اشہبِ قلم خوب دوڑایا ہے۔ مدح میں ان کا اسلوب دیگر پاکستانی حمدیہ قصیدہ نگاروں سے جدا اور ممتاز ہے۔ آخر میں تینوں قصائد میں بڑے دل سوز، دل دوز، صمیمِ قلب اور شدید جذبوں میں ڈوب کر خالقِ ارض وسما سے دعائیں اور مناجات کی ہیں۔ علمِ بیان و بدیع اور صنائع بدائع کی ماہرانہ پیش کش ان کے حمدیہ قصائد کا اثاثہ ہے۔

تراکیب کا استعمال

ڈاکٹر ریاض مجید نے حمدیہ قصیدے میں مختلف تراکیب کو بڑے دل آویز انداز میں برت کر چار چاند لگا دیئے ہیں۔ ان تراکیب کے استعمال سے کلام کی چاشنی فزوں تر ہوگئی ہے۔ ان کے ہاں اضافتی تراکیب ملاحظہ ہوں: امّتِ مسلماں، علامتِ خوف، ربِ کعبہ، نویدِ نجاہ، دشتِ دہشت، چشمِ رحمت، پسِ امکاں، ننگِ ہنر، برسرِ پیکار، وغیرہ۔ سہ لفظی اضافتی تراکیب

بھی ملاحظہ ہوں: سربراہانِ ملتِ بیضا، سپرِ ظلمتِ چاہ ،تاحدِ نظرِ شہرِ خموشاں وغیرہ۔ڈاکٹر ریاض مجید کے ہاں عطفی تراکیب کی نظائر ملاحظہ ہوں: خس وخاشاک، روز وشب، بال و پر، شور وغوغا، مہر و ماہ، وسیلہ و وساطت، توبہ وبخشش، وغیرہ۔سہ لفظی عطفی تراکیب بھی ملاحظہ ہوں: نوحہ ونالہ وفغاں، خاک وکاہ وگیاہ، عزّت وغیرت وحمیت وغیرہ۔

شکوہِ الفاظ

شکوہِ الفاظ قصیدے کو امّ الاصناف کے درجے پر فائز کرتے ہیں۔شاعر سادہ لفظوں کو برتنے کی بجائے دقیق اور ثقیل الفاظ کو اس فنّی تراشیدگی سے برتتے ہیں کہ کلام میں کا عنصر درآتا ہے۔اس حوالے سے ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کی رائے ملاحظہ ہو:

''صوتی آہنگ اور معنوی فضا کے لحاظ سے بعض الفاظ میں ایک خاص قسم کا طمطراق اور طنطنہ جھلکتا ہے جسے اصطلاح میں شکوہِ الفاظ کہتے ہیں۔''(۱۵۹)

ڈاکٹر ریاض مجید کے کلام میں شکوہِ الفاظ کا استعمال ملاحظہ ہو:

نوحہ و نالہ و فغاں آمیز
استغاثہ نما و رحمت خواہ(۱۶۰)

اک نقطے کا پھیلاؤ ہے اک نقطے میں سمٹاؤ
ہو پائے نہ کثرت، کبھی وحدت سے زیادہ(۱۶۱)

عربی اثرات

اردو حمدیہ قصیدے نے عربی زبان وادب سے گہرا اثر قبول کیا ہے۔ڈاکٹر ریاض مجید نے عربی قصیدہ نگاروں کی اتباع میں اردو حمدیہ قصائد لکھ کر پاکستانی اردو حمدیہ قصیدے کی روایت میں فلسفۂ توحید کا مہکتا ہُوا کشتِ زار اور سرسبز و شاداب گلشن آباد کیا ہے۔ربِّ ارحم،سبحان، کن وغیرہ۔مثال ملاحظہ ہو:

المدد، الامان، یااللہ!
بہ ہزار احترام حمدِ الٰہ(۱۶۲)

تلمیح

تلمیح میں کسی قصّے، کہانی یا واقعے کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو کہ قرآنی یا تاریخی واقعہ ہوسکتا ہے۔ تلمیح کے استعمال سے کلام میں جامعیّت اور وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی تلمیح کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''زبان کے ابتدائی دور میں چھوٹے چھوٹے سادہ خیالات اور معمولی چیزوں کے بتانے کے لیے الفاظ بنائے گئے تھے۔ رفتہ رفتہ انسان نے ترقی کا قدم آگے بڑھایا۔ لمبے لمبے قصّوں اور واقعات و حالات کی طرف خاص خاص اشارے ہونے لگے۔ جہاں وہ الفاظ زبان پر آئے وہ قصّے، وہ واقعے آنکھوں کے سامنے پھر گئے، ایسا ہر اشارہ تلمیح کہلاتا ہے''۔ (۱۶۳)

ڈاکٹر ریاض مجید کے ہاں شعری مثال ملاحظہ ہو:

اپنے خورشید ایسے یوسفوں کو
کر رہے ہیں سپرد ظلمتِ چاہ (۱۶۴)

سیاق الاعداد

شعر میں اعداد و شمار کا ذکر کرنا صنعتِ سیاق الاعداد کہلاتا ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید کے ہاں صنعت سیاق الاعداد کے استعمال سے کلام میں زور پیدا ہو گیا ہے۔ پروفیسر نذیر احمد لکھتے ہیں۔

> ''یعنی کلام میں اعداد کا ذکر کرنا خواہ ترتیب سے خواہ بے ترتیب۔'' (۱۶۵)

ڈاکٹر ریاض مجید کے ہاں سیاق الاعداد کی شعری مثال دیکھیے:

کنؔ الف ہزاروں سے مسلسل ہے سرِ کار
اک لفظ ترا حاملِ ہر قصد و ارادہ (۱۶۶)

صنعتِ طباق یا تضاد

ڈاکٹر ریاض مجید نے صنعتِ طباق یا تضاد کو خوب برتا ہے۔جس سے کلام میں فنّی پُر کاری اور دل کشی آگئی ہے۔پروفیسر نذیر احمد اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''اس صنعت کو صنعتِ مطابقت بھی کہتے ہیں۔تعریف اس کی یہ ہے کہ کلام میں دو ایسے الفاظ لائے جاتے ہیں جن کے معنی آپس میں فی الجملہ ضد یا مقابل ہوتے ہیں۔جیسے آنا جانا۔''(۱۶۷)

اس کی دو اقسام ہیں۔ایجابی اور سلبی۔طباقِ ایجابی کی مثالیں ڈاکٹر ریاض مجید کے حمدیہ قصیدے میں موجود ہیں۔مثال ملاحظہ ہو:

خیر کا سر پرست شر ہے ، یہاں
ظلم کو عدل دے رہا ہے پناہ(۱۶۸)

تنسیق الصفات

اردو حمدیہ قصائد میں زورِ کلام پیدا کرنے کے لیے صنعتِ تنسیق الصفات کا استعمال بھی دیکھنے میں آیا ہے۔کیوں کہ اس صنعت میں ممدوح کی صفات کا تذکرہ کیا جاتا ہے جس سے قصیدے کی تاثیر فزوں تر ہو جاتی ہے۔اس حوالے سے نجم الغنی رام پوری لکھتے ہیں:

''کسی چیز یا کسی شخص کا ذکر صفاتِ متواترہ کے ساتھ کریں،خواہ وہ صفات مدح کی ہوں یا مذمت کی۔''(۱۶۹)

قطبین بہ قطبین سے آفاق بہ آفاق
افلاک بہ افلاک کمالات نہادہ
(۱۷۰)

تکرارِ لفظی

صنعتِ تکرار کا عمدہ استعمال کلام خوب صورت اور پُر زور بنا دیتا ہے۔ڈاکٹر ریاض مجید نے صنعتِ تکرار کو بطریق احسن برتا ہے۔کلام میں تاثیر اور خوش سلیقگی در آنا اُن کی ہنر مندی کا غماز ہے۔پروفیسر نذیر احمد لکھتے ہیں:

''لفظوں کے تکرار سے کلام میں زور، تاثیر یا حسن پیدا کرنا۔''(۱۷۱)

ڈاکٹر ریاض مجید کے ہاں تکرارِ لفظی کی نظائر ملاحظہ ہوں:

قریہ قریہ ، نگر نگر ، گھر گھر
بن گئے مقتل و شہادت گاہ(۱۷۲)

ـــــــــ

جو ضابطہ ضامن ہے فلاحِ بشری کا
بہبود ہی بہبود، افادہ ہی افادہ(۱۷۳)

غیر مردف اشعار

ڈاکٹر ریاض مجید نے عربی قصیدے کی روایت کی طرح غیر مردف قصیدہ لکھا ہے۔ حالانکہ بعض قدیم و جدید اردو قصیدہ نگاروں نے ایرانیوں کی تقلید میں قافیے کے ساتھ ردیف کا اضافہ بھی کیا ہے۔خواہ ردیف کا اہتمام کلام کی آرائش و زیبائش میں اضافے کا سبب بنتا ہے مگر ڈاکٹر ریاض مجید نے غیر مردف قصیدہ لکھ کر اپنی مشّاقی اور ریاضت کا ثبوت دیا ہے۔نمونے کے طور پر حمدیہ قصیدے کا مطلع ملاحظہ ہو:

الف الحمدللہ تیری ذات
خالقِ ممکنات و موجودات(۱۷۴)

الختصر فکر و فن ہر دو پہلوؤں سے ڈاکٹر ریاض مجید کے حمدیہ قصائد پاکستانی اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کی روایت میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ اردو ادب میں ان قصائد کا اضافہ حمدیہ قصیدے کے مستقبل کے لیے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ہے۔

ڈاکٹر نوید عاجز

نوید احمد (بقیدِ حیات) ادبی دنیا میں نوید عاجز کے نام سے جانے جاتے ہیں۔آپ کے والد بابا فریدالدین مسعود گنج شکر کے شہر پاک پتن سے تعلق رکھتے ہیں۔ میٹرک کا امتحان ۱۹۹۴ء میں گورنمنٹ ہائی سکول پاک پتن سے پاس کیا۔ایف اے اور بی اے کے امتحانات پرائیویٹ طور پر پاس کیے۔۲۰۰۲ء میں گورنمنٹ کالج ساہیوال سے ایم اے انگلش

پاس کیا۔۲۰۰۴ء میں سکول ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں بطور معلم تعیّناتی ہوئی۔۲۰۰۵ء۔۲۰۰۴ء میں ایم اے اردو بھی پاس کیا۔۲۰۰۹ء سے گورنمنٹ فریدیہ پوسٹ گریجوایٹ کالج پاکپتن میں لیکچرار اردو کی حیثیّت سے فرائضِ منصبی ادا کررہے ہیں۔مئی ۲۰۲۰ء میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوگئے اور اب گورنمنٹ فریدیہ پوسٹ گریجوایٹ کالج پاک پتن میں بطور صدرِ شعبہ اردو خدمات انجام دے رہے ہیں۔آپ نے ۲۰۱۳ء میں ’’سیّد ریاض حسین زَیدی کی نعتیہ شاعری‘‘ کے عنوان سے مقالہ لکھ کر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم فل اردو کیا۔اسی سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے آپ نے ۲۰۱۹ء میں ’’اردو نعتیہ قصیدہ نگاری: تحقیقی وتنقیدی جائزہ‘‘ کے عنوان سے ڈاکٹر شہزاد احمد (متوفی: جنوری ۲۰۲۲ء) کی نگرانی میں مقالہ لکھ کر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی (اردو) کی۔یوں ڈاکٹر نوید عاجزؔ ہوگئے۔نوید عاجزؔ نے اپنی پہلی تذکروں پر مبنی تصنیف ’’شہرِ فرید کے شاعر‘‘ کے نام سے شائع کی۔یہ ۸۱ قدیم وجدید شعرا کی تذکرہ جاتی کتاب ۲۰۱۳ء میں سجاد پبلی کیشنز، لاہور نے چھاپی۔راقم مقالہ (عباس علی شاہ ثاقب) کا تعارف اور دو غزلیات اس میں شامل ہیں۔آپ کی دوسری کتاب ’’سیّد ریاض حسین زَیدی کی نعتیہ شاعری‘‘ مقالہ ایم فل اردو، الاشراق پبلی کیشنز، لاہور نے شائع کی۔تحقیق وتدوین پر مشتمل تیسری کتاب ’’سوچ دا پتن‘‘ الاشراق پبلی کیشنز، لاہور نے ۲۰۱۵ء میں شائع کی۔نوید عاجزؔ کی چوتھی کتاب ’’مجھے تیری ضرورت ہے‘‘ مثال پبلشرز، فیصل آباد نے شائع کی۔جو بیس شعراء کے کلام کا انتخاب ہے۔آپ کی پانچویں کتاب ’’شمیمِ گُل‘‘ ادب قبیلہ پبلشرز پاک پتن نے ۲۰۱۷ء میں شائع کیا۔

آپ کی چھٹی کتاب ’’مکسی کدوں اُڈ یک‘‘ نظمینہ پبلی کیشنز، لاہور نے ۲۰۱۸ء میں شائع کی۔آپ کی ساتویں کتاب اردو شاعری کا پہلا مجموعہ ’’شجرِ زار‘‘ دھنک مطبوعات، لاہور نے ۲۰۲۰ء میں شائع کیا۔’’کلیاتِ شریف ساجد‘‘ اور ’’کلیاتِ اکرام تائب‘‘ کی تدوین میں کلیدی کردار ادا کیا۔’’تازہ غزل‘‘ اور ’’ساہیوال کے نعت گو‘‘ پر کام جاری ہے۔آپ ادبی تنظیم ’’ادب قبیلہ‘‘ کے پہلے جنرل سیکرٹری تھے اور ۲۰۲۲ء میں صدر رہے۔آپ کا شمار ادب قبیلہ کے بانیان میں ہوتا ہے۔آپ کی کاوشوں سے پاکپتن کا ادبی منظر نامہ تشکیل پایا۔آپ کی تحقیق و

تدوین کا کام اتنا معتبر ہے کہ پاکپتن کے ادبی سفر کی پوری داستان بیان کرتا ہے۔آپ سالانہ پرچہ ''اظہار'' اور ''المسعوؔد'' کے ایڈیٹر ہیں۔پاک پتن کی اکیسویں صدی کی شعری روایت کے دوسرے عشرے (۲۰۱۷ء) میں ادبی تنظیم ''اظہارِ نَو'' کی بنیاد رکھی جو فروغِ نعت کے لیے وقف ہے اس کے جولائی ۲۰۲۲ء تک تریسٹھ اجلاس منعقد ہو چکے ہیں۔طرحی مصرعے کے تحت ماہانہ مشاعرے کا انعقاد ان کا نعت کے فروغ کے لیے بڑا کارنامہ ہے۔راقم مقالہ (عباس علی شاہ ثاقب) کو فروغِ نعت کی اس ادبی تنظیم (اظہارِ نَو) کا فنانس سیکرٹری ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

نوید عاجؔز کے ہاں ایک اردو حمدیہ قصیدہ بھی دستیاب ہے جو فکری معنویّت ،توحید، فلسفہِ توحید، فلسفہ وحدت الوجود،فلسفہ وحدت الشہود،فلسفہ واجب الوجود،کائنات کے رموز کے پہلوؤں اور حمدیہ قصائد کے عہد بہ عہد ارتقاء کا احاطہ کرتا ہے۔اس حمدیہ قصیدے کا مطلع ملاحظہ ہو:

چشمۂ شوق پڑا ہے اُبل
حمد نگاری کا ہے عمل(۱۷۵)

ڈاکٹر نوید عاجؔز کے حمدیہ قصیدے کی تشبیب اردو حمدیہ قصیدے کی روایت میں شامل قصیدہ نگاروں کی عہد بہ عہد ترتیب پر مبنی خراجِ تحسین پر مشتمل ہے جس میں ہر ایک قصیدہ نگار کی فکر کو شعری قالب میں ڈھالا گیا ہے جس سے آپ کی فکری پختگی اور تبحرِ علمی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔اردو کے پہلے حمدیہ قصیدہ نگار کی اوّلیّت کو یوں منظوم کیا ہے:

اُس کے قصیدہ نگاروں میں
شاہی دکنی ہے اوّل(۱۷۶)

ڈاکٹر نوید عاجؔز کی تشبیب میں ۳۲،اردو حمدیہ قصیدہ نگاروں کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔

کلاسیکی ادب سے لے کر قیامِ پاکستان تک کے حمدیہ قصیدہ نگار جن کو ڈاکٹر نوید عاجؔز نے تشبیب میں شامل کیا ہے درج ذیل ہیں:(۱) شاہیؔ،(۲) تجلیؔ، (۳)(ولاؔ)، (۴)انشاؔ،(۵) مصحفیؔ،(۶) شہیدیؔ،(۷)خانہ زادؔ،(۸)ممنونؔ،(۹)مومنؔ،(۱۰)ذکیؔ، (۱۱)سالکؔ، (۱۲) صفیرؔ،(۱۳)ہوشؔ،(۱۴)صفدرؔ،(۱۵)سخنؔ، (۱۶)طپشؔ، (۱۷)نرائنؔ،

(۱۸) سادھو، (۱۹) حضور، (۲۰) تمنّا، (۲۱) ابراہیم آزاد وغیرہ لیکن ہم قیامِ پاکستان کے بعد کے حمدیہ قصیدہ نگاروں کو پیش کی گئی ستائش کو زیرِ بحث لائیں گے جن کے نام (۲۲) ظفر صدیقی (۲۳) اختر جونپوری، (۲۴) بے چین رجپوری، (۲۵) اثر زبیری، (۲۶) ساحر لکھنوی، (۲۷) اصغر علی شاہ، (۲۸) قاضی حبیب، (۲۹) غلام علی وفا، (۳۰) عاجز ہیں، جس سے ان کی فکری اُڑان کے گوناں گو گوشے سامنے آتے ہیں۔ آپ نے عمیق نگاہی سے قصیدہ نگاروں کا مطالعہ کیا اور انھیں دادِ تحسین پیش کی۔ تشبیب کے اشعار دیکھیے:

اور ظفر مولانا نے حمد کی روشن کی مشعل
اور بے چین نے شعر کہے، شبنم سے شیتل شیتل
شعر میں اثر زبیری کے حمد کی دکھتی ہے چڑھتل
عشقِ خدا میں ساحر بھی چل کے آیا سر کے بل
حمد ہے اصغر کی بھی خوب، سن کے دل جاتا ہے پگھل
قاضی حبیب کا طرزِ بیاں، خوب رواں ہے اور اسہل
دیکھ وفا کے شعروں میں جذبہ شوق کہ یہ چھل بل
چشمِ شعر عاجز بھی حمد خمار سے ہے اشہل (۱۷۷)

ڈاکٹر نوید عاجز نے حمدیہ قصیدے میں ایک نہایت عمدہ غزل بھی شامل کی ہے جس میں جذبوں کی شدّت فزوں تر اور پُر مسرت ہے۔ غزل کا شعر ملاحظہ ہو:

تیرا حسن فزوں پل پل
جو دیکھے وہ جائے مچل (۱۷۸)

ڈاکٹر نوید عاجز نے اردو حمدیہ قصیدے کی روایت کی تشبیب لکھ کر اردو حمدیہ قصیدے کی روایت کو محفوظ کر دیا ہے جو اردو حمدیہ قصیدے کی روایت میں اچھوتا اور قابلِ قدر اضافہ ہے۔ تشبیب کا ہر شعر اپنی نوعیّت کے اعتبار سے ایک حوالہ ہے۔

مدحِ ربِّ جلیل کے لیے ڈاکٹر نوید عاجز نے قرآن میں موجود اسماء الحسنیٰ واپنی فکر کی زینت بنا کر حمدیہ قصیدے میں پیش کیا ہے۔ یہ قصیدہ قرآن میں مذکور اسمائے الٰہیہ حمد کے اُفق پر

کہکشاں و شفق کی طرح چمکتا اور رنگ بکھیرتا دکھائی دیتا ہے۔ یوں قرآن پر مبنی فکر نے آپ کے حمدیہ قصیدے کو گنجینۂ معنی کا گلدستہ بنا دیا ہے۔ ''اللہ'' اسمِ علم ہے اس کا ترجمہ کرنا ناممکن ہے تاہم رحمٰن و رحیم صفات کا ترجمہ تو کیا جاتا ہے مگر احاطہ کرنا انسانی بساط سے بالاتر ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ: ''سب خوبیاں اللہ کو جو مالک سارے جہان والوں کا بہت
مہربان رحمت والا۔'' (۱۷۹)

قصیدے کی فصاحت و بلاغت اور پُرشکوہ زبان اس کے موضوع کی بُنت میں پنہاں ہے۔ ڈاکٹر نوید عاجزؔ کے ہاں مؤثر، دل آویز، جذبہ محبّت و اشتیاق اور جذبہ ایمانی سے سرشار اسمائے الحسنٰی کا استعمال ملاحظہ ہو:

وہ رحمان، رحیم، غفور
رحم کی وہ بے پایاں چھل (۱۸۰)

اس وسیع و عریض کائنات کا ادراک آج بھی ایک معما ہے لیکن خالقِ ارض و سما کے تصرف میں سب کچھ ہے۔ اس کے اختیار، اقتدار، شہنشاہیّت اور دائرۂ اختیار میں سب کچھ ہے۔ صحرا ہو کہ جنگل، خشکی ہو کہ تری، پورب ہو کہ پچھّم، قطب ہو کہ دکھن، عالمِ چار سُو اور شش جہات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت غالب ہے۔ حکمتِ الٰہی خدائے بزرگ و برتر کی صفات میں شمار ہوتی ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کی حکمت اور کائنات کے نظم و ضبط کا یوں ذکر ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ: '' جس نے سات آسمان بنائے ایک کے اوپر دوسرا تو رحمٰن
کے بنانے میں کیا فرق دیکھتا ہے تو نگاہ اٹھا کر دیکھ تجھے کوئی
رخنہ (خرابی و عیب) نظر آتا ہے پھر دوبارہ نگاہ اٹھا نظر تیری طرف
ناکام پلٹ آئے گی تھکی ماندی'' (۱۸۱)

خالق کی حکمت، حسنِ ترتیب اور اندازِ تخلیق کو ڈاکٹر نوید عاجزؔ نے بڑی موضوعاتی تراشیدگی سے قصیدے کی زینت بنایا ہے۔ مثال دیکھیے:

کیا تیری صنعت ہو بیاں
تُو حکمت میں ہے اکمل (۱۸۲)

ڈاکٹر نوید عاجزؔ نے عقل کی جرح و تعدیل کے عمل سے گزر کر خالقِ کائنات کی ذاتِ واحد کو واجب الوجود جانتے ہوئے وجدانِ سلیم سے گلدستۂ حمد و ثنا پیش کیا ہے۔ کسی کا محتاج نہ ہونے کے باعث اللہ تعالیٰ کی ذات واجب الوجود ہے جب کہ باقی تمام ممکن الوجود کو وجود میں آنے کے لیے خالق (پہلے سے موجود) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ زمین و آسمان کا نور ہونے کے باعث ماہیت و مقدار سے پاک ہے۔ بلا شرکت غیرے نظامِ کائنات چلا رہا ہے۔ وہ قائم بالذات ہے جسے کسی کی محتاجی نہیں۔ نوید عاجزؔ کے ہاں وجودِ واجب کی مثال ملاحظہ ہو:

تیرے وجودِ واجب سے
شرک شجر ہے مستاصل (۱۸۳)

اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام اللہ ہے۔ مگر اس پاک ذات کو اس کے صفاتی ناموں سے پکارا جا سکتا ہے کیوں کہ اس کے اچّھے اچّھے نام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں قلبِ مطمئنہ کا سامان موجود ہے۔ اسے جس نام سے بھی پکاریں وہ اپنی شان کے لائق پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہے۔ ڈاکٹر نوید عاجزؔ نے بھی قرآنِ مجید سے حمدیہ قصیدے کے لیے بعض موضوعات کشید کیے ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کے ناموں کے بارے میں ارشاد ہے:

ترجمہ: ''اور اللہ ہی کے ہیں بہت اچھے نام۔'' (۱۸۴)

ڈاکٹر نوید عاجزؔ کے ہاں ان ناموں کو حسین قرار دیا گیا ہے جنھیں یاد کرنے والا جنّت میں داخل ہو سکتا ہے۔ اسماء الحسنٰی وصفات اور سرمدی رُوپ کا تصوّر عقیدۂ توحید کا لازمی حصّہ ہے۔ شعر دیکھیے:

اُس کے سارے نام حسیں
اُس کا ہر اک رُوپ سجل (۱۸۵)

اللہ عزّ وجل نے اس کائنات کی تخلیق میں بڑی سلیقگی، قرینہ، رنگ ڈھنگ، حسنِ ترتیب، اصول، ضابطے اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی کشش رکھی ہے۔ عاجزؔ نے زورِ تخیّل سے حسین و جمیل کائنات، چمکتے ہوئے آفتاب و مہتاب، ٹمٹماتے تاروں، اجرامِ فلکی اور کہکشاؤں کی پھلجھڑیوں کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ سماویہ طبق کو دیکھ کر انھیں کلام کی زینت بنایا ہے۔ ارشادِ ربِّ جلیل ہے:

ترجمہ: ’’ تو انھیں پورے سات آسمان کر دیا دو دن میں اور ہر آسمان میں اسی کے کام کے احکام بھیجے اور ہم نے نیچے کے آسمان کو چراغوں سے آراستہ کیا اور نگہبانی کے لیے یہ اس عزت والے علم والے کا ٹھہرایا ہوا ہے۔‘‘ (۱۸۶)

ایک دوسرے مقام پر بھی قرآن اسی مضمون کو یوں بیان کرتا ہے:

ترجمہ: ’’ اس کی پاکی بولتے ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور جو کوئی ان میں ہیں اور کوئی چیز نہیں جو اسے سراہتی (تعریف کرتی) ہوئی اس کی پاکی نہ بولے تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے بیشک وہ حلم والا بخشنے والا ہے۔‘‘ (۱۸۷)

ڈاکٹر نوید عاجزؔ کے ہاں قرآن سے کشید کردہ علوِ فکر کا شعری نمونہ ملاحظہ ہو:

سات فلک ، اوپر نیچے
رخنہ ہے نہ کوئی خلل (۱۸۸)

ڈاکٹر نوید عاجزؔ نے حمدیہ قصیدے میں توحید کے حوالے سے نہایت حسّاس موضوع اُجاگر کیا ہے۔ توہم پرستی، فال، نجومی اور ستاروں کی چال سے آنے والے حالات کو جاننا حرام ہے۔ اُن کی چال دیکھ کر قطعی اور حتمی فیصلے صادر کرنا اور ایمان رکھنا نہایت قبیح فعل ہے۔ یہ شریعتِ اسلامی کا شعار اور وطیرہ نہیں۔ منگلیک، ساڑھ ستی اور زحل پر یقین ہندووانہ روّش ہے۔ اِرتدادِ توہم ہر مسلمان پر لازم آتا ہے۔ فاسد العقیدگی ایمان کے لیے زہر قاتل ہے۔ پاکستانی حمدیہ قصیدہ نگاروں کی فکر کا منبع توحید، فکرِ توحید اور ترویجِ توحید ہے۔ ان کے ہاں ارتدادِ رسوم و توہم کا شعری نمونہ ملاحظہ ہو:

کیا منگلیک ترے آگے
ساڑھ ستی کیا ، کون زحل (۱۸۹)

مدحِ ربِّ جلیل کے لیے قرآنِ مجید سے بڑھ کر کوئی حوالہ نہیں ہے۔ اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کا ایک اہم موضوع قرآنی اصطلاحات اور تلمیحات کا استعمال ہے۔ یوں ذاتِ باری تعالیٰ کی شانِ اُلوہیّت اور مقامِ ربوبیّت کو موضوعِ سخن بنا کر اس کی یکتائی، واحدانیّت، قدرت و حکومت

،ستّاری اور خلّاقی جیسی صفات کو نوید عاجزؔ نے اپنے قصیدے میں سجایا ہے۔ ارشاداتِ ربّانی ہیں:

"اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ "(۱۹۰)

ترجمہ: "اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔"

"اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی"(۱۹۱)

ترجمہ: "وہ بڑی مہر (رحمت) والا اس نے عرش پر استواء فرمایا جیسا اس کی شان کے لائق ہے۔"

ڈاکٹر نوید عاجزؔ کے ہاں قرآنی اصطلاحات کا استعمال ملاحظہ ہو:

وہ خالق ہر چیز کا ہے
اُس کا عرش ہے اُس کا تل (۱۹۲)

اللہ تعالیٰ کی عظمتوں کو قرآن کی رُو سے بیان کرنے کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے:

"وَ نَحنُ اَقرَبُ اِلَیہِ مِن حَبلِ الوَرِیدِ"(۱۹۳)

ترجمہ: " اور ہم دل کی رگ سے بھی اس سے زیادہ نزدیک ہیں۔"

قرآن سے موضوع کشید کر کے حمدیہ اشعار کہنا بڑی سعادت مندی اور علم و عرفان کی دلیل ہے۔ شعری نمونہ ملاحظہ ہو:

اے کہ شہ رگ سے نزدیک
اے کہ آنکھوں سے اوجھل (۱۹۴)

ڈاکٹر نوید عاجزؔ نے ھوّ اسِ خمسہ کو موضوع بنا کر خالقِ کائنات کی تخلیقی شان کو منکشف کیا ہے۔ عالمِ امثال سے عالمِ موجودات تک کے سفر کے دوران میں ھوّ اسِ خمسہ متوازن اور متحرک زندگی کا استعارہ ہیں۔ پانچوں ھوّ اس پر پانچ اشعار قلم کے سپرد کر کے علوِ فکر کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔ نمونے کے طور پر ایک شعر ملاحظہ ہو:

آنکھوں کو منظر بخشے
منظر بھی اجول اجول (۱۹۵)

ڈاکٹر نوید عاجزؔ نے مدحِ ربِّ جلیل کے لیے انبیاءِ کرام کو عطا کیے گئے معجزات کو سخن کے قالب میں ڈھال کر ممدوح کی شان ورا الوریٰ کو فکری معنویّت کا جامہ پہنا دیا ہے۔ یدِ بیضا حضرت موسیٰؑ، پانی حضرت طالوتؑ، بوٹی حضرت عیسیٰؑ، آگ حضرت ابراہیمؑ اور مچھلی حضرت یونسؑ، چھری اور حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ کے بیان سے علم و عرفان، راز و نیاز، اسرارِ نبوت اور اصولِ شریعہ کا تذکرہ کر کے انسانیّت کو اللہ تعالیٰ کے فضل اور انعامات سے آشنا کیا ہے۔ نمونے کے طور پر ایک شعر دیکھیے:

تیرا نور یدِ بیضا
ورنہ کیا موسیٰ کی بغل (۱۹۶)

ڈاکٹر نوید عاجزؔ نے فکر پر فن کی عمدہ گل کاری کر کے اسے جاذبِ نظر بنا دیا ہے جس سے قصیدے کا جاہ و جلال اور شان و شوکت رفعتوں سے ہم کنار ہو گیا ہے۔ اُن کے قصیدے میں سوچ کی گہری چھاپ کا رنگ نمایاں ہے۔ یہ غیر مردف یعنی لامیہ قصیدہ ہے۔ اس میں ۳۲ شعروں کی بھرپور اور اپنی نوعیّت کی عمدہ تشبیب ہے جو اردو حمدیہ قصیدے کی روایت کی عکاس اور امین ہے۔ ڈاکٹر نوید عاجز بڑی استادانہ مہارت سے تشبیب سے گریز کی طرف مڑے ہیں جو باہمی ارتباط و انسلاک کا عمدہ نمونہ ہے۔ گریز ۳ شعروں پر مشتمل ہے۔ گریز کے بعد بڑی فنی چابک دستی سے انھوں نے مدحِ ربِّ جلیل کا چمنِ زار سجایا ہے۔ مدح میں توحید اور علم و عرفان کے موتیوں نے قصیدے کو لعلِ بدخشاں بنا دیا ہے۔ آخر میں حسنِ طلب اور دعا کا اہتمام بڑے صمیمِ قلب سے کیا گیا ہے جو نوید عاجزؔ کے جذبوں کی شدّت کی آئینہ دار ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے قصیدہ بہت عمدہ ہے یوں تمام ارکانِ قصیدہ صنائع بدائع سے بھرپور اور صنفی شناخت کے ساتھ موجود ہیں۔

تراکیب کا استعمال

ڈاکٹر نوید عاجزؔ نے حمدیہ قصیدے کو مختلف تراکیب کے عمدہ استعمال سے دل آویز بنا دیا ہے۔ تراکیب کا بھرپور استعمال قصیدے میں کہکشاں کی مانند قلب و نظر کو بھاتا ہے۔ ان کے ہاں اضافتی تراکیب ملاحظہ ہوں: گلشنِ حمد، طرزِ کلام، وجودِ واجب، راہِ عدم، وغیرہ۔ سہ لفظی اضافتی ترکیب بھی ملاحظہ ہو:

عاشقِ حسنِ ازل وغیرہ ڈاکٹر نوید عاجز کے ہاں رواں عطفی تراکیب کی نظائر ملاحظہ ہوں: لات وہبل، صدق وصفا وغیرہ۔

سیاق الاعداد

سیاق کے لفظی معنی ''حساب، شمار یا گنتی'' وغیرہ کے ہیں۔ شعر میں اعداد و شمار کا ذکر کرنا صنعتِ سیاق الاعداد کہلاتا ہے۔ نوید عاجز نے صنعتِ سیاق الاعداد کو برت کر کلام میں زور پیدا کر دیا ہے۔ مثال دیکھیے:

سات فلک ، اوپر نیچے
رخنہ ہے نہ کوئی خلل (۱۹۷)

تشبیہ

کسی ایک چیز کو دوسری چیز کی مانند قرار دینا تشبیہ کہلاتا ہے۔ جس سے صوتی اور معنوی پہلو نکھر جاتا ہے۔ کلام کی زیبائش فزوں تر ہو جاتی ہے۔ بعض صُورتوں میں تشبیہ کے استعمال سے ابلاغ آسان ہو جاتا ہے۔ مولانا مولوی محمد رفیع لکھتے ہیں:

''دو چیزوں کے ایک معنی میں شریک ہونے کا نام تشبیہ ہے۔'' (۱۹۸)

نوید عاجز کے ہاں عمدہ شعری مثال ملاحظہ ہو:

آسودہ احباب رہیں
راہِ عدم میں مثل کنول (۱۹۹)

صنعتِ تکرار

شاعری میں ایک لفظ یا چند الفاظ کو دوہرانے کا عمل صنعتِ تکرار کہلاتا ہے۔ صنعتِ تکرار کا عمدہ استعمال کلام کو خوب صورت اور پُرزور بنا دیتا ہے۔ نوید عاجز نے صنعتِ تکرار کو بطریق احسن برتا ہے۔ کلام میں تاثیر، زورِ بیان اور خوش سلیقگی در آنا اُن کی کمال ہنر مندی کا غماز ہے۔ پروفیسر نذیر احمد اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''لفظوں کے تکرار سے کلام میں زور، تاثیر یا حسن پیدا کرنا۔'' (۲۰۰)

تیرا حُسن فزوں پل پل
جو دیکھے وہ جائے مچل(۲۰۱)

تلمیح

تلمیح کسی قصّے ،داستان یا واقعے کی طرف اشارہ کرنا جس میں قرآنی یا کوئی تاریخی واقعہ ہو۔
ڈاکٹر نوید عاؔجز نے اس قصیدے میں تلمیحات کا بھی استعمال کیا ہے۔نمونے کے طور پر ایک شعر ملاحظہ ہو:

پانی ، بوٹی ، آگ ، چُھری
سب کو تیرا حُکم اٹل(۲۰۲)

صنعتِ تضاد

ایک دوسرے کے برعکس اسے طباق بھی کہا جاتا ہے۔مولوی نجم الغنی رام پوری لکھتے ہیں:

''ایسے الفاظ استعمال میں لائیں جن کے معانی آپس میں ایک دوسرے کے فی الجملہ ضد اور مقابل ہوں''۔(۲۰۳)

ڈاکٹر نوید عاؔجز نے صنعتِ تضاد کو بکثرت اور بطریق احسن برتا ہے۔مثال ملاحظہ ہو:

دوزخ جنّت کا نقشہ
کڑوی چھال اور میٹھا پھل(۲۰۴)

ڈاکٹر نوید عاؔجز اردو حمدیہ قصیدہ نگار بھی ہیں اور اردو حمدیہ قصیدے کی روایت کے امین بھی۔یوں اردو حمدیہ قصیدہ ہر دو پہلوؤں سے محفوظ بھی رہے گا اور تاریخ کے اوراق پر جلوہ افروز بھی رہے گا۔انھوں نے حمدیہ قصیدے کو پھر سے نئی زندگی عطا کردی ہے۔یہ اُن کا اردو حمدیہ قصیدہ نگاری پر بہت بڑا احسان ہے۔

ابوالحسن واؔحد رضوی

صاحب زادہ ابوالحسن واؔحد رضوی (بقیدِ حیات) ساداتِ علویہ کے چشم و چراغ ہیں۔آپ نے ابتدائی دینی تعلیم آستانہ عالیہ فیض آباد شریف،اٹک سے حاصل کی۔حفظ و تجوید

درسِ نظامی، دورۂ حدیث، تفسیر اور علوم متداولہ حاصل کر کے علم و عرفان کی منازل طے کیں۔ آپ نے حفظِ قرآن کے علاوہ درسِ نظامی، فتویٰ نویسی اور متعلقہ نصابات بھی سیکھے۔ آپ چند سال جامعہ ریاض الاسلام اٹک میں درس و تدریس سر انجام دیتے رہے۔ بعد ازاں انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد سے عربی سیکھی۔ آپ عربی، فارسی، اردو، پنجابی اور دیگر زبانیں جانتے ہیں۔

آپ کا کلام ۳۰۰ سے زائد کتابوں اور رسالوں کی زینت بن چکا ہے۔ آپ شاعر، مصنف، ادیب، مترجم، ناقد، محقق، استاذ، معلم، قاری، خطیب، قصیدہ نگار، نعت گو، نعت خواں اور مذہبی اسکالر ہیں۔ آپ کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) شمیمِ شوق (مجموعۂ نعت) (۲) ذوقِ ثنا (مجموعۂ نعت) (۳) ترجمان الاذواق (عربی فارسی غزلیات) (۴) نسیمِ ذوق (مجموعۂ غزل) (۵) مثنوی معراج نامہ (۶) جمال عقیدت (قصیدہ در مدح مولا علیؑ) (۷) متاعِ بے بہا (مجموعۂ نعت) (۸) ریاض مدحت (۹) فیض مدحت (۱۰) ریاض عقیدت (مجموعۂ مناقب) (۱۱) جمالِ سخن (۱۲) ریاض سخن (۱۳) مثنوی بہار کائنات (۱۴) مثنوی شہ گلگلوں قبا (۱۵) مثنوی نشق الاظہار (۱۶) مثنوی فتق الاظہار (۱۷) مثنوی ناظم ولایت (۱۸) چراغ عقیدت (۱۹) جام عرفان (رباعیات) (۲۰) جمال ثنا (۲۱) حدائق تضمین (تضمین سلام رضا) (۲۲) فیض ثنا (تضمین قصیدہ درودیہ) (۲۳) توصیف جمیل (۲۴) ریاض انس (۲۵) مثنوی سراپائے جمال (۲۶) اعزاز توصیف (تضمینات بر کلام اعلیٰ حضرت) وغیرہ۔

آپ نے ''ریاض الاسلام''، ''نعتیہ ادب''، ''سلسبیل'' اور ''عرفان رضا'' جیسے رسائل جاری کیے۔ آپ نے تمام قدیم و جدید اصنافِ سخن میں لکھ کر اپنا لوہا منوایا ہے۔ آپ کا شمار استاد شعراء میں ہوتا ہے۔ عربی، فارسی، اردو، پنجابی، سرائیکی، ہندی اور پوربی ہندکو میں کلام لکھ کر شاعرِ ہفت زبان کے مرتبے پر فائز ہوئے ہیں۔ آپ کی ہمہ جہت شخصیّت کے ہمہ جہت پہلو ہیں۔ آپ کے ہاں ایک ۴۰ شعروں کا اردو حمدیہ قصیدہ بھی ملتا ہے۔ جو قصیدے کی کلاسیکی روایت اور ہیئت کے چاروں ارکان پر مشتمل ہے۔ فکری رنگا رنگی اور فلسفیانہ پہلوؤں

سے بھی مزیّن ہے۔حمد یہ قصیدے کا مطلع ملاحظہ ہو:

قعر حیرت میں مقید ہوں زِ قہر اَیام
کچھ سجھائی نہیں دیتا کہ بہر سو ہے ظلام (۲۰۵)

ابوالحسن واحدؔ رضوی نے مدحِ ربِّ جلیل کے لیے حمد یہ قصیدے میں قرآن کے پیغام کو زینت بنایا ہے۔اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات حمد سرائی کی مستحق ہے۔یہ کائنات اور موجوداتِ کائنات اس کی حمد و تسبیح کرتی ہے۔اسی کی ذاتِ اقدس اوّل و آخر مدح وستائش کی حق دار ہے۔کائنات میں پھیلے زمان و مکان کے سلسلے اسی کے ہیں۔لیل ونہار اُسی کی تسبیح کرتے ہیں جو آسمان وزمین اور تمام جہانوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ارشادِ ربّانی ہے۔

ترجمہ:'' وہ جو ایمان لائے اوران کے دل اللہ کی یاد سے چین پاتے ہیں سن لواللہ کی یاد ہی میں دلوں کا چین ہے۔''(۲۰۶)

ابوالحسن واحدؔرضوی کے ہاں حمد سرائی کی خوب صورت اور دل آویز مثالیں ملاحظہ ہوں:

حمد اس کی ہے دیا حمد کا یارا جس نے
جس نے بخشے ہیں سخن ور کو یہ اندازِ کلام
حمد اس کی ہے دیا نطقِ لسانی جس نے
گنگ حرفوں پہ کیا جس نے صدا کا انعام (۲۰۷)

ابوالحسن واحدؔ رضوی اپنی قوّتِ تخّیل ،شعر،مشاہدے اورفہم واِدراک کی بجائے قرآنِ مجیدفرقانِ حمید کوحمد یہ قصیدہ نگاری کا ماٰخذ ومنبع قرار دیتے ہیں۔آپ اپنے اشعار کوقرآنی حوالوں پر اُستوار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔اس کائنات کا نظام محض حادثہ نہیں اور نہ ہی زمین وآسمان کو دل لگی کے لیے پیدا فرمایا گیا ہے بلکہ اُس حکمت والے کا کوئی کام بھی حکمت سے خالی نہیں ہے۔یہ شمس وقمر،اندھیرا اُجالا، کہکشائیں اور ستارے اُس کی حکمت کی نشانیاں اور خلق و امر کے مالک ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔اسی ذاتِ حق نے شمس وقمر کو نُور بخشتا ہے۔نظامِ فلکی اللہ تعالیٰ کی قُدرت کا مظہر ہے۔قرآن میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

''هُوَ الَّذِی جَعَلَ الشَّمسَ ضِیَآءً''(۲۰۸)

ترجمہ:'' وہی ہے جس نے سورج کو جگمگاتا بنایا۔''

ابوالحسن واحد رضوی نے بڑی عمدگی سے قرآن کے موضوع کو شعری قالب میں ڈھالا ہے۔شعری نظیر ملاحظہ ہو:

جس نے ہر ذرّے میں خورشید کی تابش رکھی
اور خورشید کی تابش کو بڑھائے مادام(۲۰۹)

ہمیں اللہ تعالیٰ کا شکرادا کرنا چاہیے کہ ہم کہکشاں کے مضافاتی سیارے پر موجود ہیں۔دل کش عکس پیش کرتی یہ کہکشائیں ہیں جو گول، بیضوی، چھلّے دار اور بھنور نما ہیں۔کہکشائی نظام زندگی اور خوب صورت احساس کا ضامن ہے۔ستاروں کی جُھرمٹ یا کانسٹی لیشن کا نظام اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا شاہکار ہے۔آنکھوں کو خیرہ کرنے والی انوار وتجلّیات احسن الخالقین کی حُسنِ تخلیق کی نشانیاں ہیں۔شعری مثال ملاحظہ ہو:

جس کی تخلیق ہے اَنوار کی اُجلی دنیا
کہکشاؤں کا ، ستاروں کا نرالا یہ نظام(۲۱۰)

ابوالحسن واحد رضوی نے دلائلِ توحید اور ردّ شرک کے لیے اپنے حمدیہ قصیدے کی بنیاد نصوصِ قرآن پر اُستوار کی ہے۔دلائلِ تکوینی ،پھل دار درخت، ہواؤں کو باردار بنا کر بھیجنا، پرندوں کو ہوا میں روکنا،نسیمِ برّی و بحری، گونا گوں پھل، تدبیرِ اموراور قدرتِ کاملہ کے نظاروں جیسے موضوعات سے قصیدے میں توحید کی معنویّت اُجاگر ہوگئی ہے۔قدرت کے نظارے توحید پر دلالت اور عقل مندوں کے لیے مقامِ فکر ہے۔اَسرار و رموز کے منکشف ہونے سے ایمان وایقان اور وجدان وگیان کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ایسے خالق کے علاوہ درِغیر پر سرِ تسلیم کرنا سب سے عظیم خسارہ اور گمراہی ہے۔حسین نظاروں میں خالقِ کائنات کی معرفت اور بصیرت وحکمت کا سامان ہے۔واحد رضوی کی فکر قرآن سے اختراع کیے جانے کے شواہد اُن کے کلام کی ارفعیّت کی دلیل ہے۔قرآنِ مجید میں ارشادِ ربّ ذوالجلال ہے:

ترجمہ:'' کیا انہوں نے پرندے نہ دیکھے حکم کے باندھے آسمان
کی فضا میں انہیں کوئی نہیں روکتا سوا خدا کے بیشک اس میں نشانیاں
ہیں ایمان والوں کو۔''(۲۱۱)

ابوالحسن واحدؔ رضوی نے قرآن سے موضوعاتِ حمدیہ قصیدہ کشید کر کے عمدہ شعری نمونے پیش کیے ہیں۔ مثالیں دیکھیے:

جس کی قدرت کے نظارے ہیں شجر اور حجر
یہ گلاب اور چنبیلی یہ نرالی اقسام
یہ طیور اور بہائم کی انوکھی دنیا
یہ ہواؤں کا تموج ، یہ نسیموں کا خرام (۲۱۲)

حمد کی ماہیئت اور حقیقت مدحِ ربِّ ذوالجلال کے لیے ہے کیوں کہ جس قدر محاسن، کمالات، جاہ وجلال، مدح اور ستائش کا لائق اللہ تعالیٰ واحد و یکتا ہے کوئی دوسرا نہیں ہے۔ قرآن کی رُو سے حمد وثنا، کبریائی اور معبود ہونا اللہ تعالیٰ کو زیبا ہے۔ تسبیح اور تنزیہہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے۔ وہ واحد ذات شک وشبہ سے پاک اور لائقِ رکوع وسجود ہے۔ اسے حضرت آدمؑ ، اولاِ آدم اور انبیاء کرامؑ سجدہ کرتے ہیں۔ قرآن نے متعدد مقامات پر فلسفۂ توحید اور فلسفۂ عبادات بیان یوں ارشاد فرمایا ہے:

ترجمہ: '' یہ ہیں جن پر اللہ نے احسان کیا غیب کی خبریں بتانے والوں میں سے آدم کی اولاد سے اور ان میں جن کو ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا تھا اور ابراہیمؑ اور یعقوبؑ کی اولاد سے اور ان میں سے جنہیں ہم نے راہ دکھائی اور چن لیا جب ان پر رحمٰن کی آیتیں پڑھی جاتیں گر پڑتے سجدہ کرتے اور روتے۔'' (۲۱۳)

ابوالحسن واحدؔ رضوی نے درج بالا قرآنی فلسفہ سے موضوعات اختراع کر کے حمدیہ قصیدے کی فکری اُڑان کے پرندے کو مقامِ لاہوت تک پرواز عطا کر دی ہے۔ اُن کے ہاں حمد وثنا کی شرعی نوعیّت کے تراشیدہ شعر ملاحظہ ہوں:

حمد اُس کی جو یکتا ہے، جو واحد ہے سدا
اِس میں شک ہے، نہ تردّد ہے ، نہ کوئی ابہام
جس کی خاطر ہیں اذانیں ، یہ نمازیں ہر دم
جس کی خاطر ہیں رکوع اور سجود اور قیام (۲۱۴)

اللہ جلَّ شانہٗ کے ننانوے صفاتی نام ہیں۔اُس کے تمام صفاتی نام بہت پیارے ہیں۔اُسے جس صفاتی نام سے پُکاروگے وُہ اُسی شان کے مطابق پکارنے والے کی پکار کو سنتا، دعا قبول کرتا اور اسے عطا فرماتا ہے۔وہ دلوں اور ظاہر و باطن سے واقف ذات خفیہ و اعلانیہ پکار و استدعا قبول فرماتا ہے۔اللہ تعالیٰ اپنی مقام و مرتبۂ الوہیّت اور صفاتِ الٰہیّہ اپنے کلام میں خود بیان فرماتا ہے۔قرآن میں بیان کردہ انھی مبارک ناموں کی نسبت سے ابوالحسن واحد رضوی اپنے فکر کے کشتِ زار کو سیراب و معطر کرتے ہیں۔یہ وہ مبارک اسم ہیں جن کا ورد کرنے والا اللہ تعالیٰ کی جنّتوں کا حق دار ٹھہرتا ہے۔ساری عزتیں اُس کے مبارک نام جپنے سے ملتی ہیں۔قرآنِ مجید اللہ تعالیٰ کے پیارے ناموں کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

> ترجمہ:'' وہی ہے اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں بادشاہ نہایت پاک سلامتی دینے والا امان بخشنے والا حفاظت فرمانے والا عزّت والا عظمت والا تکبر والا اللہ کو پاکی ہے ان کے شرک سے وہی ہے اللہ بنانے والا پیدا کرنے والا ہر ایک کو صورت دینے والا اسی کے ہیں سب اچھے نام اس کی پاکی بولتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہی عزّت و حکمت والا ہے۔'' (۲۱۵)

ابوالحسن واحد رضوی کے ہاں گہرے جذبوں سے اللہ تعالیٰ کا نام جپنے والوں کو ملنے والے صلے اور رتبے کو موضوعِ قصیدہ بنایا گیا ہے۔اشعار دیکھیے:

جس کے ہر نام میں پنہاں ہیں خصائص کتنے
جس کے ہر نام کو جپنے سے جہاں بھر میں ہو نام
جس کے بندے ہیں رسول اور نبی اور ولی
جس کے منگتے ہیں شہنشاہ، تمامی حکام(۲۱۶)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی ذاتِ اقدس کے بارے میں ''لیس کمثلہ شیء'' فرما کر واضح کر دیا کہ اس کے مشابہ و مثل کوئی نہیں ہے وہ زمان و مکان کی رفعتوں سے بھی اعلیٰ وارفع ہے۔وہ لازوال و بے مثال، ازلی و ابدی ذات، زندہ و جاوید اور جس کی ذات کو دوام حاصل ہے۔اُس ذات کی ثنا و ستائش عقلِ ناتواں کہاں مقام و مرتبے کا تعیّن کر سکتی ہے۔وہ اپنی

مثال آپ ہے بندۂ خدا بس حمد سرا رہے یہی اس کے لیے متاعِ حقیقی ہے۔قرآن ارشاد فرماتا ہے:

ترجمہ:''اور اللہ نے تمھیں بنایا مٹی سے پھر پانی کی بوند سے پھر تمھیں کیا جوڑے جوڑے اور کسی مادہ کو پیٹ نہیں رہتا اور نہ وہ جنتی ہے مگر اس کے علم سے اور جس بڑی عمر والے کو عمر دی جائے یا جس کسی کی عمر کم رکھی جائے یہ سب ایک کتاب میں ہے بیشک یہ اللہ کو آسان ہے۔''(۲۱۷)

ابوالحسن واحدؔ رضوی قرآن کی رُو کے مطابق ثنا کے اِدراک سے عاجز ہے۔ان کے ہاں اس موضوع کی بندش دیکھیے:

عقلِ ناقص کو کہاں اُس کی ثنا کا اِدراک
ذہنِ فارغ سے معلیٰ ہے بہت اُس کا مقام
اُس کی تحمید سے عاجز ہے زمانہ سارا
خود ہی کرتا ہے معانی کا وہ سب پر اِلہام (۲۱۸)

ابوالحسن واحدؔ رضوی نے آخر میں سوز و گداز میں ڈوبی دعا کی ہے۔نہایت کرب اور اضطراب سے متاعِ خیر فی الدنیا کے متمنی ہیں اور قلبِ مضطر سے انجام بالخیر کی استدعا کرتے ہیں۔گیارہ اشعار کی دعا میں شوقِ نہاں کے مرام پائے جانے اور ضیائے عرفان کی تمنّا کا مضمون لیے ہوئے ہے۔مدحِ ربِّ جلیل کے لیے شرحِ صدر اور معارف کی گرہیں کھُلنے کی رقّت انگیز دعا کرتے ہیں۔شعری مثالیں دیکھیے:

ذہنِ بے نور کو مل جائے ضیائے عرفاں
ریزہ ریزہ ہو مرے نفسِ مہیں کا ہر دام
گرچہ عاصی ہے، یہ مجرم ہے، بلا کا ہے اثیم
خاتمہ خیر سے واحد کا ہو اے ربِّ اَنام (۲۱۹)

واحدؔ رضوی نے حمدیہ قصیدے کی فکر پر فن کا عمدہ جوہر دکھا کر حمدیہ قصیدے کو رنگ

برنگے پھولوں کا گلدستہ بنا دیا ہے۔اُن کے فن کے کشتِ زار میں انواع واقسام کے مہکتے پھول قصیدے کی فضا کو معطّر کر رہے ہیں۔چستیِ بندش،شکوہِ الفاظ،جاہ وجلال اور قرینے وسلیقے سے کی گئی سجاوٹ سے باہمی ربط نکھر گیا ہے۔شُستگی اور شائستگی کے باعث حمدیہ قصیدے کا چمنِ زار اسلوب سے ضُوفشاں اور طرزِ بیان سے عالی شان قلعہ بن گیا ہے۔یہ میمیہ قصیدہ ہے۔یہ قصیدہ تشبیب،گریز،مدح اور دعا پر مشتمل ہے۔چاروں ارکان قصیدہ کا بھرپور اور عمدہ استعمال کیا گیا ہے۔

زبان و بیان کی چاشنی

ابوالحسن واحد رضوی کے حمدیہ قصیدے میں زبان و بیان کی چاشنی پائی گئی ہے جو ان کی مشّاقی اور ریاضت کا ثبوت ہے۔یوں خیالات اور احساسات کی نئی دنیا آباد ہوگئی ہے۔زبان اور تاثیر میں گہرا ربط پیدا ہوگیا ہے۔واحد رضوی کے ہاں زبان و بیان کی چاشنی ملاحظہ ہو:

جس کی خاطر ہیں اذانیں، یہ نمازیں ہر دم
جس کی خاطر ہیں رُکوع اور سجود اور قیام(۲۲۰)

تراکیب کا تنّوع

ان کے ہاں روایتی اضافتی تراکیب دیکھیے:

ذوقِ شم،فقدِ لذت،احوالِ دُروں،مشغول غم ،کفِّ لسانی ،نطقِ لسانی،عقلِ ناقص،ذہنِ فارغ،خوابِ راحت،روزِ روشن،ذوقِ طلب،شوقِ نہاں،سوزِ دروں،نفسِ مہیں،ربِّ انام ابوالحسن واحد رضوی کے حمدیہ قصیدے میں سہ اضافتی تراکیب کی رنگارنگی بھی ملاحظہ ہوں:

درِشہرِ حقائق،حسنِ اظہارِ تمنّا وغیرہ

مرکبِ عطفی کی مثالیں کسی چمن میں لٹکتی بیلوں کی طرح خوشگوار اور متاثر کن ہیں۔

عُقول وافہام،حمد وثنا،حمد وستائش،شب وروز وغیرہ۔

ابوالحسن واحد رضوی کے ہاں مرکبِ عطفی اور اضافت کی آمیزش سے حمدی قصیدے کی فنّی خصوصیّات میں عمدگی اور دل آویزی کا عنصر در آیا ہے۔

شکوہِ الفاظ

جاہ وجلال اور شکوہِ الفاظ صنفِ قصیدہ کا امتیازی وصف ہے۔ابوالحسن واحؔد رضوی نے قصیدے کی روایت کوملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے کلام میں شکوہِ الفاظ کو بھرپور انداز میں برتا ہے جس سے مشکل اور ثقیل الفاظ بھی عمدگی سے کام میں لائے گئے ہیں۔اس ضمن میں ابوالاعجاز حفیظ صدیقی یوں رقمطراز ہیں:

> ''صوتی آہنگ اور معنوی فضا کے لحاظ سے بعض الفاظ میں ایک خاص قسم کا طمطراق اور طنطنہ جھلکتا ہے جسے اصطلاح میں شکوہِ الفاظ کہتے ہیں۔''(۲۲۱)

ان کے ہاں شعری مثال ملاحظہ ہو:

وہ خالق ہر چیز کا ہے
اس کا عرش ہے اس کا تل (۲۲۲)

تجنیسِ محرف

تجنیسِ محرف میں دو الفاظ اپنے حروف کی تعداد اور گنتی کے اعتبار سے تو ایک جیسے ہوتے ہیں مگر ان حروف کی حرکات وسکنات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔اس حوالے سے رحمت یوسف زئی یوں رقم طراز ہیں:

> ''اس میں ایسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو بہ اعتبار حروف تو یکساں ہوتے ہیں لیکن حرکات وسکنات کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔بنارس (شہر کا نام) اور بِنارس (بغیر رس کا)۔''(۲۲۳)

ابوالحسن واحؔد رضوی کے حمدیہ قصیدے میں یہ شعر ملاحظہ ہو:

یہ دعا ہے کہ دَرِ شہرِ حقائق وا ہو!
یہ دعا ہے کہ دُرِ بحرِ دقائق ہو عام(۲۲۴)

محولہ بالا مثال میں پہلا لفظ ''دَر'' ہے اور دوسرا دُ رہے۔حروف تعداد کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں لیکن ان کے تلفّظ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

سیاق الاعداد

شعر میں اعداد و شمار کا ذکر بعض اوقات شدّتِ جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ شعر میں اعداد و شمار کا ذکر کرنا سیاق الاعداد کہلاتا ہے۔ ابوالحسن واحد رضوی نے حمدیہ قصیدے میں بکثرت صنعتِ سیاق الاعداد کو بھی برتا ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر نذیر احمد یوں رقمطراز ہیں:

''یعنی کلام میں اعداد کا ذکر کرنا خواہ ترتیب سے خواہ بے ترتیب۔'' (۲۲۵)

ان کے ہاں سیاق الاعداد کی شعری مثال دیکھیے:

حمد اس کی جو یکتا ہے، جو واحد ہے سدا
اِس میں شک ہے، نہ تردّد، نہ کوئی ابہام (۲۲۶)

تکرارِ لفظی

صنعتِ تکرار سے کلام میں زورِ بیان، خوب صورتی، صوتی آہنگ اور حُسن پیدا ہو جاتا ہے۔ ابوالحسن واحد رضوی کے حمدیہ قصیدے میں صنعتِ تکرار کو بڑی عمدگی سے زینتِ کلام بنایا گیا ہے۔ پروفیسر نذیر احمد لکھتے ہیں:

''لفظوں کے تکرار سے کلام میں زور، تاثیر یا حسن پیدا کرنا۔'' (۲۲۷)

ابوالحسن واحد رضوی کے حمدیہ قصیدے میں صنعتِ تکرار کا بھرپور استعمال ہوا ہے۔ نمونے کے طور پر ایک شعر ملاحظہ ہو:

گدلا گدلا سا ہے افکار کا اُجلا چہرہ
بدلا بدلا سا ہے اب ذہن کا ہر ہر اِقدام (۲۲۸)

مراعات النظیر

مراعات کے معانی ''لحاظ کرنا، توجہ یا پاس رکھنا'' کے ہیں جب کہ نظیر کے معانی ''مثال اور مانند'' کے ہیں۔ شاعری میں ایک لفظ کو بطورِ نظیر پیش کرنا اور اس کی مناسبت سے دیگر الفاظ استعمال میں لانا، مراعات النظیر کہلاتا ہے۔ پروفیسر عبدالمجید لکھتے ہیں:

''چند ایسی چیزوں کا ایک جگہ ذکر کرنا جن میں (صنعت کی نسبت کے سوا) کسی طرح کی مناسبت ہو۔'' (۲۲۹)

ابوالحسن واحدؔ رضوی کے ہاں شعری مثال ملاحظہ ہو:

حسنِ اظہارِ تمنا کا سلیقہ بھی نہیں
کج بیانی ہے، دگر ہیچ مدانی ہے عام
(۲۳۰)

فکر اور فن کی وابستگی سے مرقّع ادب اور شہ پارۂ فن کا اردو ادب اور اردو حمدیہ قصیدے کی روایت میں اضافہ ہوا ہے۔ان کا حمدیہ قصیدہ ہیئتی اعتبار سے تمام ارکانِ قصیدہ پر مشتمل ہے۔صنفی اعتبار سے بھی وہ قصیدے کے ادبی مزاج سے واقف ہیں۔ابوالحسن واحد رضوی نے عربی قصیدہ نگاروں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے غیر مردف قصیدہ زینتِ قرطاس بنایا ہے۔ہیئت کا بڑی تراشیدگی و مشاقی سے اہتمام کر کے اپنی قصیدہ فہمی کا ثبوت دیا ہے۔ابوالحسن واحد رضوی کی خوش بختی ہے کہ اُن کا شمار اردو حمدیہ قصیدہ نگاروں کی صف میں ہوا ہے۔وہ دور جب قصیدہ نگاری معدوم ہو رہی ہو اس مردِ قلندر نے اردو حمدیہ قصیدہ لکھ کر اللہ تبارک و تعالیٰ کی مدح و ستائش اور توحید کے فلسفیانہ موضوعات سے تشنگانِ معرفت اور اپنے متوسلین و مریدین کے لیے علمی خزانہ زینتِ قرطاس بنا دیا ہے۔انھوں نے کسی جوہر شناس حکیم کی طرح مختلف پھولوں سے رس نکال کر توحید کا شیریں مشروب تیار کیا ہے۔وہ خدا مشرب وسیع المشرب ہیں۔اُن کا شمار اکیسویں صدی کے حمدیہ قصیدہ نگاروں میں نمایاں اور باوقار رہے گا۔

رفیع الدین راز

رفیع الدین رازؔ (بقیدِ حیات) جدید اردو غزل کا تابندہ ستارہ ہے۔ بیگو سرائے، بہار (انڈیا) میں پیدا ہوئے۔آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔امریکہ میں بھی رہ چکے ہیں۔نعت گوئی میں خاص شغف رکھتے ہیں۔تقریباً پچیس سے زیادہ شعری اور نثری تخلیقات کے مالک ہیں۔ان کی کلیاتِ غزل ''سخن سرمایہ'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔کلیاتِ نظم ''آبشارِ سخن'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔انشائیوں کی کلیات ''انشائے راز'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔حمد و نعت کا ایک مجموعہ ''دل آئینہ ہوا'' شائع ہو چکا ہے۔نعتیہ مسدس ''روشنی کے خدوخال'' کے نام سے بھی شائع ہو چکی ہے۔کہنہ مشق اور جدید لب و لہجہ کے شاعر ہیں۔ان کے ہاں ایک غیر مطبوعہ اردو حمدیہ قصیدہ ''برشگالِ نُور'' کے نام سے بھی ملتا ہے۔رفیع الدین رازؔ کے اردو حمدیہ قصیدہ ''برشگالِ نُور'' کا مطلع ملاحظہ ہو:

پیشِ نگاہ جو بھی ہے وہ بے مثال ہے
اے ربِ ذوالجلال یہ کیسا کمال ہے(۲۳۱)

رفیع الدین رازؔ نے اپنے حمدیہ قصیدے کا نام بھی اسی قصیدے کے ایک شعر سے اخذ کیا ہے۔شعر ملاحظہ ہو :

میری زمیں پہ رات کا پہرا ہے اِس گھڑی
اور آسماں پہ روشنی کی برشگال ہے(۲۳۲)

رفیع الدین رازؔ نے فلسفہ وحدت الوجود کو حمدیہ قصیدے کی زینت بنایا ہے۔نظریہ وحدت الوجود یہی ہے کہ کائنات کے ذرّے ذرّے سے اللہ تعالیٰ کے انوار کی تجلیات رُونما ہو رہی ہیں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے ہر جگہ موجود ہونے کے قائل ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں ،تصرف اور اختیارات کی بنیاد پر ہر جگہ حکمرانی کے قائل ہیں۔شعر ملاحظہ ہو:

ذرے ، ستارے ، قطرۂ شبنم ، کلی ، کرن
ہر شے میں ایک دیدنی حُسن و جمال ہے
(۲۳۳)

اللہ تعالیٰ کی کی مدح وستائش کے لیے رفیع الدین رازؔ نے اجرام فلکی ،نظام فلکی ، بروج، کہکشاؤں، تاروں اور شمس وقمر کو قصیدے کی کی زینت بنایا ہے۔وہی اس کائنات کی حکمتیں خوب جانتا ہے۔اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

> ترجمہ:''بیشک تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمان اور زمین چھ دن میں بنائے پھر عرش پر اِستواء فرمایا جیسا اس کی شان کے لائق ہے رات دن کو ایک دوسرے سے ڈھانکتا ہے کہ جلد اس کے پیچھے لگا آتا ہے اور سورج اور چاند اور تاروں کو بنایا سب اُس کے حکم کے دبے ہوئے سن لو اسی کے ہاتھ ہے پیدا کرنا اور حکم دینا بڑی برکت والا ہے اللہ رب سارے جہان کا۔''(۲۳۴)

رفیع الدین رازؔ نے بڑی عمدگی سے اللہ تعالیٰ سے شکوہ بھی

کیا ہے مگر اندازِ تکلم اس قدر نزاکتوں سے معمور ہے کہ بوجھل اور ناگوار محسوس نہیں ہوتا۔ استفہامیہ اندازِ تکلم، شکوے کا سا رنگ اور دریافت کرنے کا پُرحکمت انداز شاعر کی علوِ فکر کا سرمایہ ہے۔ وہ اپنے غموں کے مداوا کے لیے اپنے رب کی بارگاہ میں نیاز مند ہے کیوں کہ اس کے نزدیک فقط اللہ تعالیٰ کی ذات ہی حقیقی مشکل کشا اور حاجت روا ہے۔ اُن کے ہاں حالی و اقبال کے خیال کی ترقی یافتہ صورت کی شعری مثال دیکھیے:

کیوں بجلیوں کی زد میں ہے مومن کا آشیاں
شکوہ تھا جو کسی کا وہ میرا سوال ہے(۲۳۵)

رفیع الدین رازؔ نے قرآن سے موضوعات اختراع کرنے کی کام یاب سعی کی ہے۔ وہ سورۃ الرحمٰن کے مرکزی نکتے کو شعری قالب میں ڈھالتے نظر آتے ہیں۔ چاند، چرخ، دریا، سمندر، شبنم، باغات اور حسنِ کائنات سے اللہ تعالیٰ کی شانِ عظیم کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ انھیں اللہ تعالیٰ کی عطاؤں کا پورا ادراک ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

"فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ"(۲۳۶)

ترجمہ: "تو اے جن و انس تم دونوں اپنے رب کی کون سی نعمت جھٹلاؤ گے۔"

رفیع الدین رازؔ نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تذکرہ کر کے اس موضوع کی جامعیّت کو چار چاند لگا دیئے ہیں کہ تم اگر اس کی نعمتوں کا شمار کرنے لگو تو شمار نہ کر سکو گے۔ اس حوالے سے شدّتِ جذبات سے معمور شعر دیکھیے:

میں اُس سے اور سوال کروں میری کیا مجال
مقروض جس خدا کا مرا بال بال ہے (۲۳۷)

رفیع الدین رازؔ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شہر آشوب کا نوحہ بھی پیش کیا ہے کیوں کہ وہی آشوب ختم کر سکتا ہے۔ وہی حقیقی غوث ہے۔ ان کے کلام میں اقبال جیسی شوخی تو نہیں مگر احساس نزاکت ضرور ہے۔ رفیع الدین رازؔ نے تشبیب میں میں آشوبیہ موضوع کو بھی بیان کیا ہے۔ یہ انداز حالی کی طرح کسک سے عبارت ہے۔ شعری مثال دیکھیے:

یارب! معاف کر دے اسیرانِ کرب کو
پستی کی اِنتہا پہ اب اِن کا زوال ہے (۲۳۸)

رفیع الدین رازؔ نے یہاں اللہ تعالیٰ کی دیگر صفاتِ عالیہ کو حمدیہ قصیدے کی زینت بنایا ہے وہاں اس کی عظیم ترین شان عالم الغیب ہونے پر بھی خامہ فرسا ہے۔اللہ تعالیٰ کی ذات کائنات تمام سرّ ونہاں سے باخبر ہے۔ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ:''جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور جانتا ہے جو
تم چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو اور اللہ دلوں کی جانتا ہے۔''(۲۳۹)

رفیع الدین رازؔ اللہ تعالیٰ کے علم اور اپنے بندے سے آگہی پر رطب اللساں ہیں۔ شعر اللہ تعالیٰ کی علمّیت،دسترس،تصرف اور علاّم الغیوب ہونے کا بیان اور شاعر کے وفورِ شوق ومحبت کا شہکار و آئینہ دار ہے۔شعر ملاحظہ ہو:

یا رب تری نگاہ پہ افشا ہے سر بہ سر
کیفیّتِ نفس ہے کیا ، کیا دل کا حال ہے (۲۴۰)

رفیع الدین رازؔ کا حمدیہ قصیدہ رنگا رنگ موضوعات کی بوقلمونیوں سے مزیّن ہے لیکن یہاں صرف اجمالی خاکہ پیش ہے۔اللہ تعالیٰ کی شان بیان کرکے حسنِ طلب اور صلہ کے لیے نیازمند ہیں۔اللہ رحم وکرم والا،دریا دل اور منبعِ بخشش وعطا ہے۔انھوں نے امّتِ مسلمہ کے لیے اجتماعی دعا بھی کی ہے۔جس میں ان کی اجتماعی سوچ اور عالمِ اسلام سے محبّت ٹپکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔دعا یا حُسنِ طلب کی شعری مثال ملاحظہ ہو:

میری دعا کو بابِ اثر سے گزار دے
امّت پہ رحم کر تو فقید المثال ہے(۲۴۱)

رفیع الدین رازؔ کا یہ قصیدہ ۱۵۰ اشعروں پر مشتمل ہے جو دورِ حاضر کا عمدہ حمدیہ قصیدہ ہے۔فکر وفن کے ربط وانبساط سے ایک فن پارہ شہ پارۂ ادب بن جاتا ہے۔رفیع الدین راز کا یہ بھرپور حمدیہ قصیدہ ہے جس طرح مرثیہ اپنی ہیئت سے پہچانا جاتا ہے،جیسے ڈرامے کے فنی عناصر، پلاٹ،کردار،مکالمے،زبان،موسیقی اور آرائش و پیش کش ہیں اسی طرح حمدیہ قصیدے

میں اس کے چاروں ارکان (تشبیب، گریز، مدح اور دعا) ہی اسے شہنشاہِ اقلیمِ ادب کا درجہ دیتے ہیں۔ یہی اس کی اصل پہچان ہے۔ تحسینِ کلام اور صنائع بدائع کی مینا کاری نے حمدیہ قصیدے کو ممتاز درجہ عطا کر دیا ہے۔

زبان و بیان کی چاشنی

رفیع الدین رازؔ کے حمدیہ قصیدے میں زبان و بیان کی چاشنی، صفائی اور روانی پائی گئی ہے۔ شعری مثال ملاحظہ ہو:

کیا چودھویں کے چاند میں ڈھل پائے گا کبھی
ایمان کا یہ چاند جو مثلِ ہلال ہے(۲۴۲)

پُرشکوہ الفاظ

قصیدے میں طنطنے اور اُسلوب کی شان و شوکت نے کلام کو پُرشکوہ بنا دیا ہے جس سے رفیع الدین رازؔ کی فنی پختگی اور تراشیدگی کا احساس نمایاں ہوتا ہے۔ اُن کے ہاں پُرشکوہ اُسلوب کی شعری مثال دیکھیے:

شاخِ شجر ہو، بادِ سحر ہو کہ آب جُو
مخصوص سب کا رقص ہے، مخصوص چال ہے(۲۴۳)

استفہامیہ لہجہ

استفہامیہ لہجہ قاری کے سوال اور پھر اس کا بھرپور جواب، نئے نئے پہلوؤں تک رسائی کا عمدہ طرزِ تحریر ہے۔ ایک ہی شعر میں سوال اور پھر اُس کا جواب قاری کو فراہم کرنا رفیع الدین رازؔ کے شعور کی دلیل ہے۔ مثال دیکھیے:

تیرے کمالِ فن پہ کرے کون تبصرہ
تُو لازوال، تیرا ہنر لازوال ہے(۲۴۴)

تراکیب کے عمدگی سے استعمال نے حمدیہ قصیدے کو مرکزِ نگاہ بنا دیا ہے۔ اضافتی تراکیب کے استعمال نے گلہائے انارِ آتشیں کا سماں باندھ دیا ہے۔ کلام میں مرکبِ عطفی کی رعنائی اور حسن

بھی جلوہ گر ہے۔ سہلِ ممتنع کا استعمال کلام کی خوبیوں اور فنی تراشیدگی و نادرکاری کا عمدہ نمونہ ہے۔

تکرارِ لفظی

صنعتِ تکرار سے کلام میں زورِ بیان، خوب صورتی، صوتی آہنگ اور حُسن پیدا ہو جاتا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

کچھ کچھ ہمیں یقین سا ہونے لگا ہے اب
اِس آفتابِ حرص کا ڈھلنا محال ہے(۲۴۵)

سیاق الاعداد

رفیع الدین رازؔ نے حمدیہ قصیدے میں صنعتِ سیاق الاعداد کا استعمال بھی کیا ہے۔ ان کے ہاں اس کی مثال ملاحظہ ہو:

صد شکر تیری عظمتِ ہستی کے باب میں
رنگِ یقینِ دل مرا بے احتمال ہے(۲۴۶)

تنسیق الصفات

اردو حمدیہ قصائد میں زورِ کلام پیدا کرنے کے لیے صنعتِ تنسیق الصفات کا استعمال بھی دیکھنے میں آیا ہے کیوں کہ اس صنعت میں ممدوح کی صفات کا متواتر تذکرہ کیا جاتا ہے۔ صنعتِ تنسیق الصفات کی شعری مثال ملاحظہ ہو:

بادِ نسیم، قطرہِ شبنم، ضیائے صبح
ہر شاخِ گل پہ دیدنی رقصِ وصال ہے (۲۴۷)

۱۵۰ شعروں کا یہ حمدیہ قصیدہ اکیسویں صدی کا فکروفن کے اعتبار سے عمدہ حمدیہ قصیدہ ہے۔ پُرحکمت، فصیح و بلیغ اور تمام عالموں کے خالق کی عظمتِ بیکراں کا تذکرہ کر کے دریچۂ علم و عرفان کھول دیا ہے۔ یہ حمدیہ قصیدہ ہیئت اور صنفی تشکیل کے اعتبار سے اپنی تمام رعنائیوں کا مکمل نمونہ ہے۔

شاعر علی شاعؔر

شاعر علی شاعؔر (بقید حیات) تاجدارِ ملتان بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے شہر ملتان میں پیدا ہوئے۔ کراچی میں مقیم ہیں۔ شاعر، ادیب، پبلشر اور نقاد ہیں۔ سہ ماہی ''رنگِ ادب'' پاکستان میں ادب پروری کا امین ہے۔ موجودہ عہد میں حمد ونعت کو بڑے پیمانے پر محفوظ کیا ہے۔ آپ کی مطبوعہ کتب کی تعداد پچاس کے لگ بھگ ہے۔ اعزازات ان کے ادبی مقام ومرتبے کے تعیّن کے لیے کافی ہیں۔ غزل گو شاعر ہیں تاہم دیگر اصنافِ ادب میں بھی عمدہ ادب تخلیق کیا ہے۔ ان کا شمار موجودہ دور کی نمایاں ادبی شخصیات میں ہوتا ہے۔ دیگر اصنافِ شعری کے علاوہ اُن کے ہاں ایک غیر مطبوعہ حمدیہ قصیدہ، ''قصیدۂ گلزارِ حمد'' کے نام سے ملتا ہے جو پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدے کی روایت میں ایک عمدہ اضافہ ہے۔ مطلع کا شعر ملاحظہ ہو:

چاندنی رات میں دیکھا جو چمکتا امبر
یادِ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ہوا دل مضطر (۲۴۸)

اللہ تعالیٰ کی ذات چھپا ہوا خزانہ تھا پھر اس نے چاہا میں پہچانا جاؤں تو اس نے اپنی مشیّت سے مخلوق کو خلق کیا اور پھر سیّد البشر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو پیدا فرمایا۔ سید البشر کو پھر سیّد الانبیاء کا تاج پہنایا۔ یہ وہ تاج ہے جو کائنات میں کسی راہ نما کے سر نہیں سجایا گیا۔ شاعر علی شاعؔر نے شانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ذکر کر کے خالق کی مدح وتوصیف کا عمدہ اندازِ بیاں اپنایا ہے۔ ان کا یہ موضوع قرآنی تعلیمات سے کشید کردہ ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ: ''تم تو ڈر سنانے والے ہو اور ہر قوم کے ہادی۔'' (۲۴۹)

شاعر علی شاعؔر کے ہاں حمدیہ قصیدے میں شعری مثال ملاحظہ ہو:

مل گیا دہر میں انسان کو منزل کا سراغ
رہ نما بن کے چلے آئے حضورِ انورؐ (۲۵۰)

شاعر علی شاعؔر نے فلسفہ وحدت الوجود کو بھی حمدیہ قصیدے کی زینت بنایا ہے کہ کائنات اللہ تعالیٰ کے نور سے بنی ہے۔ کائنات کے ذرے ذرے سے اس کی قدرتیں عیاں ہیں۔ نظریہ وحدت الوجود کو وحدت الموجود نہیں سمجھ لینا چاہیے۔ دنیا اور ما فی ہا میں پھیلے شجر و حجر بھی اپنے خالق کے حمد کناں ہیں۔ شعری مثال دیکھیے:

ہر گل و برگ پہ لکھی ہے اُسی کی توصیف
اُس کی ہی حمد وثنا کرتے ہیں سارے منظر (۲۵۱)

شاعرعلی شاعؔر نے مدح ربِّ کریم کے لیے قرآنی موضوعات کا بڑی بصیرت سے مطالعہ کرکے انھیں موزوں گوئی کا جامہ پہنایا ہے۔قرآن بھی حمد سرا ہے۔شاعرعلی شاعؔر کا بیان کردہ موضوع سورۃ الانبیاء، فاطر، زمر، ابراہیم اور سورۃ یٰسں میں بھی اللہ تعالیٰ کی اجرامِ فلکی اور نظامِ فلکی کی قدرتوں کے مضمون کو بیان کرتا ہے۔ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ:''اور وہی ہے جس نے بنائے رات اور دن اور سورج اور چاند ہر ایک ایک گھیرے میں پیَر (تیر) رہا ہے۔''(۲۵۲)

شاعرعلی شاعؔر کا مشاہدہ مبنی بر حقیقت اور قرآنی تعلیمات پر اُستوار ہے۔حمدیہ قصیدے کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

اس کے ہی دَم سے ہے مہر و مہ و انجم میں چمک
اس کے ہی اِذن سے گردش میں ہیں یہ شام وسحر (۲۵۳)

یہ دریاؤں کی روانی، یہ بارشوں کا پانی، گلیشیرز کی جولانی اور پہاڑوں کی اونچائی یہ سارے کے سارے جاہ وجلال خالقِ کائنات کی عظمتِ تخلیق کی نشانیاں ہیں۔سورۃ الرحمٰن میں اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کی نشانیاں زبانِ حال سے حمد سرا ہیں۔ درخت زمین کا زیور اور پہاڑ زمین کی میخیں ہیں۔شاعرعلی شاعؔر نے قرآن میں بیان کردہ قدرتِ کاملہ کی نشانیوں کے موضوع کو شعری رُوپ عطا کردیا ہے۔قرآن میں ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ: اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں لنگر اور نہریں بنائیں اور زمین میں ہر قسم کے پھل دو دو طرح کے بنائے رات سے دن کو چھپالیتا ہے بیشک اس میں نشانیاں ہیں دھیان کرنے والوں کو۔''(۲۵۴)

جاہ وجلال اور جمالیاتی وعرفانی انبساط کا حامل حمدیہ قصیدے کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

وہ خدا جس نے دریاؤں کو رکھا ہے رواں
وہ خدا جس نے بنائے ہیں یہ کوہِ اکبر (۲۵۵)

شاعر علی شاؔعر نے ایک ہی شعر میں اللہ تعالیٰ کی کئی صفات کو خراجِ عقیدت پیش کی ہے جس سے ان کی ہمہ جہت شاعرانہ صلاحیّت کا سراغ ملتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی ذات کی صفات ورا الوریٰ ہیں۔ بندہ اس کا حمد سرا ہے۔اُس کو جس صفت سے پکاروگے وہ عظیم ذات اُسی صفت کی شان سے نوازے گی۔قرآن میں فرمانِ باری ہے:

ترجمہ:''اور اللہ کا رزق سب سے اچھا۔''(۲۵۶)

شاعر علی شاؔعر قرآنِ مبین کی تعلیمات کو بُنیاد بنا کر اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں شعری مثال ملاحظہ ہو:

وہ ہی مالک، وہی خالق، وہی رزاقِ جہاں
اُس کے در سے ہی زمانے کو مِلا لقمۂ تر (۲۵۷)

شاعر علی شاؔعر اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہے کہ اُس نے جہالت سے نکال کر نُور مقدر کر دیا ہے۔ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ:''اللہ والی ہے مسلمانوں کا انہیں اندھیریوں سے نور کی طرف نکالتا ہے اور کافروں کے حمایتی شیطان ہیں وہ انھیں نور سے اندھیریوں کی طرف نکالتے ہیں یہی لوگ دوزخ والے ہیں انہیں ہمیشہ اس میں رہنا۔''(۲۵۸)

شاعر علی شاؔعر اللہ تعالیٰ کے احسان پر یوں نغمہ پرداز ہیں:

وہ خدا جہل کی ظلمت سے بچایا جس نے
وہ خدا جس نے دیا ہم کو اُجالوں کا سفر (۲۵۹)

قرآنِ کریم کی بیسیوں آیات میں اللہ تعالیٰ کے قادر وقدیر کا تذکرہ وبیان ہے۔جسے وہ چاہے، جیسے وہ چاہے، جس قدر اور جس پہلو سے وہ چاہے تغیّر وتبدل کرے۔وہ کن فیکون کا مالک ہے۔تمام ذی روح الغرض تمام مخلوقات اُسی کے حکم کے تابع ہیں۔ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ:''اور اللہ اپنے کام پر غالب ہے۔''(۲۶۰)

شاعر علی شاؔعر گلشن، بارش، شجر، موسم اور کائنات کے مضمرات کے حوالے سے اللہ کے کُلی اختیارات پر سپاس گزار ہیں۔موسمی کیفیات، موسمی اُتار چڑھاؤ اور تغیّر سے پیدا ہونے

والے مظاہر پر اللہ ہی کی قدرت ہے۔ شعر دیکھیے:

آتے جاتے ہُوئے موسم ہیں اُسی کے محتاج
ہے ہر اِک برگِ چمن اُس کی ثنا کا دفتر (۲۶۱)

آخر میں شاعر علی شاعرؔ ممنونیت و احسان مندی کا اظہار کرتے ہوئے سپاس گزار ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سِوا کوئی دعاؤں کو قبول کرنے والا نہیں۔ وہی غوثِ حقیقی استعانت و مدد کر کے غموں کا مداوا کرنے والا ہے۔ وہ ہر پُکارنے والے کی پُکار کا جواب دیتا ہے۔ اُسی کے ہاں پُکارنے والے کی پُکار ضائع، بے کار اور ردّ نہیں ہوتی۔ ارشادِ ربِّ جلیل ہے:

ترجمہ: ''اور اے محبوب جب تم سے میرے بندے مجھے پوچھیں تو میں نزدیک ہوں دعا قبول کرتا ہوں پکارنے والے کی جب مجھے پکارے تو انہیں چاہیے میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں کہ کہیں راہ پائیں۔'' (۲۶۲)

شاعر علی شاعرؔ نے حمدیہ قصیدے کے آخر میں قصیدے کی روایت اور ہیئت کے مطابق دعا کے اشعار بھی لکھے ہیں۔ ان دعائیہ اشعار میں سے ایک شعر ملاحظہ ہو:

ماسِوا تیرے دعاؤں کو کرے کون قبول
غم گرفتوں کی رکھے تیرے سِوا کون خبر (۲۶۳)

یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ تنقید فنونِ لطیفہ میں باقاعدہ فن کے درجے پر فائز ہو چکی ہے۔ روح اور جسم کا انحصار کسی گہرے ربط اور مشترکہ وجود کا عکاس ہے۔ فکر و فن کا عمدہ سنگم ہی اسے فصاحت و بلاغت، رُوپ، اسلوب، الفاظ و معانی کا حسین امتزاج اور بیان و بدیع کی چاشنی عطا کرتا ہے۔ شاعر علی شاعرؔ کا یہ رائیہ قصیدہ ہے جو پچاس اشعار پر مشتمل ہے۔ عربی روایت کی تتبع میں غیر مردف قصیدہ لکھا ہے۔ صنائعِ بدائع اور علمِ بیان و بدیع نے قصیدے کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

زبان و بیان کی چاشنی

شاعر علی شاعرؔ کے حمدیہ قصیدے میں زبان و بیان کی چاشنی، صفائی اور روانی پائی گئی

ہے۔زبان و بیان کی چاشنی نے قصیدے کی تاثیر کو دوبالا کر دیا ہے۔جواُن کی شعری گرفت اور مشّاقی کی دلیل ہے۔شعری مثال ملاحظہ ہو:

اس کو زیبا ہے تکبر ، وہ سزاوارِ اَنا
ساری دنیا پہ اسی کی تو نگہباں ہے نظر (۲۶۴)

پُرشکوہ

میں قصیدے آن بان، جاہ وجلال اور اسلوب کی شان وشوکت نے کلام کو پُرشکوہ بنا دیا ہے۔قصیدے کے چہرۂ گلگلوں سے جاہ وحشم ٹپک رہا ہے۔شاعر علی شاعؔر کے ہاں پُرشکوہ لب و لہجے کی شعری مثال ملاحظہ ہو:

تحفۂ شفقت و رحمت ہے وہ اندازِ خرام
ذرّے مہتاب ہوئے اُس کے قدم کو چُھو کر (۲۶۵)

تراکیب کا استعمال

تراکیب کے عمدگی سے استعمال نے حمدیہ قصیدے کو مرکزِ نگاہ بنا دیا ہے۔اضافتی تراکیب کے استعمال نے گلہائے انار آتشیں کا سماں باندھ دیا ہے۔کلام میں مرکبِ عطفی کی رعنائی اور حسن بھی جلوہ گر ہے۔

استفہامیہ لہجہ

استفہامیہ لہجہ قاری کے سوال اور پھر اس کا بھر پور جواب، نئے نئے پہلوؤں تک رسائی کا عمدہ طرزِ تحریر ہے۔شعر دیکھیے :

جز ترے کون مسیحا ہے گنہ گاروں کا
تیری رحمت کو تکا کرتی ہے بے چین نظر (۲۶۶)

سیاق الاعداد

شاعر علی شاعؔر نے حمدیہ قصیدے میں صنعتِ سیاق الاعداد کا استعمال بھی کیا ہے۔ ان کے ہاں اس کی مثال ملاحظہ ہو:

ہم کو اللہ کی وحدت کی ملی دعوتِ نو
ایک اِک لمحہ بنا مہر و وفا کا پیکر(۲۶۷)

تجنیس مضارع

شاعر علی شاعؔر نے تجنیس مضارع کا استعمال بھی کیا ہے جس کو بڑی عمدگی سے استعمال کیا گیا ہے۔ پروفیسر نذیر احمد لکھتے ہیں:

''یعنی دو الفاظ متجانس میں صرف ایک حرف کا جو قریب المخرج یا متحد المخرج ہو،مختلف ہونا: جیسے برسوں اور پرسوں وغیرہ وغیرہ۔''(۲۶۸)

شاعر علی شاعؔر کے ہاں تجنیس مضارع کی شعری مثال ملاحظہ ہو:

میرے مالک نے بچھایا ہے زمیں کا قالین
میرے مالک نے بنائے ہیں شجر اور حجر (۲۶۹)

تجنیسِ زائد و ناقص

صنعت تجنیسِ زائد و ناقص میں ایک لفظ میں دوسرے لفظ کی نسبت ایک حرف زیادہ یا کم ہوتا ہے۔جس سے فن کی صوتی اور معنوی تاثیر بڑھ جاتی ہے۔ پروفیسر نذیر احمد لکھتے ہیں:

'' دو متجانس الفاظ میں سے ایک کا دوسرے سے ایک حرف کم یا زیادہ ہونا''۔(۲۷۰)

مثال ملاحظہ ہو:

ہم کو اللہ کی وحدت کی ملی دعوتِ نو
ایک اِک لمحہ بنا مہر و وفا کا پیکر(۲۷۱)

درج بالا شعر میں ''ایک اور اِک''میں تجنیسِ زائد و ناقص استعمال ہوئی ہے۔

صنعت تکرار

شاعری میں الفاظ کو دوہرانے کا عمل صنعتِ تکرار کہلاتا ہے۔صنعتِ تکرار استاد شعرا نے بھی بڑی عمدگی سے برتا ہے۔شاعر علی شاعؔر نے تکرار سے کلام میں بلا کی تاثیر پیدا کردی ہے۔ اس صنعت کے استعمال سے زورِ بیان ،شان و شوکت اور خوش سلیقگی کلام کی

زینت بنتی ہے۔مثال ملاحظہ ہو:

کون ہے جس کو نہیں اُس کی بڑائی کا شعور
اُس کی ہی عظمت و تکریم کا چرچا گھر گھر (۲۷۲)

صنعتِ تضاد

وہ الفاظ جو ایک دوسرے کے اُلٹ اور ضد ہوں صنعتِ تضاد یا طباق کہلاتے ہیں۔ اس کی دو اقسام ہیں۔وہ ایجابی اور سلبی ہیں۔طباقِ ایجابی میں الفاظ متضاد کے ساتھ حرف نفی کا استعمال نہیں کیا جاتا۔جیسے: بہار،خزاں وغیرہ۔مثال ملاحظہ ہو:

ساری دنیا میں بہاروں کا لگا تھا میلہ
ہو گئے دُور نگاہوں سے خزاں کے لشکر (۲۷۳)

شاعر علی شاعؔر کے اردو حمدیہ قصیدے میں تشبیب پُر مغز، گریز کا عمدہ ربط، مدح کی علمی و منطقی بنیادیں اور دعا میں سوز و گداز کی بدولت داخلی و خارجی اور فکری و فنی معیارات قابلِ ستائش ہیں۔مروجہ ہیئت کی پاس داری اور صنفی تشکیل کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اکیسویں صدی کے اردو ادب کو عمدہ حمدیہ قصیدہ بہم پہنچایا ہے۔

منظر عارفی

سید منظر علی کراچی میں پیدا ہوئے۔قلمی نام منظؔر عارفی ہے۔آپ کے والد کا نام سید احمد علی ہے۔آپ کی تعلیم گریجوایشن ہے۔آپ ایک با صلاحیت تخلیق کار ہیں۔آپ کی شاعری زندگی کی رنگا رنگ بوقلمونیوں سے مزّین ہے۔سخن سرائی روح کا وہ زمزمہ ہے جسے شوقِ وصل میں جوشِ دل سے گنگنایا جاتا ہے۔آپ نے احساسات اور مشاہدات کو تخیل کی گرم جوشی سے سپردِ قرطاس کر کے جذبات کی مصوری کی ہے۔کلام میں گہرائی و گیرائی پائی جاتی ہے جو روح میں اُتر کر نغمگی اور سرور آگیں تاثیر دیتی ہے۔منفرد ذوقِ اظہار اُن کی اقبال مندی کا پیش خیمہ ہے۔شعر میں رعنائی اور اُسلوبِ نگارش علوِ فکر کی علامت ہے۔آپ کے ہاں وفورِ شوق کا سرمایہ اور محبت کی متاع متلاطم ہے۔

منظر عارفی کے شعری مجموعے ''پاؤں میں گرداب''، ''بساطِ عشق سے کارِ سخن

تک''، ''تم مری منزل نہیں''، ''اللہ کی سنت''، ''روحِ ایماں''، ''کمالِ سخن''، ''انہی مشعلوں سے دیے جلے''، ''آپ اسرارِ ازل''، ''سلطانِ جہاں اور''اور'' فانوس'' ہیں۔اس کے علاوہ ''عرفانیاتِ عارف'' آپ کی مرتب کردہ کتاب ہے جس میں استاد عارف اکبرآبادی کے حمد،نعت،منقبت اور مراثی شامل ہیں۔آپ نے ''سماجی انصاف تعلیمات نبوی کی روشنی میں'' سیرتِ نبوی ﷺ پر کام کیا۔بچوں کے لیے بھی لکھا۔تحقیق کے حوالے سے کراچی میں مختلف اصنافِ ادب پر کام کر کے کراچی کا ادبی منظر نامہ محفوظ کر دیا ہے۔فقط منظر عارفی کی تحقیقی کتب کا مطالعہ قاری کو کراچی کے ادبی سفر سے رُوشناس کرانے میں کلیدی کردار ادا کرتا نظر آئے گا۔

منظؔر عارفی کے ہاں ایک غیر مطبوعہ اردو حمد یہ قصیدہ بھی دستیاب ہے۔یہ الفیہ حمدیہ قصیدہ سو اشعار پر مشتمل ہے۔یہ حمدیہ قصیدہ چاروں ارکانِ قصیدہ پر مشتمل ہے۔

منظؔر عارفی نے تشبیب کا فرش زندگی اور متعلقاتِ زندگی کے ارد گرد بچھایا ہے۔ت تشبیب میں دنیاوی زندگی کے نشیب وفراز،غم وآلام،آہ وفغاں،ظلم وجبر،حق وباطل کی معرکہ آرائی،گرتی ہوئی انسانی ساکھ،خوشیوں کا فقدان،نفسانی خواہشات کی بہتات،نئی نئی امراض، ایٹمی جنگ کے بڑھتے ہوئے خدشات،بے حسّی،افراطِ زر،وسائل کی تقسیم میں عدم مساوات،جرائم اور فحاشی وعریانی جیسے موضوعات کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔اس تشبیب میں آئینہ اور عکس دکھایا گیا ہے۔زمانے کی نیرنگیاں اور معاشرتی پر چھائیاں تشبیب میں دَرآئی ہیں۔مختلف سماجی،معاشی،معاشرتی،اخلاقی اور سیاسی مسائل کو اُبھارنے کے بعد منظر عارفی نے بڑی فکری پختگی سے ان مسائل کا حل اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل میں کی صُورت میں پیش کیا ہے۔

تشبیب میں دورِ حاضر کے انسان کو درپیش انفرادی واجتماعی معاملات ومسائل کو عمدگی سے نمایاں کیا گیا ہے۔تشبیب کا یہ اندازِ سخن روایتی مضامین سے ہٹ کر ندرتِ خیال کا شاہکار ہے۔ادب زندگی کا عکاس ہوتا ہے کے مصداق منظر عارفی نے جدید دور کا نوحہ اور المیہ رقم کیا ہے۔منظر عارفی نے اپنے تمام تر خدشات کا حل اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں بتلایا

ہے۔تشبیب نے عربی زبان وادب سے ایرانی زبان وادب تک کے سفر کے دوران میں رنگا رنگ موضوعات کو بیان کیا ہے۔اب تشبیب محض معاملاتِ حسن و عشق تک محدود نہیں رہی۔تشبیب میں منظرؔ عارفی کے فکری شعور کی شعری مثالیں ملاحظہ ہوں:

آزار و مصائب کا ہے مدفن دنیا
پُر امن نہیں اس کا کوئی بھی لمحہ
ہر دور میں کٹتے رہے حلقومِ بشر
ہر عہد میں ہوتی رہی انساں پہ جفا(۲۷۴)

تشبیب کے بعد اور مدح سے قبل گریز میں مادح اپنے ممدوح کی مدح وتوصیف بیان کرنے کا بہانہ تلاش کرتا ہے۔یوں بڑی عمدگی سے مدح کی طرف مڑ جاتا ہے۔وہ اشعار جن میں مادحِ اپنے ممدوح کی مدح سرائی کا جواز پیش کرتا ہے گریز کہلاتا ہے۔یہ قصیدے کا بہت حسّاس حصّہ ہوتا ہے۔گریز کے اشعار ملاحظہ ہوں:

اب ایسے میں مذہب تو یہی ہے کہتا
اللہ سے جُڑ جائے ہر اِک عبدِ خدا
کثرت سے کرے حمد زباں میں اپنی
طاعت کی طرف آئے خُدا کی ، پرجا(۲۷۵)

مدح میں منظرؔ عارفی نے اپنی فکر کو قرآنِ مجید فرقانِ حمید کے بیان کردہ موضوعات سے کشید کیا ہے۔اسمائے الحسنٰی،صفاتِ ربِّ جلیل،مشاہداتِ فطرت،کائنات میں موجود قدرتِ الٰہی کے مظاہر،فلسفہ وحدت الوجود،فلسفہ وحدت الشہود،اور فلسفہ وجودِ واجب وغیرہ کے موضوعات کو بیان کر کے اللہ تعالیٰ کی شان بیان کی ہے۔مدح کے مطالع ملاحظہ ہوں:

جی چاہتا ہے پاؤں سعادت کی ضیا
رب ہی کی مدد سے کروں کچھ رب کی ثنا
معبود ہے مسجود ہے تو ربِّ عُلا!
مخلوق پہ ہے فرض کرے تیری ہی ثنا(۲۷۶)

اللہ تعالیٰ مالکِ کل، والی، خالق اور پناہ دینے والی ذات ہے۔ کائنات میں موجود سب کچھ اس کے تصرف میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے خالق و مالک اور والی ہونے کے قرآنی موضوع کو کمال فکری بُنت سے شعری قالب میں ڈھالا ہے۔

اے مالکِ کل! تو ہے ہمارا والی
اے خالقِ کل! تو ہے ہمارا ملجا(۲۷۷)

منظؔر عارفی نے قرآنِ مجید سے اسماء الحسنیٰ مستعار لے کر حمدیہ قصیدے کے چمن کو معطر کیا ہے۔ راحم، رحیم، اعلیٰ، اکبر، والی کل، سمیع، بصیر خالقِ کائنات جیسے اسماء الحسنیٰ کو قصیدے میں سمویا ہے۔ شعری مثالیں ملاحظہ ہو ں:

اے راحم و ارحم! ہے تو ہی سب سے بُلند
اے سب سے بڑے، تجھ سے نہیں کوئی بڑا
اے والیِ کل! دیکھتا ہے تو سب کچھ
اے خالقِ جاں تو ہے سبھی کچھ سُنتا(۲۷۸)

اللہ تعالیٰ کی ذات احسن الخالقین ہونے کے قرآنی موضوع کو بھی منظؔر عارفی نے شعری سانچے میں ڈھال کر دادِ تحسین وصول کی ہے۔ انسان اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کا نائب اور شاہکار تخلیق ہے۔ اس مصورِ حقیقی نے جان ڈال کر مختلف مخلوقات کو مختلف اشکال اور حلیے عطا فرمائے ہیں۔ شعری نظائر ملاحظہ ہوں:

جاں ڈالنے والی ہے فقط ذات تِری
بِذات فقط ہے تو ہی پیدا کرتا
خلقت کو تو ہی صُورتیں دیتا ہے کریم!
رکھتا ہے گنہگاروں کا تو ہی پردہ(۲۷۹)

غفّار، قہار، وہاب، رزاق، فتاح، باسط، حافظ و حق، عزّت و ذلّت پر قادر، حاکمِ مطلق، بصیر و قیوم جیسے اسماء الحسنیٰ کو قرآنِ مجید سے مستعار لیا گیا ہے۔ قرآن میں مختلف مقامات پر ان صفاتِ باری تعالیٰ پر آیاتِ مقدسہ موجود ہیں۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ منظؔر

عارفی اپنے موضوعات قرآنِ مجید سے کشید کرتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

غفّار ہے ، قہار ہے، وہاب ہے تو
رزاق ہے ، فتاح ہے تو میرے خدا
اے قابض و اے باسط و اے حافظ و حق!
ہے عزت و ذلّت پہ ترا حکمِ رسا(۲۸۰)

منظر عارفی نے قرآنِ مجید میں بیان کردہ فلسفۂ توحید کو بھی شعری رُوپ عطا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ہمارے احوال سے باخبر ہے۔ قرآن اللہ تعالیٰ کی وحدانیّت کا مبلغ ہے۔ قرآن نے توحید کے مختلف پہلوؤں اور تقاضوں کو بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔ یوں پرستارِ توحید کے لیے اللہ تعالیٰ جلّ شانہٗ کی یکتائی کا بیان موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاخلاص میں بڑی صراحت سے ایمان کے لیے توحید کے اخلاص کا تذکرہ فرمایا ہے۔ صمد ہونا اس کی شان ہے۔ بے نیازی سے مراد، وہ وجود میں اور صفات و کمالات میں کسی کا محتاج نہیں ہے۔ اُسے کسی کے سہارے اور معاونت کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن میں ارشادِ ربِّ کریم ہے:

ترجمہ: ’’جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور جانتا ہے جو تم چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو اور اللہ دلوں کی جانتا ہے۔‘‘(۲۸۱)

ایک دوسرے مقام پر ارشادِ ذوالجلال ہے:

ترجمہ: ’’تم فرماؤ وہ اللہ ہے وہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے ؛‘‘(۲۸۲)

منظر عارفی کے ہاں اس کی شعری مثالیں ملاحظہ ہوں:

تو سب سے بڑا ، سب سے بلند و برتر
ہے علم ترا سب سے زیادہ مولا
ہر چیز سے آگاہ ، خبر دار ، اے صمد
انصاف ہے سب سے بڑا انصاف ترا (۲۸۳)

منظر عارفی نے آیت الکرسی میں بیان کردہ صفاتِ الٰہیّہ میں صفتِ ربِّ جلیل کو سُخن

کا جامہ پہنایا ہے۔خدائے بزرگ و برتر کی شان کو بڑی دلی وارفتگی سے شعری رُوپ عطا کیا گیا ہے۔قرآن بینی اور ژرف نگاہی سے موضوعات کا اختراع کر کے شعری ریاضت کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔شعر ملاحظہ ہو:

تو ہی تو شہنشاہِ حقیقی ہے کریم!
تو منبعِ اعزاز و شرف ہے مولا (۲۸۴)

قرآن کی بیان کردہ علمی اصطلاحات اوّل، آخر، ظاہر اور باطن کا فلسفہ بھی منظر عارفی نے حمدیہ قصیدے کے سپرد کیا ہے۔اوّل سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات سے پہلے کوئی نہیں تھا۔آخر سے مراد اس کے بعد اس کی انتہا نہیں وہ ہمیشہ رہنے والا ہے۔ظاہر سے مراد وہ اپنی قدرتِ کاملہ اور حکومت کے باعث کائنات کے مشاہدات میں سے ظاہر ہے۔باطن سے مراد وہ ہماری آنکھوں سے چھپا ہوا ہے اس سے زیادہ پوشیدہ کوئی نہیں مگر وہ ہماری شہ رگ سے بھی قریب ہے۔قرآن نے بڑی جامعیت سے ان موضوعات کا ذکر کیا ہے۔ارشادِ ربّانی ہے:

ترجمہ:''وہی اوّل وہی آخر وہی ظاہر وہی باطن اور وہی سب کچھ جانتا ہے۔'' (۲۸۵)

منظؔر عارفی کے ہاں اس کی شعری مثال ملاحظہ ہو:

اے اوّل، اے قادر، اے مؤخر، ظاہر
پوشیدہ و پنہاں بھی تری ذات پہ وا (۲۸۶)

منظؔر عارفی اللہ تعالیٰ کے کرم پر سپاس گزار ہے کہ اس کی عطاؤں کو رقم کرنا میرے بس کی بات نہیں۔یقیناً اس کی عطائیں ان گنت اور بے شمار ہیں جس نے آقائے دو جہاں ﷺ کی امّت میں پیدا فرمایا۔آنحضرت ﷺ کی امّت میں پیدا ہونا باعثِ شرف، باعثِ عزت و تکریم اور خاص فضلِ الٰہی ہے۔جس طرح آقائے دو جہاں تمام انبیاءِ کرام سے بزرگ و برتر ہیں اسی طرح آپ ﷺ کی اُمّت بھی تمام اُمّتوں سے عزتوں کے درجے پر فائز ہے۔شعری مثالیں ملاحظہ ہوں:

مجھ پر جو کرم ہیں ترے اے میرے خدا!
ہو سکتی نہیں مجھ سے رقم اُن کی ثنا

پھر ایک بڑا اور ملا مجھ کو شرف
امّت میں محمد کی ہوا میں پیدا(۲۸۷)

فکر اگر محراب کی مانند ہے تو فن اُس محراب پر کی گئی مینا کاری کا عکاس ہے۔ مینا و قدح مینا بدوش اور مے نوش کے مزاج کی لطافت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔فنی تجزیے سے قصیدے کے محاسن کا بخوبی ادراک ہوا ہے۔

تراکیب کا استعمال

منظؔر عارفی کے ہاں تراکیب کا استعمال بھی دیکھنے میں آیا ہے۔تراکیب پُھلجھڑیوں کی طرح فروزاں ہیں۔مرکب اضافی کی مثالیں دیکھیے: نثارِ جہاں،خواہشِ نفسانی،عبدِ خدا، مالکِ کل، خالقِ کل،رازقِ کل،ناصرِ کل،ہادیِ کل، معطیِ کل،والیِ کل،خالقِ جاں،شہنشاہِ حقیقی،لائقِ تعریف،ختمِ نبوت،شہِ جیلاں،سلطانِ مدینہ وغیرہ۔

مرکبِ عطفی کا استعمال بھی دیکھیے: فحاشی و عریانی،عزت و ذلّت،بصیر و قیوم، پوشیدہ و پنہاں وغیرہ۔

شکوہِ الفاظ

منظؔر عارفی نے قصیدے کی شان کے مطابق شکوہِ الفاظ کا استعمال کر کے قصیدے کا ادبی درجہ برقرار رکھا ہے۔شاعر سادہ الفاظ کے چناؤ کی بجائے مشکل اور ثقیل الفاظ کو اس فنی مہارت سے برتا ہے کہ کلام میں بانکپن اور طرح داری دیکھنے میں آئی ہے۔اس حوالے سے ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کی رائے ملاحظہ ہو:

> ''صوتی آہنگ اور معنوی فضا کے لحاظ سے بعض الفاظ میں ایک خاص قسم کا طمطراق اور طنطنہ جھلکتا ہے جسے اصطلاح میں شکوہِ الفاظ کہتے ہیں۔''(۲۸۸)

منظؔر عارفی کے ہاں شکوہِ الفاظ کی شعری مثال ملاحظہ ہو:

تو ہی تو شہنشاہِ حقیقی ہے کریم!
تو منبعِ اعزاز و شرف ہے مولا(۲۸۹)

عربی اثرات

اردو حمدیہ قصیدے پر عربی زبان وادب نے گہرے نقوش مرتب کیے ہیں۔ منظر عارفی نے عربی قصیدہ نگاروں کی پیروی میں اردو حمدیہ قصیدہ لکھا ہے۔قرآن اور حمد کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔دخیل الفاظ اردو میں رچ بس گئے ہیں۔عربی زبان سے ہماری مذہبی عقیدت بھی ایک بہت بڑا محرک ہے۔اکثر حمدیہ قصیدہ نگاروں نے موضوعات اور اصطلاحات قرآن سے مستعار لیے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ پاکستانی اردو حمدیہ قصیدہ نگاری پر عربی اثرات کا پایا جانا لازمی امر ہے۔منظر عارفی کے ہاں شعر ملاحظہ ہو:

یا رب! نہ پڑھے میرے قصیدوں پہ کوئی
''لا حول وَلا قوۃ اِلّا باللہ'' (۲۹۰)

ہندی اثرات

منظؔر عارفی نے لفظی اُسلوب میں اردو اور فارسی کے علاوہ ہندی الفاظ کو برت کر قصیدے کو صوتی اور معنوی آہنگ بخشا ہے۔مشرقی زبانوں کی آمیزش سے کلام میں چار چاند لگ گئے ہیں۔مشرقی زبانوں کا سنگم بھی ادبیاتِ مشرق کا اثاثہ ہے۔ہندی الفاظ کا چناؤ مزاج پر گراں نہیں گزرتا۔ان کے ہاں شعری مثال ملاحظہ ہو:

ہر دن نیا ، ہر شام نئی ، رات نئی
مامور ہے بھڑکانے میں ہستی کی چِتا (۲۹۱)

استفہامیہ لہجہ

منظؔر عارفی نے استفہامیہ لہجے سے قاری کی توجہ حاصل کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔استفہامیہ لہجہ قاری و سامعین کو متجسّس بنا کر جواب تک رسائی کا جذبہ اُجاگر کرتا ہے۔ استفہامیہ لہجے کی شعری مثال ملاحظہ ہو:

تصویر کرے اس کو مصوّر کیسے
تقریر کریں کس طرح اِس پر خُطَبا (۲۹۲)

ندائیہ لہجہ

حمدیہ قصیدہ نگاروں نے اپنے ربّ کی مدح کے بعد دعا میں اُسے پکارا بھی ہے کیوں کہ وہی ذات کو پُکارنے والے کی پُکار سُن کر مشکل کشائی کرتی ہے۔ اہلِ ایمان کا شعار رہا ہے کہ وہ غیر اللہ کا اِرتداد کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے اِستمداد طلب کرنا ہی عین ایمان سمجھتے ہیں۔ منظر عارفی نے ندائیہ لہجے کو بڑی معنوی صورت میں برت کر جذبے کی شدّت سے قصیدے کی فنّی بُنت کو پُر اثر بنا دیا ہے۔ منظؔر عارفی کے قصیدے میں ندائیہ لہجے کا حامل شعر ملاحظہ ہو:

یہ چھوٹی سی کاوِش ہو قبول اے مالک!
اب لاج ترے ہاتھ ہے میری ، مولا (۲۹۳)

صنعتِ تکرار

کلام میں لفظوں کے دوہرانے کا عمل صنعتِ تکرار کہلاتا ہے۔ اس کا استعمال کلام میں ترنم اور تاثیر پیدا کرتا ہے۔ قاری اور سامع پر خوش گوار اور پُر زور تاثر جاتا ہے۔ پروفیسر نذیر احمد لکھتے ہیں:

''لفظوں کے تکرار سے کلام میں زور، تاثیر یا حسن پیدا کرنا۔'' (۲۹۴)

منظؔر عارفی کے ہاں صنعتِ تکرار کی شعری مثال ملاحظہ ہو:

تاریکیوں نے جنگ نہ کی بند کبھی
جیتی رہی مر مر کے زلیخائے ضیا (۲۹۵)

صنعتِ تضاد

جو الفاظ ایک دوسرے کے اُلٹ یا ضد ہوں صنعتِ تضاد یا طباق کہلاتے ہیں۔ اس کی دو اقسام ہیں۔ ایجابی اور سلبی۔ طباقِ ایجابی کی مثال منظر عارفی کے حمدیہ قصیدے میں پائی گئی ہے۔ طباقِ ایجابی میں الفاظ متضاد کے ساتھ حرف نفی کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ جیسے: دن رات وغیرہ۔

تو ہی نے مجھے بخشا ہے اس کا بھی شعور
میں جانتا ہوں اچھی طرح ، اچھا بُرا(۲۹۶)

تخلیق کے لیے مشاہدے، مطالعے، فکر کی گہرائی و گیرائی اور جذبات کی شدّت کلیدی کردار ادا کرتی ہے جب کہ فن تعمیری عمل اور تخلیقی تجربے کا نام ہے۔ساخت اور تکنیک کی عمدگی سے ہی دل کش تخلیق وقوع پذیر ہوتی ہے۔منظؔر عارفی کا حمدیہ قصیدہ ہر دو پہلوؤں سے قصیدے کے آہنگ کے مطابق ہے۔صنائع بدائع اور علمِ بیان و بدیع کا شاہکار ہے۔

عباس علی شاہ ثاقبؔ

عباس علی شاہ ثاقبؔ (راقم) تعلق حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر کے شہر سے ہے۔میں نے گریجویشن کی ڈگری گورنمنٹ فریدیہ پوسٹ گریجوایٹ کالج پاک پتن سے پاس کی۔ایم اے اردو کا امتحان ۲۰۱۴ء میں سرگودھا یونی ورسٹی سے پاس کیا۔میں نے بی۔ایڈ کی ڈگری علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی سے ۲۰۱۴ء میں پاس کی۔۲۰۱۵ء میں بطور ای ایس ای آرٹس ایجوکیٹر محکمہ ایجوکیشن میں تعیناتی ہوئی مگر حصولِ علم کے شوق سے ۲۰۱۸ء میں ایم اے فزیکل ایجوکیشن کا امتحان پاس کیا۔اب رفاہ انٹرنیشنل یونی ورسٹی، فیصل آباد کیمپس سے ایم فل اردو کر رہا ہے۔

’’پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری‘‘ کے عنوان سے ڈاکٹر ریاض مجید کی نگرانی میں تحقیقی مقالہ لکھ رہا ہوں۔حمد، نعت، منقبت، غزل، تبصرہ جات، تنقیدی اور تحقیقی مضامین ملک کے مختلف شہروں سے شائع ہونے والے رسائل میں چھپ رہے ہیں۔میرا کلام ملک کے معروف رسائل و جرائد ’’مفاہیم، فن زاد، غنیمت، نیرنگِ خیال، نالۂ دل، المسعود اور اظہار میں شائع ہو چکا ہے۔ایک تحقیقی مضمون ’’حضرت بابا فرید اور پاک پتن کی اردو شاعری کی روایت ‘‘ کے عنوان سے بھی شائع ہو چکا ہے۔دیوانِ یونس فریدی (تقدیم و تدوین) از، ارشد ملک میں ’’کچھ مصنف کے بارے میں‘‘ کے عنوان سے مضمون اور اسی کتاب کا فلیپ بھی لکھا ہے۔پاکپتن کے شاعر جمشید کمبوہ کے پنجابی شعری مجموعے ’’سوچ سویر‘‘ پر جمشید کمبوہ۔ڈکشن

اور فنی مہارت‘ کے عنوان سے تنقیدی مضمون بھی لکھا ہے۔ ساہیوال کے افسانہ نگار اسلم سحاب ہاشمی کے افسانوی مجموعے ’’ہم سب افسانہ ہیں‘‘ پر ’اسلم سحاب کے افسانوں میں اسلامی ثقافت کی پیش کش‘ کے عنوان سے تنقیدی مضمون بھی المسعود میں شائع ہو چکا ہے۔ محمد ندیم صادق (لیکچرار اُردو) کے شعری مجموعے ’’جگر خوں کروں ہوں میں‘‘ کی تقریبِ رونمائی کے موقع پر ’اُداسیاں گونجتی ہیں‘ کے عُنوان سے تنقیدی مضمون پڑھا۔ تحقیق و تنقید اور تبصرہ جات پر مبنی مضامین کا مجموعہ ’’مقالاتِ ثاقب‘‘ کے عُنوان سے زیرِ ترتیب ہے۔

ڈاکٹر نوید عاجز اور شریف ساجد سے مشورۂ سخن کرتا ہوں۔ مجھے فروغِ نعت کی ادبی تنظیم ’’اظہارِ نَو‘‘ کا فنانس سیکرٹری ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ میرا پہلا شعری مجموعہ ’’شہابِ ثاقب‘‘ زیرِ ترتیب ہے جوان شاء اللہ جلد منصۂ شہود پر آیا چاہتا ہے۔

راقم کے ہاں بھی تین غیر مطبوعہ اردو حمدیہ قصائد موجود ہیں۔ جو ’’حمدیہ قصیدہ درِ باری تعالیٰ جلّ شانہ‘‘، ’’قصیدۂ نُورِ توحید‘‘، حمدیہ قصیدہ ثنائے ربِّ ذوالجلال‘‘ کے عُنوان سے معنون ہیں۔ میں نے استفہامیہ انداز میں تشبیب لکھ کر انسانی ذہن وفکر کو جھنجوڑا ہے تا کہ اس طرح سے فکر کی جہات کو نئے قالب میں ڈھال کر تدبّر و تفکّر کو جلا بخشی جا سکے۔ اس اندازِ فکر سے دلائلِ توحید کی فضا پیدا کی گئی ہے۔ تا کہ اس کائنات اور اس میں پھیلی اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کے مشاہدے سے رموزِ توحید وصفاتِ الٰہیّہ کا ادراک ہو سکے۔ غیر اللہ کا ارتداد اور رجوع الی اللہ کی رغبت دلانے کی سعی کی گئی ہے۔ افلا ینظرون، افلا یتفکّرون اور افلا یتدبّرون کے مصداق غور وفکر کی نُورانی چھڑی سے متلاشیِ حق ہوں۔ یہ کائنات اور اس میں موجود مظاہر اپنے خالق کا پتہ دیتے ہیں۔ تشبیب کو استفہامیہ لہجے میں پیش کیا گیا ہے۔ قصیدے کی تمہید میں عشقیہ مضامین کے بجائے سوچ و بچار کی تاروں کو چھیڑ کر کائنات کے پنہاں رازوں سے اللہ تعالیٰ کی شان کے کرشموں کے اِدراک کی سعی کی گئی ہے۔ چند اشعار آپ قارئین کی نذر کرتا ہوں جس سے آپ قصائد کے بارے میں اندازہ کر سکتے ہیں۔ تشبیب کے مطالع کے اشعار ملاحظہ ہوں:

چلو یہ پوچھتے ہیں کہکشاں سے
محبّت ہے تجھے کس آستاں سے؟ (۲۹۷)

بھلا کون ہے دو جہاں کی حقیقت؟
دلوں پر بھلا ہے یہ کس کی حکومت؟(۲۹۸)

بھلا کس نام سے ملتی شفا ہے؟
بھلا کس نام سے ملتی ضیا ہے؟(۲۹۹)

قارئین کے ذوق کی نذر گریز کے اشعار پیش کرتا ہوں۔مثالیں ملاحظہ ہوں:

ازل سے جس کا مادح ہے زمانہ
ہے اس کی حمد جاری اب زباں سے (۳۰۰)

میں اس ذاتِ اقدس کا واصف ہوں ، جس کا
تصرف زمیں پر ، فلک پر حکومت (۳۰۱)

مری اس نام سے ہی ابتدا ہے
اکیلا ہی جو خلقت کا خدا ہے (۳۰۲)

میں نے اردو حمدیہ قصیدے کے موضوعات کو قرآن،نصوصِ شرعیہ اور گہرے جذبات و احساسات پر اُستوار کیا ہے۔توحید،صفات و افعال،صفاتِ الٰہیّہ،تکوینی دلائل، مظاہر فطرت، شب و روز، دعوتِ غور و فکر، جلالتِ الٰہی اور تسبیح وتحمید جیسے موضوعات مدح کی زینت بنائے ہیں۔قوّتِ خداوندی، رحمت ومغفرت، خلاقی وقدرت، عظمت ورفعت، بروج وشہابِ ثاقب، گردشِ لیل ونہار اور غیب وشہادت جیسے موضوعات سے حمدیہ قصیدے کا چمن معطّر کیا ہے۔نمونے کے طور پر مدح کے چند اشعار قارئین کی نذر کرتا ہوں۔اشعار دیکھیے:

ہوا ذکرِ خدا جاری زباں سے
کیا محفوظ یوں رب نے زیاں سے (۳۰۳)

ہے الحمدللہ! خدا کی عنایت
میسر نبی اور اُس کی شریعت (۳۰۴)

مرے مولا تُو ہی مشکل کشا ہے
مرے مولا تُو ہی حاجت روا ہے (۳۰۵)

میرے حمدیہ قصائد میں چاروں ارکانِ قصیدہ کے علاوہ دوغزلیات بھی قصائد میں شامل ہیں۔قصائد میں پائی جانے والی غزلیات سے ایک ایک شعر قارئین کے ذوقِ مطالعہ کی نذر کرتا ہوں۔اشعاد یکھیے:

یہ پل دو پل نہیں رکتی گھڑی جو
ملائے گی کبھی جانِ جہاں سے(۳۰۶)

تری آرزو میں بپا ہے قیامت
جھلک اک تری ہو یہی ہے سعادت (۳۰۷)

حمدیہ قصائد میں دعا یاحسنِ طلب کو بھی شامل کیا گیا ہے۔قارئین نمونے کے طور پر دعا کیا شعار ملاحظہ ہوں:

تجھے اب مصطفیٰ کا واسطہ ہے!
بچا لینا خُدایا! ہر خزاں سے (۳۰۸)
الٰہی! یہ شوقِ قصیدہ نگاری
مرے واسطے حشر کی ہو بضاعت(۳۰۹)

کلام میں اُسلوب کی رعنائی، ہیئت کی پاس داری کے جتن،صحتِ زبان اور محاکات نگاری لب و لہجے کو جلا بخشتی ہے۔زبان و بیان کی چاشنی،تراکیب کے استعمال اور صنائع لفظی و معنوی کی بُنت سے قصیدے کی تخلیقی استعداد کو تازگی ملتی ہے۔پاکستانی اردو حمدیہ قصیدہ نگاری ان خصائص سے مملو ہے۔

راقم کے لیے یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ دوران تحقیق اور بے شمار کتابوں کے

مطالعہ کرتے ہوئے قصیدے کا گمان ہوتا تھا۔اس سے ایک بات یہ واضح ہوئی کہ دورِ جدید میں بعض طویل حمدیہ نظمیں بھی قصائد کے ذیل میں رکھی جاسکتی ہیں کہ ان کی بعض شکلیں یا بعض ہیئتیں قصیدے کی صورت میں ہیں۔روایتی طور پر قصیدے کے جو چار حصّے ہوتے تھے یعنی پہلا حصّہ تشبیب، دوسرا گریز، تیسرا مدح اور آخر میں دعا ہوتی تھی۔دورِ حاضر میں طویل حمدیہ نظموں میں ان باتوں کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ویسے ہم نے دیکھا ہے کہ ذوقؔ کے اور دوسرے بھی کئی قصیدوں میں یہ روایت کے چاروں درجے نہیں ملتے۔بعض اساتذہ نے پہلے شعر سے ہی قصیدے کا آغاز کر دیا تھا اور حمد والے حصّے کو زیادہ غالب جانا تھا۔گریز اور تشبیب کو ختم کر دیا تھا۔چوں کہ جدید دور میں ہمیں جو قصیدے ملے ہیں ان کی ملی جلی بہت ساری شکلیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔اس میں کچھ ایسی غزل کی ہیئت میں لکھی گئی حمدیہ نظمیں یا حمد بھی ان میں شامل ہیں جو روایتی معنوں میں تو قصیدہ نہیں کہلاتیں لیکن ان میں گمان ہوتا ہے ایسے میں کچھ میرے پاس وہ بھی نمونے ہیں تو وہ میں یہاں ان میں سے کچھ نمونے درج کر رہا ہوں۔ویسے بھی ہمارے ہاں اردو کی جو تین سو سالہ قصیدے کی روایت ہے اس میں عمومی طور قصیدے کے چاروں ارکان کی پیروی کرتے ہوئے ہی قصیدے لکھے گئے ہیں اور بعض مدحیہ قصائد بھی ملتے ہیں۔موجودہ زمانے میں بہت کم لوگوں نے کلاسیکی اور روایتی درجہ بندی کو قبول کیا ہے۔یہ قصیدے کے ہاتھ پاؤں کاٹنے کے مترادف ہے۔عام طور پر پہلے شعر سے ہی مدح کا آغاز دیکھنے میں آیا ہے۔مجھے اپنے تجسّس میں اور اسکالرشپ کے درمیان میں بہت سارے قصیدے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔مجھے اس کی کئی ملی جلی شکلیں نظر آئی ہیں تو اس کی بھی ضمناً نشان دہی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس میں حمدیہ اظہار اور خیالات تو ہیں لیکن قصیدے کی روایتی شکل ان میں ہمیں نظر نہیں آتی۔اب جو اس دور میں قصیدہ ہے وہ یا تو کہیں کہیں روایتی شکل میں ہے یا عام طور پر طویل نظم کی شکل میں ہے۔جو یک کتابی نظمیں لکھی گئی ہیں ان کے اندر ہم ان کو قصیدہ کہہ سکتے ہیں۔یہ بات بھی واضح ہے کہ بہت ساری چیزیں قصیدے کے نام پر شائع نہیں ہوئیں۔وہ نظم یا کتابی نظموں کے طور پر طویل نظمیں ہیں لیکن ان کو بھی قصیدے میں رکھا جاسکتا ہے کہ قصیدہ اپنی دلالتِ وضعی میں اور اپنے مزاج میں ایک طویل نظم کی خاصیّت بھی رکھتا ہے۔میں یہ سمجھتا ہوں کہ قصداً اور روایتی ہیئت کی اتباع میں لکھا گیا کلام ہی قصیدہ

ہوتا ہے۔صنفی شناخت اور ہیئتی تشکیل میں اس کی شان ہے۔عربوں کے ہاں بھی تاریخ یہی ہے کہ اس کے لیے قصد ہونا ضروری ہے کہ میں شعر لکھ رہا ہے۔

ناصر ملک نے اپنے شعری مجموعے(لایموت)میں اللہ جلَّ شانہٗ کے ننانوے اسمائے الحسنٰی پر ننانوے حمدیں لکھیں ہیں جس میں ہر نظم کا ردیف بالترتیب اسماء الحسنٰی پر مشتمل ہے۔کیوں کہ قصیدہ ہیئت کا متقاضی ہے جب کہ یہ قصیدے کی مروجہ ہیئت میں نہیں ہے اس لیے حمدیہ قصیدہ نہیں ہے محض طوالت ہی قصیدے کی شرط نہیں۔تاہم یہ طویل حمدیہ نظم کہہ سکتے ہیں۔نمونے کے طور پر مثال ملاحظہ ہو:

بسمِ ربِ ذوالجلال اللہ اللہ
پیش ہے فکر و خیال اللہ اللہ(۳۱۰)

حسن عباسی نے اپنے حمدیہ مجموعے(سائیں) میں پانچ طویل حمدیہ نظمیں لکھ کر اردو حمدیہ شاعری میں عمدہ اضافہ کیا ہے۔پانچوں حمدیہ نظمیں ہی سوسو شعروں پر مشتمل ہیں۔یوں حسن عباسی کا یہ حمدیہ مجموعہ پانچ سو شعروں پر مشتمل ہے۔پہلی حمد ۱۰۰ شعروں پر مشتمل ہے۔جس کا مطلع یوں ہے:

اپنی منّت گزاریاں سائیں
تیری سب ڈیرہ داریاں سائیں(۳۱۱)

پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کی روایت میں خاتون حمدیہ قصیدہ نگار نہیں مل سکی تاہم حمیدہ کشش بانو کی ۲۰۲۱ء میں ربِّ کائنات کے نام سے کتاب شائع ہوئی جو ۳۰۰ شعروں پر مشتمل حمدیہ کلام ہے۔اس طویل حمدیہ کلام کو شاعر علی شاعرؔ نے فلیپ پر غلطی سے حمدیہ قصیدہ قرار دیا ہے۔اسے صنفی اور ہیئتی اعتبار سے حمدیہ قصیدہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔یوں پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدے کی روایت خواتین کی شراکت سے خالی ہے۔

علیم النساء ثناؔء کے مجموعہ حمد (تری ہی حمد و ثناء) میں صفحہ نمبر ۱۲ تا صفحہ نمبر ۲۶ تک طویل حمدیہ کلام موجود ہے مگر وہ حمدیہ قصیدہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔اسی طرح ’’اسمائے الحسنٰی‘‘ (منظوم ترجمہ)۵۰ صفحات پر مشتمل ہے مگر قصیدہ نہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ www.tareekhepakistan.com
۲۔ عبدالعزیز خالدؔ: ''منحمنا'' بک لینڈ، کراچی، ۱۹۶۶ء، ص ۸۹
۳۔ ایضاً، ص ۹۰
۴۔ ایضاً، ص ۹۱
۵۔ ایضاً، ص ۹۱
۶۔ ایضاً، ص ۹۲
۷۔ ایضاً، ص ۹۳
۸۔ القرآن الحکیم: البقرۃ: آیات ۲۵۵
۹۔ عبدالعزیز خالد: ''منحمنا'' ص ۹۴
۱۰۔ القرآن الحکیم: النور: آیات ۳۵
۱۱۔ عبدالعزیز خالد: ''منحمنا'' ص ۹۵
۱۲۔ القرآن الحکیم: النمل: ۶۲
۱۳۔ عبدالعزیز خالد: ''منحمنا'' ص ۹۵
۱۴۔ القرآن الحکیم: آلِ عمران: آیات ۸
۱۵۔ عبدالعزیز خالد: ''منحمنا'' ص ۹۷
۱۶۔ القرآن الحکیم: آلِ عمران: آیات ۳۱
۱۷۔ عبدالعزیز خالد: ''منحمنا'' ص ۹۷
۱۸۔ ایضاً، ص ۱۰۲
۱۹۔ القرآن الحکیم: القلم: آیات ۱
۲۰۔ عبدالعزیز خالد: ''منحمنا'' ص ۱۰۳
۲۱۔ القرآن الحکیم: یونس: آیات ۹۳
۲۲۔ عبدالعزیز خالد: ''منحمنا'' ص ۱۰۴

۲۳۔ القرآن الحکیم: المومنون: آیات ۱۱۸
۲۴۔ عبدالعزیز خالد: ''منحمنا'' ص ۱۰۸
۲۵۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی: ''تفہیم و تحسینِ شعر'' سنگت پبلشر، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۸۸
۲۶۔ عبدالعزیز خالد: ''منحمنا'' ص ۹۳
۲۷۔ ایضاً، ص ۹۶
۲۸۔ ایضاً، ص ۱۰۱
۲۹۔ ایضاً، ص ۹۴
۳۰۔ ایضاً، ص ۱۰۳
۳۱۔ ایضاً، ص ۸۹
۳۲۔ ایضاً، ص ۱۰۸
۳۳۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی: ''کشاف تنقیدی اصطلاحات'' مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔ ۱۹۸۵ء، ص ۴۷
۳۴۔ عبدالعزیز خالد: ''منحمنا'' ص ۹۱
۳۵۔ پروفیسر نذیر احمد: ''اقبال کے صنائع بدائع'' آئینہ ادب، چوک مینار انارکلی لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۱۰۵
۳۶۔ عبدالعزیز خالد: ''منحمنا'' ص ۹۰
۳۷۔ ایضاً، ص ۹۸
۳۸۔ www.girdopesh.com
۳۹۔ ظفر عباس نقوی و عنیزہ برجیس (مرتبین): ''کلیاتِ اصغر علی شاہ'' پیلوں پبلی کیشنز، ملتان، ۲۰۱۲ء ص ۱
۴۰۔ ایضاً، ص ۱
۴۱۔ القرآن الحکیم: اخلاص: آیات ۴۔۳۔۲۔۱
۴۲۔ ظفر عباس نقوی و عنیزہ برجیس (مرتبین): ''کلیاتِ اصغر علی شاہ'' ص ۱
۴۳۔ القرآن الحکیم: آلِ عمران: آیت ۱۸۹

۴۴۔ ظفر عباس نقوی و عنیزہ برجیس (مرتبین): ''کلیاتِ اصغر علی شاہ'' ص ۱
۴۵۔ القرآن الحکیم: الاعراف: آیت ۵
۴۶۔ ظفر عباس نقوی و عنیزہ برجیس (مرتبین): ''کلیاتِ اصغر علی شاہ'' ص ۲
۴۷۔ ایضاً، ص ۶۴
۴۸۔ القرآن الحکیم: البقرہ: آیت ۳۰
۴۹۔ ظفر عباس نقوی و عنیزہ برجیس (مرتبین): ''کلیاتِ اصغر علی شاہ'' ص ۲
۵۰۔ ایضاً، ص ۲
۵۱۔ القرآن الحکیم: العلق: آیات ۳۔۴۔۵
۵۲۔ ظفر عباس نقوی و عنیزہ برجیس (مرتبین): ''کلیاتِ اصغر علی شاہ'' ص ۳
۵۳۔ ایضاً، ص ۳
۵۴۔ ایضاً، ص ۱
۵۵۔ ایضاً، ص ۱
۵۶۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی: ''تفہیم و تحسینِ شعر'' ص ۸۸
۵۷۔ ظفر عباس نقوی و عنیزہ برجیس (مرتبین): ''کلیاتِ اصغر علی شاہ'' ص ۳
۵۸۔ ایضاً، ص ۳
۵۹۔ پروفیسر نذیر احمد: ''اقبال کے صنائع بدائع'' ص ۴۸
۶۰۔ ظفر عباس نقوی و عنیزہ برجیس (مرتبین): ''کلیاتِ اصغر علی شاہ'' ص ۱
۶۱۔ رحمت یوسف زئی: ''اردو شاعری میں صنائع و بدائع'' کمپیوٹر کارپوریشن، حیدر آباد، ۲۰۰۳ء، ص ۲۹۹۔۳۰۰
۶۲۔ ظفر عباس نقوی و عنیزہ برجیس (مرتبین): ''کلیاتِ اصغر علی شاہ'' ص ۱
۶۳۔ www.rekhta.com
۶۴۔ ساحر لکھنوی: ''صحیفہ مدحت'' آثار و افکار اکادمی، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۶۷
۶۵۔ ساحر لکھنوی: ''صحیفہ مدحت'' ص ۶۷
۶۶۔ القرآن الحکیم: الاخلاص: آیت ۲

۶۷۔ ساحرؔ لکھنوی: ''صحیفہ مدحت'' ص ۶۸

۶۸۔ ایضاً، ص ۶۸

۶۹۔ ایضاً، ص ۶۹

۷۰۔ القرآن الحکیم: البروج: آیت ۱۲

۷۱۔ ساحرؔ لکھنوی: ''صحیفہ مدحت'' ص ۷۱

۷۲۔ القرآن الحکیم: آلِ عمران: آیت ۳۲

۷۳۔ ساحرؔ لکھنوی: ''صحیفہ مدحت'' ص ۷۱

۷۴۔ القرآن الحکیم: آلِ عمران: آیت ۱۸۹

۷۵۔ ساحرؔ لکھنوی: ''صحیفہ مدحت'' ص ۷۰

۷۶۔ القرآن الحکیم: النساء: آیت ۱

۷۷۔ ساحرؔ لکھنوی: ''صحیفہ مدحت'' ص ۷۳

۷۸۔ ایضاً، ص ۷۲

۷۹۔ ایضاً، ص ۶۷

۸۰۔ ایضاً، ص ۶۸

۸۱۔ سیّد عابد علی عابدؔ: ''اصول انتقادِ ادبیات'' سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۲۶۳

۸۲۔ ساحرؔ لکھنوی: ''صحیفہ مدحت'' ص ۶۹

۸۳۔ ایضاً، ص ۶۷

۸۴۔ ایضاً، ص ۶۸

۸۵۔ غلام علی وفاؔ، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: مقالہ نگار

۸۶۔ ایضاً

۸۷۔ ایضاً

۸۸۔ ایضاً

۸۹۔ القرآن الحکیم: العلق: آیات ۳۔۴۔۵

۹۰۔ غلام علی وفاؔ، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: مقالہ نگار

نوٹ: مصرع ثانی میں ''خلق'' کی ''لام'' کو متحرک باندھا گیا ہے جس سے قیاسِ مخالفتِ لغوی کا سقم واقع ہوا ہے۔

۹۱۔ القرآن الحکیم: مریم: آیت ۴۳
۹۲۔ غلام علی وفا، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: مقالہ نگار
۹۳۔ ایضاً
۹۴۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی: ''تفہیم و تحسینِ شعر'' ص ۸۸
۹۵۔ غلام علی وفا، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: مقالہ نگار
۹۶۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی: ''کشاف تنقیدی اصطلاحات'' ص ۴۷
۹۷۔ غلام علی وفا، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: مقالہ نگار
۹۸۔ ایضاً
۹۹۔ پروفیسر نذیر احمد: ''اقبال کے صنائع بدائع'' ص ۱۰۵
۱۰۰۔ غلام علی وفا، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: مقالہ نگار
۱۰۱۔ مولوی نجم الغنی: ''بحر الفصاحت''، مرتبہ، سیّد قدرت نقوی، ج ۷۔۶، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۴۴۱
۱۰۲۔ غلام علی وفا، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: مقالہ نگار
۱۰۳۔ ایضاً
۱۰۴۔ خالد احمد، بیاض (ماہ نامہ)، لاہور، اکتوبر ۲۰۱۰ء، ص ۱۱
۱۰۵۔ القرآن الحکیم: المومنون: آیت ۱۴
۱۰۶۔ خالد احمد، بیاض (ماہ نامہ) ص ۱۴
۱۰۷۔ ایضاً، ص ۱۳
۱۰۸۔ القرآن الحکیم: الاحزاب: آیت ۷۲
۱۰۹۔ خالد احمد، بیاض (ماہ نامہ) ص ۱۴
۱۱۰۔ القرآن الحکیم: طٰہٰ: آیت ۱۱۰
۱۱۱۔ خالد احمد، بیاض (ماہ نامہ) ص ۱۲

۱۱۲۔ ایضاً،ص۱۳
۱۱۳۔ القرآن الحکیم :ق: آیت ۱۶
۱۱۴۔ خالد احمد، بیاض (ماہ نامہ) ص۱۴
۱۱۵۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی: ''تفہیم و تحسینِ شعر'' ص۸۸
۱۱۶۔ خالد احمد، بیاض (ماہ نامہ) ص۱۱
۱۱۷۔ ایضاً،ص۱۳
۱۱۸۔ ایضاً،ص۱۲
۱۱۹۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی: ''کشاف تنقیدی اصطلاحات'' ص۴۷
۱۲۰۔ بیاض (ماہ نامہ)، اکتوبر ۲۰۱۰ء، لاہور، ص۱۱
۱۲۱۔ پروفیسر نذیر احمد: ''اقبال کے صنائع بدائع'' ص۲۷
۱۲۲۔ خالد احمد، بیاض (ماہ نامہ) ص۱۳
۱۲۳۔ پروفیسر نذیر احمد: ''اقبال کے صنائع بدائع'' ص۱۰۵
۱۲۴۔ خالد احمد، بیاض (ماہ نامہ) ص۱۴
۱۲۵۔ مولوی نجم الغنی: ''بحر الفصاحت''، مرتبہ، سیّد قدرت نقوی، ج ۷۔۶، ص۱۴۴
۱۲۶۔ خالد احمد، بیاض (ماہ نامہ) ص۱۳
۱۲۷۔ پروفیسر نذیر احمد: ''اقبال کے صنائع بدائع'' ص۱۰۸
۱۲۸۔ خالد احمد، بیاض (ماہ نامہ) ص۱۴
۱۲۹۔ پروفیسر نذیر احمد: ''اقبال کے صنائع بدائع'' ص۸۴
۱۳۰۔ خالد احمد، بیاض (ماہ نامہ) ص۱۲
۱۳۱۔ پروفیسر نذیر احمد: ''اقبال کے صنائع بدائع'' ص۶۳
۱۳۲۔ خالد احمد، بیاض (ماہ نامہ) ص۱۳
۱۳۳۔ ایضاً،ص۱۲
۱۳۴۔ پروفیسر نذیر احمد: ''اقبال کے صنائع بدائع'' ص۴۸
۱۳۵۔ خالد احمد، بیاض (ماہ نامہ) ص۱۳

۱۳۶۔ ریاض مجید: ''کلیاتِ نعت'' ماہوزا، فیصل آباد، ۲۰۱۹ء، ص ۶۵۷

۱۳۷۔ ایضاً، ص ۸۱۱

۱۳۸۔ القرآن الحکیم: الحشر: آیت ۲۲

۱۳۹۔ ریاض مجید: ''کلیاتِ نعت'' ص ۶۵۸

۱۴۰۔ ایضاً، ص ۸۱۱

۱۴۱۔ القرآن الحکیم: الفرقان: آیت ۶۱

۱۴۲۔ القرآن الحکیم: النباء: آیت ۱۳

۱۴۳۔ ریاض مجید: ''کلیاتِ نعت'' ص ۸۱۱

۱۴۴۔ القرآن الحکیم: الصٰفٰت: آیت ۶

۱۴۵۔ ریاض مجید: ''کلیاتِ نعت'' ص ۸۱۲

۱۴۶۔ القرآن الحکیم: البقرۃ: آیت ۲۸۶

۱۴۷۔ ریاض مجید: ''کلیاتِ نعت'' ص ۸۱۶

۱۴۸۔ ایضاً، ص ۶۵۸

۱۴۹۔ ایضاً، ص ۶۵۹

۱۵۰۔ ایضاً، ص ۶۶۶

۱۵۱۔ ایضاً، ص ۶۶۸

۱۵۲۔ القرآن الحکیم: الشوریٰ: آیت ۲۵

۱۵۳۔ ریاض مجید: ''کلیاتِ نعت'' ص ۶۷۳

۱۵۴۔ ایضاً، ص ۸۱۹

۱۵۵۔ القرآن الحکیم: النور: آیت ۳۵

۱۵۶۔ ریاض مجید: ''کلیاتِ نعت'' ص ۸۱۵

۱۵۷۔ القرآن الحکیم: الانعام: آیت ۵۴

۱۵۸۔ ریاض مجید: ''کلیاتِ نعت'' ص ۶۷۶

۱۵۹۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی: ''تفہیم وتحسینِ شعر'' ص ۸۸

۱۶۰۔ ریاض مجید: ''کلیاتِ نعت'' ص ۶۵۷

۱۶۱۔ ایضاً، ص ۸۱۴

۱۶۲۔ ایضاً، ص ۶۵۷

۱۶۳۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی: ''کشاف تنقیدی اصطلاحات'' ص ۴۷

۱۶۴۔ ریاض مجید: ''کلیاتِ نعت'' ص ۶۶۰

۱۶۵۔ پروفیسر نذیر احمد: ''اقبال کے صنائع بدائع'' ص ۷۶

۱۶۶۔ ریاض مجید: ''کلیاتِ نعت'' ص ۸۱۲

۱۶۷۔ پروفیسر نذیر احمد: ''اقبال کے صنائع بدائع'' ص ۱۰۸

۱۶۸۔ ریاض مجید: ''کلیاتِ نعت'' ص ۶۷۵

۱۶۹۔ مولوی نجم الغنی: ''بحر الفصاحت''، مرتب: سیّد قدرت نقوی، ج ۷۔۶، ص ۱۴۴

۱۷۰۔ ریاض مجید: ''کلیاتِ نعت'' ص ۸۲۲

۱۷۱۔ پروفیسر نذیر احمد: ''اقبال کے صنائع بدائع'' ص ۱۰۵

۱۷۲۔ ریاض مجید: ''کلیاتِ نعت'' ص ۶۶۸

۱۷۳۔ ایضاً، ص ۸۲۱

۱۷۴۔ ریاض مجید، ڈاکٹر، حمدیہ قصیدہ از حافظ لدھیانوی: ''معراجِ سفر'' شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۷

۱۷۵۔ نوید عاجز، حمدیہ قصیدہ، مشمولہ: ''جہانِ حمد نعت'' (کتابی سلسلہ) نعت اکادمی جموں و کشمیر، مدیر ڈاکٹر جوہر قدوسی، جولائی ۲۰۲۳ء، ص ۲۶۰

۱۷۶۔ ایضاً

۱۷۷۔ ایضاً۔ ص ۲۶۱

۱۷۸۔ ایضاً۔ ص ۲۶۳

۱۷۹۔ القرآن الحکیم: الفاتحہ: آیت ۱

۱۸۰۔ نوید عاجز، حمدیہ قصیدہ، مشمولہ: ''جہانِ حمد نعت'' (کتابی سلسلہ) نعت اکادمی جموں و کشمیر، مدیر ڈاکٹر جوہر قدوسی، جولائی ۲۰۲۳ء، ص ۲۶۱

۱۸۱۔ القرآن الحکیم: الملک:۴۔آیت ۳

۱۸۲۔ نوید عاجز، حمد یہ قصیدہ، مشمولہ: ''جہانِ حمد نعت'' (کتابی سلسلہ) نعت اکادمی جموں و کشمیر، مدیر ڈاکٹر جوہر قدوسی، جولائی ۲۰۲۳ء، ص ۲۶۲

۱۸۳۔ ایضاً

۱۸۴۔ القرآن الحکیم: الاعراف: آیت ۱۸۰

۱۸۵۔ نوید عاجز، حمد یہ قصیدہ، مشمولہ: ''جہانِ حمد نعت'' (کتابی سلسلہ) نعت اکادمی جموں و کشمیر، مدیر ڈاکٹر جوہر قدوسی، جولائی ۲۰۲۳ء، ص ۲۶۲

۱۸۶۔ القرآن الحکیم: حٰم السجدۃ: آیت ۱۲

۱۸۷۔ القرآن الحکیم: بنی اسرائیل: آیت ۴۴

۱۸۸۔ نوید عاجز، حمد یہ قصیدہ، مشمولہ: ''جہانِ حمد نعت'' (کتابی سلسلہ) نعت اکادمی جموں و کشمیر، مدیر ڈاکٹر جوہر قدوسی، جولائی ۲۰۲۳ء، ص ۲۶۴

۱۸۹۔ ایضاً ۲۶۴

۱۹۰۔ القرآن الحکیم: الزمر: آیت ۶۲

۱۹۱۔ ایضاً: طٰہٰ: ۵

۱۹۲۔ نوید عاجز، حمد یہ قصیدہ، مشمولہ: ''جہانِ حمد نعت'' (کتابی سلسلہ) نعت اکادمی جموں و کشمیر، مدیر ڈاکٹر جوہر قدوسی، جولائی ۲۰۲۳ء، ص ۲۶۲

۱۹۳۔ القرآن الحکیم: التین: آیت ۲

۱۹۴۔ نوید عاجز، حمد یہ قصیدہ، مشمولہ: ''جہانِ حمد نعت'' (کتابی سلسلہ) نعت اکادمی جموں و کشمیر، مدیر ڈاکٹر جوہر قدوسی، جولائی ۲۰۲۳ء، ص ۲۶۴

۱۹۵۔ ایضاً۔ص ۲۶۳

۱۹۶۔ ایضاً۔ص ۲۶۳

۱۹۷۔ ایضاً۔ص ۲۶۲

۱۹۸۔ مولانا محمد رفیع: ''معانی و بیان'' لالہ رام دیال اگروالہ، الہ آباد، ۱۹۳۰ء، ص ۴۹

۱۹۹۔ نوید عاجز، حمد یہ قصیدہ، مشمولہ: ''جہانِ حمد نعت'' (کتابی سلسلہ) نعت اکادمی جموں و

کشمیر، مدیر ڈاکٹر جوہر قدوسی، جولائی ۲۰۲۳ء، ص ۲۶۵

۲۰۰۔ پروفیسر نذیر احمد: ''اقبال کے صنائع بدائع''ص ۱۰۵

۲۰۱۔ نوید عاجز، حمدیہ قصیدہ، مشمولہ: ''جہانِ حمد نعت'' (کتابی سلسلہ) نعت اکادمی جموں وکشمیر، مدیر ڈاکٹر جوہر قدوسی، جولائی ۲۰۲۳ء، ص ۲۶۳

۲۰۲۔ ایضاً۔ص ۲۶۳

۲۰۳۔ مولوی نجم الغنی: ''بحر الفصاحت'' (مرتب): سیّد قدرت نقوی، ج ۷۔ ۶، ص ۱۴۴

۲۰۴۔ نوید عاجز، حمدیہ قصیدہ، مشمولہ: ''جہانِ حمد نعت'' (کتابی سلسلہ) نعت اکادمی جموں و کشمیر، مدیر ڈاکٹر جوہر قدوسی، جولائی ۲۰۲۳ء، ص ۲۶۲

۲۰۵۔ ابوالحسن واحد رضوی، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ) مملوکہ: مقالہ نگار

۲۰۶۔ القرآن الحکیم: الرعد: آیت ۲۸

۲۰۷۔ ابوالحسن واحد رضوی، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ) مملوکہ: مقالہ نگار

۲۰۸۔ القرآن الحکیم: یونس: آیت ۵

۲۰۹۔ ابوالحسن واحد رضوی، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ) مملوکہ: مقالہ نگار

۲۱۰۔ ایضاً

۲۱۱۔ القرآن الحکیم: النحل: آیت ۷۹

۲۱۲۔ ابوالحسن واحد رضوی، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ) مملوکہ: مقالہ نگار

۲۱۳۔ القرآن الحکیم: مریم: آیت ۵۸

۲۱۴۔ ابوالحسن واحد رضوی، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ) مملوکہ: مقالہ نگار

۲۱۵۔ القرآن الحکیم: الحشر: آیت ۲۳۔۲۴

۲۱۶۔ ابوالحسن واحد رضوی، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ) مملوکہ: مقالہ نگار

۲۱۷۔ القرآن الحکیم: فاطر: آیت ۱۱

۲۱۸۔ ابوالحسن واحد رضوی، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ) مملوکہ: مقالہ نگار

۲۱۹۔ ایضاً

۲۲۰۔ ایضاً

۲۲۱۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی: ''تفہیم و تحسینِ شعر'' ص ۸۸
۲۲۲۔ ابوالحسن واحد رضوی، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ) مملوکہ: مقالہ نگار
۲۲۳۔ رحمت یوسف زئی: ''اردو شاعری میں صنائع بدائع''ص ۲۴۵
۲۲۴۔ ابوالحسن واحد رضوی، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ) مملوکہ: مقالہ نگار
۲۲۵۔ پروفیسر نذیر احمد: ''اقبال کے صنائع بدائع''ص ۶۷
۲۲۶۔ ابوالحسن واحد رضوی، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ) مملوکہ: مقالہ نگار
۲۲۷۔ پروفیسر نذیر احمد: ''اقبال کے صنائع بدائع''ص ۱۰۵
۲۲۸۔ ابوالحسن واحد رضوی، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ) مملوکہ: مقالہ نگار
۲۲۹۔ پروفیسر عبدالمجید: ''علم البلاغت'' رام نارائن لال اُرن کمار، الہٰ آباد، ۱۹۸۸ء، ص ۱۹
۲۳۰۔ ابوالحسن واحد رضوی، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ) مملوکہ: مقالہ نگار
۲۳۱۔ رفیع الدین رازؔ، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: مقالہ نگار
۲۳۲۔ ایضاً
۲۳۳۔ ایضاً
۲۳۴۔ القرآن الحکیم: الاعراف: آیت ۵۴
۲۳۵۔ رفیع الدین راز، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: مقالہ نگار
۲۳۶۔ القرآن الحکیم: الرحمٰن: آیت ۱۳
۲۳۷۔ رفیع الدین راز، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: مقالہ نگار
۲۳۸۔ ایضاً
۲۳۹۔ القرآن الحکیم: التغابن: آیت ۴
۲۴۰۔ رفیع الدین راز، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: مقالہ نگار
۲۴۱۔ ایضاً
۲۴۲۔ ایضاً
۲۴۳۔ ایضاً
۲۴۴۔ ایضاً

۲۴۵۔ ایضاً

۲۴۶۔ ایضاً

۲۴۷۔ ایضاً

۲۴۸۔ شاعرعلی شاؔعر،حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)،مملوکہ: مقالہ نگار

۲۴۹۔ القرآن الحکیم: الرعد: آیت ۷

۲۵۰۔ شاعرعلی شاؔعر،حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)،مملوکہ: مقالہ نگار

۲۵۱۔ ایضاً

۲۵۲۔ القرآن الحکیم: الانبیاء : آیت ۳۳

۲۵۳۔ شاعرعلی شاؔعر،حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)،مملوکہ: مقالہ نگار

۲۵۴۔ القرآن الحکیم: الرعد: آیت ۳

۲۵۵۔ شاعرعلی شاؔعر،حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)،مملوکہ: مقالہ نگار

۲۵۶۔ القرآن الحکیم: الجمعہ: آیت ۱۱

۲۵۷۔ شاعرعلی شاؔعر،حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)،مملوکہ: مقالہ نگار

۲۵۸۔ القرآن الحکیم: البقرہ: آیت ۲۵۷

۲۵۹۔ شاعرعلی شاؔعر،حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)،مملوکہ: مقالہ نگار

۲۶۰۔ القرآن الحکیم: یوسف: آیت ۲۱

۲۶۱۔ شاعرعلی شاؔعر،حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)،مملوکہ: مقالہ نگار

۲۶۲۔ القرآن الحکیم: البقرہ: آیت ۱۸۶

۲۶۳۔ شاعرعلی شاؔعر،حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)،مملوکہ: مقالہ نگار

۲۶۴۔ ایضاً

۲۶۵۔ ایضاً

۲۶۶۔ ایضاً

۲۶۷۔ ایضاً

۲۶۸۔ پروفیسر نذیر احمد: ''اقبال کے صنائع بدائع'' ص ۵۱

۲۶۹۔ شاعر علی شاعؔر، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: مقالہ نگار
۲۷۰۔ پروفیسر نذیر احمد: ''اقبال کے صنائع بدائع'' ص ۴۸
۲۷۱۔ شاعر علی شاعؔر، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: مقالہ نگار
۲۷۲۔ ایضاً
۲۷۳۔ ایضاً
۲۷۴۔ منظؔر عارفی، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: مقالہ نگار
۲۷۵۔ ایضاً
۲۷۶۔ ایضاً
۲۷۷۔ منظؔر عارفی، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: مقالہ نگار
۲۷۸۔ ایضاً
۲۷۹۔ ایضاً
۲۸۰۔ ایضاً
۲۸۱۔ القرآن الکریم: التغابن: آیت ۴
۲۸۲۔ ایضاً: الاخلاص: آیت ۱۔۲
۲۸۳۔ منظؔر عارفی، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: مقالہ نگار
۲۸۴۔ ایضاً
۲۸۵۔ القرآن الحکیم: الحدید: آیت ۳
۲۸۶۔ منظؔر عارفی، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: مقالہ نگار
۲۸۷۔ ایضاً
۲۸۸۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی: ''تفہیم و تحسینِ شعر'' ص ۸۸
۲۸۹۔ منظؔر عارفی، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: مقالہ نگار
۲۹۰۔ ایضاً
۲۹۱۔ ایضاً
۲۹۲۔ ایضاً

۲۹۳۔ ایضاً
۲۹۴۔ پروفیسر نذیر احمد: ''اقبال کے صنائع بدائع'' ص ۱۰۵
۲۹۵۔ منظر عارفی، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: مقالہ نگار
۲۹۶۔ ایضاً
۲۹۷۔ عباس علی شاہ ثاقب، حمدیہ قصیدہ (غیر مطبوعہ)، مملوکہ: مقالہ نگار
۲۹۸۔ ایضاً
۲۹۹۔ ایضاً
۳۰۰۔ ایضاً
۳۰۱۔ ایضاً
۳۰۲۔ ایضاً
۳۰۳۔ ایضاً
۳۰۴۔ ایضاً
۳۰۵۔ ایضاً
۳۰۶۔ ایضاً
۳۰۷۔ ایضاً
۳۰۸۔ ایضاً
۳۰۹۔ ایضاً
۳۱۰۔ ناصر ملک: ''لایموت'' شیرِ ربانی، ملتان، ۲۰۱۵ء، ص ۱۱
۳۱۱۔ حسن عباسی: ''سائیں'' حاجی حنیف پرنٹنگ پریس، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۲۱

☆☆☆☆☆☆☆

حاصلِ تحقیق

کلاسیکی اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کی روایت علم وعرفان ،معرفت ،دلائلِ توحیداور رموزِ کائنات سے مزیّن ہے۔جس کو ہمارے شعراء کرام اورسخن وروں نے قرآن،احادیث، مظاہر فطرت اور موجودات ومشاہدات سے کشید کیا ہے۔اردو حمدیہ قصیدہ نگاری علم وعرفان کا منبع ہے جس میں اسرار ورموز اور توحید کی فلسفیانہ جہات کا تعیّن بڑے مدلل و فصیح انداز میں کیا گیا ہے۔ان کا کلام سمندر کی مانند ہے جس میں حکمت کے موتی،تدبّر کے جواہرات،فکر کے ہیرے اورادراک کے لعل پائے جاتے ہیں۔اس روایت کا آغاز دکن سے ہوتا ہے۔علی عادل شاہ ثانی شاہی پہلے اردو حمدیہ قصیدہ نگار ہیں۔دکن کے بعد دہلی،لکھنواور دیگر شہروں سے اس صنف کا گزر ہوا۔دبستانِ لکھنواور دبستانِ دہلی کے کئی شعرا نے دیگر قصائد کے علاوہ حمدیہ قصائد بھی لکھے۔اردو حمدیہ قصیدے کی روایت میں علی عادل شاہ ثانی شاؔہی ،جعفرعلی حسرؔت، غلام حسین ہداؔیت،میر تجلؔی،مظہر علی خاں ولاؔ،انشاء اللہ خان انشاؔ، مصحفؔی،کرامت علی شہیدؔی، محمد علی مہکری خانہ زاؔد،ممنوؔن،مومن خان مومؔن،مہدی علی ذکؔی،قربان علی بیگ سالکؔ،صفیر بلگرامی،نیاز احمد ہوشؔ،صفدر رام پوری،سخؔن دہلوؔی،مہر نرائؔن،حضور عظیم آبادی،تمنّؔا اور ابراہیم آزاؔد کے نام اہم ہیں۔انھوں نے حمدیہ قصیدے کواردو ادب کی زینت بنایا ہے۔انھوں نے فکر وشعور اور محبّت وعقیدت سے سرشار ہوکر عمدہ ادب تخلیق کیا ہے جوشعری محاسن سے آراستہ و پیراستہ ہے۔یوں حمدیہ قصائد اپنے دور کے دیگر قصائد سے عالی مرتبت اور علوِفکر سے مالا مال ہیں۔اپنے دور کے عظیم شعرااور ذہین لوگوں نے تخیّل کی پرواز سے عام قاری کی آنکھوں کو کائنات کے اَسرار و رموز اور دلائلِ توحید سے آشنا کردیا ہے۔صنائع بدائع ،بُنت ،ارتباط و انسلاک اور دل آویز مصوّری نے اس صنف کوکمال فن کے مرتبے پر فائز کردیا ہے۔اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات ازل سے اَبد تک ہے تاہم بدلتے ہوئے لسانی اثرات سے اس کی پیش کش اور پیرائے پر زمانی اثرات مرتب ہوتے رہے ہیں۔کلاسیکی دور سے جب یہ صنف سفر کرتے

کرتے دورِ جدید تک پہنچی تو اس میں جدید اندازِ فکر، جدید اندازِ اظہار، جدید اُسلوب اور جدید تقاضوں نے اسے بالخصوص تشبیب میں جدید موضوعاتی رنگ و آہنگ عطا کر دیا ہے۔ تاہم ہیئتی اعتبار سے اس کی پہچان برقرار رہے۔

یہ تحقیقی مقالہ پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کے عُنوان سے معنون ہے۔ اس تحقیقی مقالے میں پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاروں کا رنگِ سخن، طرزِ بیان اور فکری و فنّی جائزہ بیان کرنے کی سعی و کوشش کی گئی ہے۔ قصیدہ اُم الاصناف ہونے کے باعث اپنی صنفی شناخت، ہیئتی تشکیل اور موضوعاتی جاہ وجلال کا مرقّع ہوتا ہے۔ اُسلوب میں گھن گرج اور زور دار لب ولہجہ اس کا امتیازی وصف ہے۔ توحید کے اساسی محرکات، اثباتِ توحید، فلسفیانہ ادراک اور نعرۂ تکبیر جیسا جوش وجذبہ اس کے بُلند آہنگ لہجے کی دلیل ہے۔ پاکستانی اردو حمدیہ قصیدہ نگاروں کے قصیدوں میں مدحِ ربِّ جلیل اپنی بساط کی ممکنہ تمام تر رعنائیوں، رفعتوں، وسعتوں اور فکری جولانیوں کا حوالہ بن کر اُبھری ہے۔ یہ وہ صنفِ سخن ہے جس میں غلو کا شائبہ نہیں پایا جاتا کیوں کہ شاعر خواہ تخیّل کی کتنی پروازیں طے کر لے خواہ کتنی ہی مبالغہ آرائی سے کام لے اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور قوّتوں کا احاطہ ناممکن ہے۔ پاکستانی اردو حمدیہ قصیدہ نگاروں کے ہاں حمدیہ قصیدے کا فکری دھارا توانا اور مؤثر ترین احساسات ومحسوسات کا وسیلہ ہے۔ ان کے قصائد مذہبی نظریات، فکر کی گہرائی و گیرائی اور چستی بندش کے علاوہ تکوینِ کائنات کے اَسرار ورموز پر مشتمل ہیں۔

قصیدہ ایسی صنفِ سخن ہے جس کے آثار قدیم ترین عربی زبان وادب میں بھی ملتے ہیں۔ یہ عربی زبان وادب کی اپنی ایجاد ہے۔ عربی سے فارسی اور پھر اردو زبان وادب میں اس صنف نے اپنا لوہا منوایا ہے۔ اردو زبان وادب میں دینِ اسلام، مذہب اور اسلامی نظریات سے وابستہ علمی وادبی سرمایہ کثیر مقدار میں پایا جاتا ہے۔ برِّعظیم (پاک و ہند) میں مسلمانوں کے تشخص کا امتیازی وصف اور روشن علامت اردو زبان ہے۔ اردو زبان عربی اور فارسی سے مماثل ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری تہذیب وتمدّن کی یگانگت کی بھی دلیل ہے۔ یہ تبلیغ اور قومی وحدت کی زبان ہے۔ برِّعظیم میں اردو بولنے، لکھنے اور سمجھنے والوں کی اکثریّت مسلمانوں

کی تھی، جو عربی زبان پوری مذہبی عقیدت واحترام اور اہتمام سے سیکھتے تھے۔ فارسی زبان سے آگاہی اور واقفیّت رکھتے تھے مگر رابطے کی زبان اردو ہونے کے باعث اس کی اہمیّت و افادیّت میں اضافہ اس کے دینی اور مذہبی ادب نے کیا۔ اردو زبان نے بھی مذہبی شاعری، اسلامی وقرآنی تعلیمات اور اسلامی نظریاتی شعور کا حامل ادب تخلیق کیا۔ صوفیا کرام، مبلّغین، محدّثین، مفکّرین، علما اور بزرگانِ دین نے عربی اور فارسی زبان وادب کے علمی خزانے کو اردو میں محفوظ کیا۔ عربی اور فارسی شعرا کی روایت سے اثر لیتے ہوئے اردو شعرا بھی اپنے دواوین، کلیات اور شعری مجموعوں کا آغاز حمدیہ قصیدے، حمدِ ربِّ جلیل، نعت اور مناقب وغیرہ سے کرتے تھے۔ فروغِ اردو کے لیے کئی محبانِ اردو نے اس حوالے سے کلیدی کردار ادا کیا۔

اردو میں حمدیہ قصیدہ نگاری کا باضابطہ رجحان قطب شاہی دور سے ملتا ہے۔ اس دور کا حمدیہ قصیدہ نگار علی عادل شاہ ثانی شاہی ہے۔ اردو حمدیہ قصیدہ نگاری نے سترھویں صدی عیسوی سے اکیسویں صدی عیسوی تک کے سفر کے دوران میں بے شمار نشیب وفراز دیکھے مگر کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ازل سے ابد تک ہے اس لیے ہر دور کے بدلتے تقاضوں کے باوجود مخلوق کا اپنے خالق سے بندگی کا رشتہ روزِ اوّل سے قائم ودائم ہے۔ جس کی ہیئت متعیّن مگر موضوعات میں تنوّع اور ندرت پائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مدح وتوصیف کا عمل اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود انسان۔

ہر صاحبِ ایمان اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کو تمام معاملات پر ترجیح دیتا ہے اور زبان پر ذکرِ خدا جاری ہو جانا بڑی سعادت مندی اور کامیابی ہے۔ حمدِ باری تعالیٰ لکھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے تاہم قصیدہ شہنشاہِ اقلیمِ ادب ہونے کے باعث لکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ لیکن جذبہ صادق سے سرشار شعراءِ کرام کے ہاں حمدیہ قصائد بھی ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنے وسیع مطالعہ، گہری فکروسوچ اور قادرالکلامی سے حمدیہ قصیدے جیسی مبارک صنفِ سخن میں اللہ تعالیٰ کی مدح وستائش کے موضوعات سمیٹے ہیں۔ حمدیہ قصیدہ گوئی شاعری کی معراج و ارفعیّت ہے۔ اردو ادب میں حمدیہ قصیدہ گراں قدر، پاکیزہ، معطّر ومطہر، اور علم وحکمت سے بھر پور فلسفۂ توحید اپنی آب وتاب سے موجود ہے۔ جس میں قرآنی تعلیمات پر مبنی انسانی رشدو

ہدایت اور ثنائے ربِّ کریم مؤثر و جامع انداز میں پیش کی گئی ہے۔

پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کی روایت میں مولانا ظفر علی خان، آثر زبیری، بے چینؔ رجپوری، عبدالعزیز خالدؔ، سیّد اصغر علی شاہ، ساحرؔ لکھنوی، غلام علی وفاؔ، قاضی حبیب الرحمٰن، ڈاکٹر ریاض مجید، ڈاکٹر نوید عاجزؔ، ابوالحسن شاہ واحد رضوی، رفیع الدین رازؔ، شاعر علی شاعرؔ، منظر عارفی اور عباس علی شاہ ثاقبؔ کے نام آتے ہیں۔ جنھوں نے اردو حمدیہ قصیدے کی روایت کو تسلسل دے کر پاکستانی اردو حمدیہ قصیدہ نگاری کی روایت میں قابلِ قدر حمدیہ قصیدے کی جہات کو فروغ دیا ہے۔ موضوع کی نوعیّت کے اعتبار سے حمدیہ قصیدہ سیّد الادب کے مرتبے پر فائز نظر آتا ہے۔

پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری فکر کی رنگا رنگی اور بوقلمونیوں کی بہتات سے مزیّن ہے۔ فکری اعتبار سے موضوعاتِ توحید، توحید کی فلسفیانہ تعبیروں اور توحید کے تقاضوں کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ پاکستانی حمدیہ قصیدہ نگاروں نے نظریۂ توحید، نغمۂ توحید، ارتداد تثلیث فی التوحید، توحیدی وتجرید، توحید صفاتی، توحید عیانی، توحید فی الذات، توحید فی الصفات توحید فی العبادات، شواہد التوحید اور کلمۂ توحید کے فلاسفہ اور پہلوؤں کو حمدیہ قصیدے کی زینت بنایا ہے۔ ذاتِ الٰہ کی خصوصیات، عظمتوں، رفعتوں، حکمتوں اور داورِ محشر کی قہاری و غفاری واُمیّد ورجا کے موضوعات پاکستانی اردو حمدیہ قصیدے کی زینت ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ عالیہ قدرت، صنّاعی، مصوّری، عفوودرگزر، ستّاری، غفّاری اور قدوسی کو بیان کیا گیا ہے۔ جس قدر اللہ تعالیٰ کی ذات زمانی و مکانی حدود سے ورا الوریٰ ہے اسی طرح اُس کی صفات کا احاطہ بھی انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ وہ حکیم، کریم، رحیم، مالکِ یوم الدین اور علیم ہے۔ اس کے اسمائے الحسنیٰ خالق، باری، نُور، رحمٰن، خبیر اور احدیّت وصمدیّت کو پاکستانی اردو حمدیہ قصیدہ نگاروں نے بڑی عقیدت مندی اور نیاز مندی سے شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ دورِ حاضر کا تقاضا ہے کہ ہمیں اب ادب برائے تعمیر کی کوششوں کو تیز کرنا ہوگا۔ اردو زبان وادب اور اصنافِ شاعری کی آبیاری فکری اور عملی طور پر کی جائے تا کہ آئندہ نسلوں کو ایسے ادب کا ورثہ ملے جس پر وہ ایمان وایقان اور گیان کی بُنیادیں اُستوار کرسکیں تا کہ فاسد العقیدگی کا

خاتمہ ممکن ہو۔

دورانِ تحقیق یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ پاکستان میں حمدیہ قصیدہ نگاروں کی تعداد نعتیہ قصیدہ نگاروں سے کہیں کم ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم محافل میں نعوت تو پڑھتے ہیں مگر حمد نہیں پڑھتے اور حمدیہ قصائد تو بالکل نہیں پڑھتے تاہم حمدیہ قصیدے کا مستقبل روشن بنایا جاسکتا ہے۔

عربی و فارسی قصائد کی طرح صنفی شناخت اور ہیئتی تشکیل لازم ہے۔جس طرح ڈرامہ اور مرثیہ اپنے ارکان کی بدولت ہی مکمل ہوتا ہے، اسی طرح قصیدے کے ارکان ہی اس کی تکمیل کرتے ہیں۔یہی اس کا طرہ امتیاز ہے۔تمہید یہ قصیدہ ہی دراصل فنِ قصیدہ نگاری کو ''شہنشاہِ اقلیمِ ادب'' کے درجے پر فائز کرتا ہے۔تکوینِ قصیدہ کی سرشت میں ہیئت وہ اکائی ہے جس کے بغیر اس کا امتیازی وصف ختم ہو جانے کے مترادف ہے۔قصیدے کی مخصوص ہیئت ہی اس کی شناخت ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

مصادر و مراجع

بنیادی مآخذ

۱۔ اثؔر زبیری: ''سلسبیل''، الحجاز پبلشرز، کراچی، س ن
۲۔ بے چیںؔ رجپوری: ''کلیاتِ بے چین'' مکتبہ بے چین، لاہور، ۲۰۰۳ء
۳۔ خالد احمد، بیاض ماہ نامہ، لاہور، اکتوبر، ۲۰۱۰ء
۴۔ خالد، عبدالعزیز: ''منحمنا'' بک لینڈ، کراچی، ۱۹۶۶ء
۵۔ ریاض مجید: ''کلیاتِ نعت'' ماہوزا، فیصل آباد، ۲۰۱۹ء
۶۔ ساحرؔ لکھنوی: ''صحیفہ مدحت'' آثار و افکار اکادمی، کراچی، ۱۹۹۷ء
۷۔ ظفر عباس نقوی و عنیزہ برجیس (مرتبین): ''کلیاتِ اصغر علی شاہ'' پیلوں پبلی کیشنز، ملتان، ۲۰۱۲ء
۸۔ ظفر علی خان، مولانا ''بہارستان'' اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۷۳ء

ثانوی مآخذ

۱۔ اثؔر، امداد امام: ''کاشف الحقائق (جلد دوم)'' ترقی بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء
۲۔ اثؔر، محمد علی: ''غواصی: شخصیت اور فن''، اِکسل فائن آرٹ لیتھو اینڈ آفسٹ ورکس، حیدر آباد، ۱۹۷۷ء
۳۔ احمد رضا خاں بریلوی، مولانا: ''کنز الایمان'' اتفاق پبلشرز، الاہور، ۱۹۹۱ء
۴۔ افتخار امام صدیقی: ''کرامت علی کرامت ایک مطالعہ'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء
۵۔ اُم ہانی اشرف، ڈاکٹر: ''اردو قصائد کا سماجیاتی مطالعہ'' ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۹۹ء
۶۔ انشا اللہ خان: ''کلیات انشا اللہ خان'' مطبع نول کشور لکھنو، ۱۸۷۶ء
۷۔ آزادؔ، محمد ابراہیم: ''دیوانِ آزاد'' (حصہ دوم) مطبع مرتضائی، آگرہ، ۱۹۳۲ء
۸۔ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر: ''انشا اللہ خان انشا (حیات، شخصیت اور فن)'' القمر انٹرپرائز،

لاہور،س ن
۹۔ تمنّا،محمد حسین: ''نشید ایماں''،مطبع گلزار احمدی،مراد آباد،۱۳۰۹ھ
۱۰۔ حافظ لدھیانوی: ''معراجِ سفر'' بیت الادب،لاہور،۱۹۹۶ء
۱۱۔ حالی،الطاف حسین: ''مقدمہ شعروشاعری'' مرتب: ڈاکٹر وحید قریشی پورب اکادمی، اسلام آباد۲۰۱۵ء
۱۲۔ حسرت: ''کلیاتِ حسرت'' سرفراز پریس،لکھنو،۱۹۶۶ء
۱۳۔ حسن عباسی: ''سائیں''،نستعلیق مطبوعات،لاہور،۲۰۱۵ء
۱۴۔ حضور،''دیوانِ حضور'' (مرتب): مختارالدین احمد بہار اردو اکادمی،بہار، انڈیا،۱۹۷۷ء
۱۵۔ حفیظ صدیقی،ابوالاعجاز: ''کشاف تنقیدی اصطلاحات'' مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد، ۱۹۸۵ء
۱۷۔ ذکی،مہدی علی: ''کلیاتِ ذکی''،مطبع نول کشور،لکھنو،س ن
۱۸۔ راہی فدائی،ڈاکٹر (مرتب): ''گنجِ شائگان'' الانصار پبلی کیشنز،حیدرآباد،انڈیا،۲۰۱۶
۱۹۔ رحمت یوسف زئی: ''اردو شاعری میں صنائع وبدائع'' کمپیوٹر کارپوریشن،حیدرآباد،۲۰۰۳
۲۰۔ رفیع الدین ہاشمی،ڈاکٹر: ''اصنافِ ادب'' سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۸
۲۱۔ ریاض مجید،ڈاکٹر: ''اردو میں نعت گوئی'' اقبال اکادمی،لاہور،۱۹۹۰ء
۲۲۔ زینت ساجدہ (مرتبہ): ''کلیاتِ شاہی'' اعجاز پرنٹنگ پریس،حیدرآباد،۱۹۶۲ء
۲۳۔ سحر،ابومحمد،ڈاکٹر: ''اردو میں قصیدہ نگاری'' تخلیق کار پبلی کیشنز، دہلی،۲۰۱۰ء
۲۴۔ سخن دہلوی: ''دیوانِ سخن''،مطبع نامی نول کشور،لکھنو،س ن
۲۵۔ شاہی،''کلیاتِ شاہی'' (مرتب): سید مبارزالدین رفعت،انجمن ترقی اردو،علی گڑھ،۱۹۶۲ء
۲۶۔ شبلی نعمانی،مولانا : ''شعرالعجم پانچویں جلد'' دارالمصنفین ،اعظم گڑھ،۱۹۹۱ء
۲۷۔ شمیم احمد: ''اصنافِ سخن اور شعری ہئیتیں'' مکتبہ عالیہ،لاہور،۱۹۸۳ء
۲۸۔ شہیدی،کرامت علی: ''دیوانِ شہیدی''،مطبع نول کشور،لکھنو،۱۹۰۴ء

۲۹۔ صدیقہ ارمان، ڈاکٹر: ''کلیاتِ ممنون'' الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء
۳۰۔ صفدر رام پوری: ''کلیاتِ صفدر'' مطبع نامی منشی نول کشور لکھنو، س ن
۳۱۔ صفیر بلگرامی: ''میلادِ معصومین'' صفیر بلگرامی اکیڈمی، کراچی، باردوم ۱۹۸۴ء
۳۲۔ ظفر علی خان، مولانا: ''آپ بیتی'' مشمولہ: نقوش، لاہور، آپ بیتی نمبر ۱۹۶۴ء
۳۳۔ ضیاالدین بدایونی (مرتب): ''مجموعہ قصائد مومن'' الناظر پریس لکھنو، ۱۹۲۵ء
۳۴۔ عابد علی عابد، سیّد: ''اصول انتقادِ ادبیات'' سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء
۳۵۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر (مرتبہ)۔ ''دیوانِ ولا'' ادارہ ادب وتنقید، لاہور، ۱۹۸۳ء
۳۶۔ عبدالسلام شاہ، ڈاکٹر: ''کلیاتِ شہزادہ سلیمان شکوہ'' نامی پریس لکھنو، ۱۹۸۲ء
۳۷۔ عبدالمجید، پروفیسر: ''علم البلاغت'' رام نارائن لال اُرن کمار، الہٰ آباد، ۱۹۸۸ء
۳۸۔ علی محمد خان، ڈاکٹر واشفاق احمد ورک، ڈاکٹر (مرتبین): ''اصنافِ نظم ونثر'' الفیصل ناشرانِ کتب، لاہور، ۲۰۱۴ء
۳۹۔ عمر بن محمد، پروفیسر: ''کلیاتِ غواصی'' نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، دکن، ۱۹۶۹ء
۴۰۔ فائق، کلب علی خاں: ''کلیاتِ سالک'' مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۴۴ء
۴۱۔ کلیم الدین احمد: ''اردو شاعری پر ایک نظر'' حصّہ اول نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۸ء
۴۲۔ کمال الدین، ایم، ڈاکٹر: ''قصیدہ کا فن اور اردو قصیدہ نگاری'' دربھنگہ بک ہاؤس، دربھنگہ، ۱۹۸۸ء
۴۳۔ محمد افتخار شفیع، ڈاکٹر: ''اصنافِ شاعری'' کتاب سرائے، لاہور، ۲۰۱۸ء
۴۴۔ محمد رفیع، مولانا: ''معانی وبیان'' لالہ رام دیال اگروالہ، الہٰ آباد، ۱۹۳۰ء
۴۵۔ محمد صادق، ڈاکٹر: ''LiteratureUrduofHistory'' آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن، س ن
۴۶۔ محمود الٰہی، ڈاکٹر: ''اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ'' اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو، ۱۹۸۳ء
۴۷۔ مہر دہلوی، منشی سورج نرائن: ''قصائد مہر'' مطبع سادھو پریس، دہلی، س ن
۴۸۔ ایضاً: ''کلامِ مہر'' مطبع مفید عام، لاہور، س ن

۴۹۔ نجم الغنی رام پوری، مولوی: ''بحر الفصاحت (حصہ اول)''، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۱ء
۵۰۔ نذیر احمد، پروفیسر: ''اقبال کے صنائع بدائع'' آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۶۶ء
۵۱۔ نصرتی ''نصرتی''، مرتب: مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، نئی دہلی، ۱۹۸۸
۵۲۔ مصحفی، غلام ہمدانی، ''کلیات مصحفی'' مرتب: نورالحسن نقوی، ڈاکٹر (جلد پنجم) مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۹ء
۵۳۔ ولی دکنی، ''کلیاتِ ولی''، مرتب: نورالحسن ہاشمی اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو، ۱۹۸۹ء
۵۴۔ ہوش بریلوی: ہوش، ''مطبع گلشن فیض لکھنو، ۱۳۱۳ھ

مقالہ جات

۱۔ سعادت سعید، ڈاکٹر: ''قصیدہ کا تہذیبی و فنی مطالعہ'' (مقالہ پی ایچ ڈی اردو) شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، س ن
۲۔ نادرہ زیدی، سیدہ (مرتبہ): ''کلیات میر تجلی'' (مقالہ ایم اے اردو) شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۷ء

لغات

۱۔ احمد دہلوی، سید: 'فرہنگِ آصفیہ'' اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۱۰ء
۲۔ سعد حسن خان، مولانا (مترجم): ''المنجد'' دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۷۵ء
۳۔ نیر، نورالحسن: ''نور اللغات'' نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، طبع سوم، ۲۰۰۶ء

اخبارات

۱۔ ''روزنامہ زمیندار'' لاہور، اپریل ۱۹۲۸ء

رسائل و جرائد

۱۔ بیاض ماہ نامہ، لاہور، اکتوبر، ۲۰۱۰ء
۲۔ جہانِ حمد و نعت (کتابی سلسلہ، شمارہ نمبر ۴، جموں و کشمیر جولائی ۲۰۲۳ء)
۳۔ ''خیابان (سہ ماہی)'' پشاور یونیورسٹی، پشاور، ۲۰۰۱ء
۴۔ ''نعت رنگ'' (کتابی سلسلہ)، شمارہ نمبر ۲۹، کراچی

English Books

Lahore,India,inIslamModernProf.W.C.Smith,

Websites 1963

۱۔ www.girdopesh.com

۲۔ www.religion.asianindexing.com

۳۔ www.rekhta.org

۴۔ www.tareekhepakistan.com

☆☆☆☆☆☆☆